جون ۱۹۶۸ء ۵۹



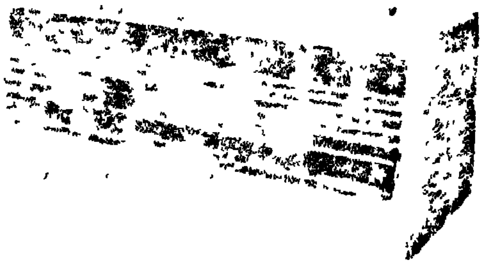
کتاب

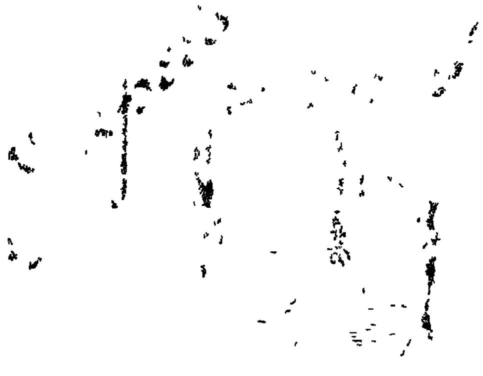
نمبر
27/5/69

مراٹھی کہانی نمبر

۲۰ نمائندہ افسانے

[illegible] فکر انگیز مضامین







محترمہ شمس پٹی



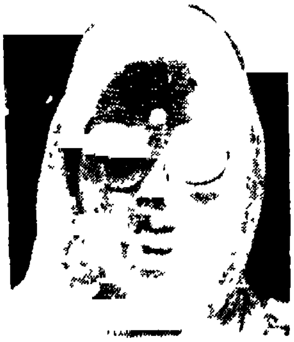
دور پرکار



ڈاکٹر عبدالستار دلوی



پروفیسر کیشو میشرام



پروفیسر شانتا سیلکے



بابو راؤ باگل



پردیپ نیرورکر



کماری وجیا سالوی

مجلسِ مشاورت
سید احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، عابد سہیل

ماہنامہ
کتاب
مراٹھی افسانہ نمبر

افسانے

مقالے

مرتب: نورپرکار

جون: ۱۹۶۸

نئی ترتیب
شمارہ ۵۹ (مئی، جون)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر
سید جمیل احمد

مطبوعہ
امامی پریس

قیمت
ایک روپیہ ۲۵ پیسے

زرسالانہ
۱۰ روپے

کتاب، چوک، لکھنؤ ۳

کتاب

پہلا ورق

رانچی، رنلام، میرٹھ، کریم گنج، کلکتہ، الہ آباد ـــ چند مہینوں کے اندر ان شہروں میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں اور ہندوستان کی "سیکولر حکومت" اور "سیکولر دستور" نے یہ خونیں تماشا دیکھا ہے۔ ان کے سیاسی، مذہبی، فرقہ وارانہ اور مقامی اسباب کیا ہیں اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے۔ حالانکہ ادیب اور شاعر ہونے کے ناطے، ایڈیٹر اور ناشر کی حیثیت سے ہمیں ان پہلوؤں کو بھی اچھی طرح جاننا اور سمجھنا چاہیئے، ہم تو صرف اس کے تہذیبی اور انسانی پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ہندو ہوں یا مسلمان، [illegible] ہوں یا عیسائی، بدھ مت کے ماننے والے ہوں یا پارسی، مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوں یا لامذہب لیکن جب یہ فسادات ہوتے ہیں تو ہم اس کے شعلوں سے محفوظ نہیں رہتے کیا ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ غور و فکر کا موضوع نہیں ہے؟ کیا ہم یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر سکتے ہیں کہ ہم ادیب ہیں سیاسی رہنما یا قومی مصلح نہیں؟ کیا ہمارے جذبات اور خیالات ان کی ضرب سے مجروح نہیں ہوتے؟ ممکن ہے کہ ہمیں اس کی فرصت نہ ہو کہ ہم ایسے فسادات میں اس بات کی چھان بین کریں کہ پہل کس کی طرف سے ہوئی، مجرم کون ہے، زیادتی کس فرقہ کی ہے، کس کو زیادہ نقصان پہونچا۔ کدھر کی جانیں زیادہ گئیں۔ ممکن ہے کہ ہم ایسے جلسے جلوسوں میں بھی شریک نہ ہو سکیں جو شہر میں امن قائم کرنے اور آپس میں میل جول بڑھانے کے لئے منظم کئے جائیں لیکن کیا ہم اس بربریت، درندگی، سفاکی، بہیمیت اور ظلم کے خاموش تماشائی رہ سکتے ہیں؟ ہمارا فیصلہ کیا ہوگا؟ ہم کسی حیثیت سے اس کے ذمہ دار ہیں یا نہیں؟ کیا ادب میں ان کا ذکر غیر ادبی ہے؟ کیا انکا تذکرہ کسی قسم کی مقصدیت کا حامل ہو کر فن کاری کو نقصان پہونچاتا ہے؟ کیا ان کے متعلق اظہارِ خیال سیاسی پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ہر ادیب کو اظہارِ خیال کرنا چاہیئے۔

مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی غور طلب ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا یا کم سے کم وہ عصبیت اور تنگ نظری کا شکار نہیں ہوتے لیکن یہ بات کس حد تک درست ہے اور ادیبوں کی عملی زندگی میں اس کا اظہار کس طرح ہوتا ہے اس کے متعلق اختلافِ رائے نظر آتا ہے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ ادیب غیر متعصب ہوتا ہے، اگر ایسا ہے تو کیا تنگ نظری اور تعصب کی گرم بازاری دیکھ کر اس کے خون میں حرکت نہیں ہوتی اور اسکی

تخلیقی قوت اظہار کے راستے تلاش نہیں کرتی! اس سلسلہ میں یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوا جا سکتا کہ اس سے کسی مقصد کی طرف جانبداری ظاہر ہو گی اور ایسا معلوم ہو گا کہ وہ ادیب کے علاوہ کسی اور نظر سے بھی دیکھا جائے گا کیونکہ ہر ادیب اور شاعر، وہ اس سے کتنا ہی بچنا چاہے، اپنی تخلیق میں اپنے عقائد کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر خاموش رہنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ ہمیں انسانی مسائل سے کسی حیثیت سے بھی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے بہیمانہ فسادات پر اگر کسی اور حیثیت سے نہیں تو ادیب اور شاعر انسانی حیثیت سے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہیں۔

ہر ادیب اور شاعر انسان بھی ہے، کسی خاندان میں، کسی علاقہ میں، کسی ملک میں پیدا ہوا ہے، کسی ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، پسندیدہ یا ناپسندیدہ کسی مذہب، تہذیب اور عقیدے سے دلچسپی بھی لے سکتا ہے، زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی پیشہ بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس پیشہ کی وجہ سے اس کے سوچنے سمجھنے، لکھنے پڑھنے پر کچھ خاص اثرات بھی پڑ سکتے ہیں، اس صورت حال میں یا تو وہ اپنی شخصیت کو کئی خانوں میں تقسیم کر دے اور جب ادیب یا شاعر ہو تو کچھ اور نہ ہو یا پھر وہ اپنے اندر ہر پہلو کو سمو کر ایک گٹھی ہوئی شخصیت کی صورت میں اپنے کو پیش کرے۔ یہ مسائل بھی جدید نفسیات اور عمرانیات میں برابر زیر بحث آتے رہتے ہیں اور آج کا ادیب اپنے متعلق غور کرتے ہوئے، اپنی ذات کی کھوج کرتے ہوئے انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر کچھ اور نہیں تو نفسیاتی سطح پر تحفظ ذات کے تقاضے، علمی سطح پر انسان کے اندر چھپی ہوئی بہیمیت کو سمجھنے کے تقاضے اور عملی سطح پر روزمرہ کے کاروبار کو جاری رکھنے کے تقاضے غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ جو زندہ رہنا چاہتے ہیں، وہ جو فرقہ پرست نہیں ہیں، وہ جو انسانوں سے انسانی سطح پر تعلقات رکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے کیا راستہ ہے؟

تھرتھراتا ہوا احساس کے غم خانے میں	نرگسی آنکھ کا معصوم سا خدشہ دن رات
زیست کے ساتھ رہا کرتا ہے سائے کی طرح	چند اترے ہوئے چہروں کا تقاضا دن رات

ہمارے ادیب اور شاعر اس کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہوں تو کہیں!

■■ مراٹھی افسانہ نمبر خاصی تاخیر سے حاضر ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ایک ایسی سماجی اور ثقافتی زندگی کے متعلق جن تک ہماری رسائی عام حالات میں اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بیس نمائندہ کہانیاں پڑھ کر آپ دیر آید درست آید کہتے ہوئے ہمیں معاف کر دیں گے۔

زیر نظر اشاعت کے سلسلے میں ہمیں خوش قسمتی سے نور پرکار کا تعاون حاصل ہو گیا جو مراٹھی کے مشاق مترجم ہونے کے علاوہ خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ نور پرکار نے کہانیوں اور مضامین کے انتخاب اور ترجمہ کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے کر، اور اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دے کر ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ یہ خصوصی اشاعت پیش کی جا سکے۔ بیس نمائندہ افسانوں کے علاوہ اس نمبر میں مراٹھی ادب، زبان، افسانہ اور ڈرامہ سے متعلق چار مضامین بھی شامل ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ نور پرکار اس ذمہ داری سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ دو مضامین کے ترجموں کو بہتر ضرور بنایا جا سکتا تھا لیکن ہم انھیں صرف اس امید کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ ان سے مراٹھی ادب کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات تو اردو پڑھنے والوں کو حاصل ہو ہی جائے گی۔

■■ کتاب جلد ہی ایک ضخیم افسانہ نمبر پیش کرے گا۔ اس بارے میں تفصیلی اعلان اگلے شماروں میں کیا جائے گا۔

●●

اس شمارے کے ادیب

ڈاکٹر عبدالستار دلوی: ۔ ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع تھا محمد حسین آزاد حیات اور کارنامے "من سمجھاون" مراٹھی شاعر رام داس کی مشہور نظم "مناچے شلوک" کا اردو ترجمہ ہے جسے شاہ تراب چشتی نے نظم کیا تھا۔ ڈاکٹر دلوی نے اسے مرتب کیا ہے اور اس کا مناچے شلوک سے تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ ان دنوں بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات سے منسلک ہیں۔ اردو مراٹھی کا اردو سماجی و لسانی مطالعے پر کام کر رہے ہیں۔

پروفیسر کیشو میشرام: ۔ مراٹھی کے نمایندہ شاعر اور نقاد ہیں۔ ان دنوں دیانند کالج پریل بمبئی میں مراٹھی کے پروفیسر ہیں۔

پردیپ نیرورکر: ۔ مراٹھی کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔

کماری وجیا سالوی: ۔ مراٹھی کی ممتاز افسانہ نگار اور سفر نگار ہیں۔

دیواکر کرشن: ۔ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں حیدرآباد میں وکالت کرتے ہیں۔ کہانیوں کے ۳ مجموعے، دو ناول اور ایک ڈرامہ شایع ہو چکا ہے۔ مراٹھی کے یہ پہلے کہانی کار ہیں جنھوں نے انسانی جذبات کے اظہار کی داغ بیل ڈالی۔

یشونت گوپال جوشی (مرحوم) بارہ افسانوی مجموعوں اور متعدد ڈراموں کے مصنف۔ ان کی کہانیوں کی بنیاد پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔

وی۔ ایس۔ کھانڈیکر: ۔ کہانیوں کے تقریباً [illegible] مجموعے اور ۱۵ ناول شایع ہو چکے ہیں۔ مراٹھی کے صف اول کے منتقد نگاروں میں ہیں۔ ان کی بہت ساری کہانیوں کے تراجم بنگالی، ہندی، گجراتی اور دوسری ملکی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کے ایک ناول "[illegible]" کو ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ بھی ملا ہے۔

نا۔سی۔ پھڑکے: تقریباً ۲۵ پچیس کہانیوں کے مجموعے اور ساٹھ سے بھی زیادہ ناول شایع ہو چکے ہیں۔ ۱۲ تنقیدی کتابوں اور پندرہ انگریزی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

گنگا دھر گاڈگل: ۔ پندرہ افسانوی مجموعوں، ایک ناول، تین سفرناموں کے مصنف ہیں۔ مراٹھی کی نئی کہانی کے جنم داتا ہونے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ ان دنوں [illegible] کے [illegible] کام کر رہے ہیں۔

اروند گوکھلے: ۔ ۱۲ کہانیوں کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۳ء تک [illegible] مہاراشٹر گورنمنٹ کی طرف سے انعام ملا ہے لیکن [illegible] ہو چکے ہیں۔

دنکر شنکر گنگا کر: ۔ [illegible] مجموعے [illegible] شایع ہو چکے ہیں۔ [illegible] صوبائی حکومت [illegible] دیہاتی زندگی کی عکاسی میں انھیں مہارت حاصل ہے۔

وجے تیندولکر: ۔ [illegible] افسانوی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ [illegible] ان کا ذریعہ معاش ہے۔ پھر بھی انھوں نے ادبی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ مراٹھی ناٹک اور مراٹھی ڈرامہ میں [illegible] تبدیلیاں انھیں کی مرہون [illegible]

جی۔ اے۔ کلکرنی: ۔ چار افسانوی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ [illegible] کے بعد مراٹھی کہانی کو انھوں نے نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ ان [illegible] میں انگریزی کے [illegible] ہیں۔

محترمہ وجیا راجے ادھیکش: ۔ دو افسانوی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ مراٹھی کی مشہور سفید نگار بھی ہیں۔ ان دنوں الفنسٹن کالج بمبئی میں مراٹھی کی لیکچرار ہیں۔

بالو راؤ گل: ۔ [illegible] مجموعے [illegible] ہیں ان [illegible] موضوع کی وجہ سے مراٹھی میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ ان کی [illegible] مجموعے زیر اشاعت ہیں۔

حمید دلوائی: ۔ دو کہانیوں کے مجموعے اور ایک ناول شایع ہو چکا ہے۔ ناول پر صوبائی حکومت کی طرف سے پہلا انعام ملا ہے۔ ان دنوں یہاں کے مشہور مراٹھی روزنامے [illegible] (مراٹھا) کے مدیر معاون ہیں۔

چ۔ تر۔ یم۔ کھانولکر: ۔ مراٹھی کے مشہور کہانی کار، ناول نگار اور مشہور شاعر ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے شہنائی [illegible] کو صوبائی حکومت کا انعام حاصل ہوا ہے۔ ان کے دوسری مجموعوں کو بھی صوبائی حکومت کی طرف سے

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

اگلے شمارہ میں

روئیے، نظریے، ادب — ڈاکٹر محمد حسن

سرمد کے دو سادھن — شہاب سرمدی

دارا شکوہ کا تاریخی پس منظر — اقتدار عالم خان

ادبی سرگرمیاں

جدید ہندی اور اردو ادب میں

ترقی پسند میلانات

(عشرت ظفر گورکھپوری کی رپورٹ)

افسانے

ہنس راج رہبر، الیاس احمد گدی، نوشاہ،
سہیل اشفاق، ہندی کہانی

انشائیے

خاطر غزنوی، نور معظم، انجم اعظمی، شہاب جعفری
زبیر رضوی، شہریار، عیم اللہ حالی، راج نرائن راز
جعفر عسکری، داہی، غلام رضوی گردش، وید جہانگیر
ابرار اعظمی، علی قلی خان

غزلیں

فارغ بخاری، مغیث الدین فریدی، انیس ناسم، وارث کرمانی
زیب غوری، طلحہ رضوی برق، فضل تابش، مخمور سعیدی،
دلکش ساگری، اقبال منہاس، زاہد کمال، اثر کریمی،
رئیس مینائی، ظفر صہبائی، فضل الرحمان نفضل، آزاد گلاٹی،
شاہد کبیر، حسن رضا

تبصرے، خطوط

ایک بار تشریف لائیے

چکن کے کرتوں

بلاؤز کے ٹکڑوں

ساڑیوں

اور

فراک

وغیرہ

کے لئے

لکھنؤ کی مشہور ومعروف دوکان

ہاشمی چکن اسٹور

چوک بازار۔ لکھنؤ ۳

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

مراٹھی ادب کا ارتقا

مراٹھی زبان [illegible] ارتقا [illegible] مراٹھی [illegible] اور [illegible] بولی جاتی ہے اور سب معیاری Standard زبان سمجھی جاتی ہے۔ [illegible] کوکن کی زبان ہے جو ممبئی کے مغربی ساحل پر [illegible] علاقہ ہے۔ "وراڈی" [illegible] کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ [illegible] زبان [illegible] بدل جاتی ہے اور اس طرح مراٹھی کی متعدد "بولیاں" قرار دی جا سکتی ہیں تاہم یہ تین بولیاں اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اہم ترین ہیں۔

مراٹھی زبان کی اصل مہاراشٹری ہے جو پراکرت کی شاخ ہے۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ مہاراشٹری پانچویں صدی عیسوی میں (مشہور سنسکرت شاعر کالیداس سے تقریباً سو سال پہلے) بولی جاتی تھی۔ اس قیاس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ کالیداس کی سیتو بندھ اور دیگر سنسکرت ڈراموں میں اس بولی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ سنسکرت اعلیٰ طبقے کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور برخلاف اس کے پراکرت (مہاراشٹری) عوام کی زبانیں تھیں اور عوام میں مقبول تھیں۔ عام طور سے ادنیٰ درجے کے لوگوں اور عورتوں کی زبان سمجھی جاتی تھی چنانچہ بعد کے دور میں اردو ہندی کی طرح مہاراشٹری میں بھی ادب پیدا ہوا۔ علم اللسان کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہوگا۔ اسی مہاراشٹری زبان میں سالہا سال تک خاموش تبدیلیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ اسی تبدیل شدہ شکل کو اپبھرنش کا نام دیا گیا جو مہاراشٹری کی وسیع پیمانے پر تبدیل شدہ شکل تھی۔

۱؎ بعض ماہرین زبان کا خیال ہے کہ کوکنی ایک آزاد زبان ہے اور اسے مراٹھی کی بولی نہیں کہا جا سکتا

[illegible] تحقیقات [illegible] تصانیف کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو تقریباً دو صدیوں [illegible] مہاراشٹری اپبھرنش میں بھی [illegible] اور ادبی زبان کی حیثیت سے تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں [illegible] نے جنم لیا ہوگا۔

مراٹھی کے [illegible] بالبودھ [illegible] اور موڑی۔ زبان [illegible] اور [illegible] دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا

- - - - - - - - - -

- - - - - - - اور

موڑی رسم الخط عام طور سے مراسلات اور کاروباری زندگی میں آج سے تقریباً پچیس سال پہلے تک استعمال ہوتا تھا لیکن اب اس کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ [illegible] اس کے لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے کہا جاتا ہے کہ موڑی رسم الخط یادو خاندان کے وزیر ہیمادری (ہیماڈ پنت) کی اختراع ہے جو تیرھویں صدی عیسوی میں چند مذہبی کتابوں کا مصنف ہوا ہے۔ اس رسم الخط کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ہیمادری اسے سیلون سے ہندوستان لے آیا۔ موڑی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بالبودھ کی ہی ایک شکل ہے جو قلم اٹھائے بغیر بہت سرعت اور تیزی سے لکھا جاتا ہے

مراٹھی زبان بلا واسطہ سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ سنسکرت سے اس کا رشتہ پالی، مہاراشٹری، مہاراشٹری اپبھرنش کے ذریعہ ملتا ہے اور مراٹھی اور سنسکرت کے درمیان سالہا سال کا فاصلہ ہے۔ گو مراٹھی عرصہ تک

۱؎ [illegible] کا خیال ہے کہ "موڑی" رسم الخط [illegible] رسم الخط سے متاثر ہو کر [illegible] تفصیلات کے لئے دیکھئے "مراٹھی پر فارسی کا اثر"

بول چال کی زبان کی حیثیت سے مروج رہی ہو مگر مرہٹی ادب کی ترقی کا راز چھتریہ خاندان کے یادو خاندان کی ترقی میں پوشیدہ ہے۔ یادو خاندان نے ابتداً اپنی حکومت ضلع ناسک کے سنا میں قائم کی لیکن بہت جلد حکومت کی تمام و کمال باگ ڈور سنبھالتے ہوئے دیوگری (دولت آباد) کو پایہ تخت قرار دے کر مہاراشٹر ریاست کی بنیاد ڈالی اور شہرت حاصل کی اور اس طرح دو سو سال تک منظم اور مستحکم طور پر حکومت کی

اپنے زمانہ حکمرانی میں یادو حکومت نے مرہٹی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنا لیا اور علم دعالموں کی قدر شناسی کا ثبوت دیا۔ وزیر ہیمادری پنت یادو خاندان میں مرہٹی کا سب سے بڑا سرپرست ثابت ہوا۔ مرہٹی ادب کا نقطۂ آغاز بھی اسی خاندان یادو کی اہم ترین یادگار ہے۔

یادو خاندان کے بعد مرہٹی ادب کی ترقی میں سب سے بڑا حصہ "مہانو بھاوا پنت" اور واکاری پنتھ نے لیا جو دو مذہبی گروہ ہیں۔ یہ مذہبی گروہ بدھ مت اور جین مت کی طرح جداگانہ مذاہب کی صورت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ہندو مذہب ہی کی اصل پر قائم رہے۔ مہا بھاوا پنتھ نے کرشن اور دتاتریہ سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے اور واکاری پنتھ کے ماننے والوں نے ہری اور وٹھل کی عقیدت اختیار کی۔ ان دونوں گروہوں نے مجموعی حیثیت سے ہندو مذہب کی تمام مذہبی کتابوں کو اپنایا اور بھگوت گیتا ان مذہبی فرقوں کی اصل قرار پائی۔ ان دونوں فرقوں میں بھائی چارہ، رواداری اور وسیع المشربی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ سادگی پر زور دیا گیا اور گوشت و شراب ممنوع قرار دی گئی۔ ان دونوں فرقوں نے مرہٹی زبان ہی کو اپنا کر اسے اپنے خیالات کی تبلیغ کا آلہ کار بنایا جو آگے چل کر مرہٹی زبان و ادب کی ترقی میں سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوا۔

گو ان دونوں گروہوں میں متعدد باتیں مشترک تھیں اور دونوں نے مل کر ہندو سماج کی اصلاح و ترقی میں حصہ لیا۔ لیکن بعد میں ان دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ واکاری پنتھ لوگوں میں روز افزوں طور پر مقبول ہو گیا سارا مہاراشٹر اس کے زیر اثر آ گیا اور مہانو بھاوا پنتھ اپنی جڑیں چھوڑنے لگا اور محدود ہو گیا اور آخر "مہانو بھاوا" "مان بھاوا" کی شکل اختیار کر گیا جس کے معنی دغا و فریب کے ہوتے ہیں چنانچہ نتیجتاً ادب میں بھی دو دبستان پیدا ہو گئے۔ اور انھوں نے اپنے اپنے طور پر عقائد کی بنیاد پر مرہٹی ادب کی تدوین شروع کی۔

مہانو بھاوا ادب

"مہانو بھاوا" ادب پر پچھلی ایک صدی میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کے پیش نظر اس دبستان کا بانی ہریپال دیو معروف بہ چکرادھر ہے جو گجراتی ناگر برہمنوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والد "وسال دیو" گجرات کے وزیر تھے لیکن راجہ کے لاولد انتقال سے حکومت بعد میں "وسال دیو" کے ہاتھ آئی وسال دیو کے انتقال کے بعد ہریپال دیو نے حکومت سنبھالی اور ایک طویل عرصے تک حکومت کرتا رہا۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں حکومت سے الگ ہو کر "گووند پربھو" نامی سادھو کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔ جس نے اسے چکرادھر کے خطاب سے نوازا اور مہانو بھوا فرقے کی تبلیغ و اشاعت کی اور مرہٹی زبان کو اپنی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنا دیا۔ چکرادھر کے ملفوظات مرہٹی کے ابتدائی ادب کی نشاندھی کرتے ہیں جنھیں چکرادھر کے شاگرد مہندر بھٹ نے جمع کیا۔ یہ مرتب ملفوظات جو اچاریہ سترا اور سدھانت سترا پنتھ کے نام سے مشہور ہیں۔ مہانو بھوا فرقے کی بنیادی مذہبی کتابیں ہیں۔ اس نے چکرادھر کی حیات بھی مرتب کی جو سیلا چرتر کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تمام رسالے نثر میں ہیں اور مرہٹی کا ابتدائی ادب تصور کیے جاتے ہیں بھاسکر اچاریہ بھی چکرادھر کے شاگردوں میں سے تھے جن کی "سسو پلودھا" منظوم مرہٹی کی ابتدائی رزمیہ شاعری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس فرقے کے مراٹھی ادب کی ترقی میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور مذہبی و غیر مذہبی ادب پیدا کیا۔ اب تک مکند راج اور دنیانیشور مرہٹی ادب کے اولین ادیب اور شاعر سمجھے جاتے رہے ہیں تاہم ان سے پہلے کی ادبی تالیفات جو مہا بھوا فرقے سے تعلق رکھتی ہیں منظر شہود پر آ چکی ہیں۔

واکاری ادب

مکند راج اور دنیانیشور قدیم مرہٹی ادب کی اہم ترین شخصیتیں ہیں۔ ان میں بھی دنیانیشور اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے مرہٹی ادب کے بانی اور مرہٹی ادب کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔

مکندراج :۔ عام طور سے مکندراج کو مراٹھی کا پہلا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ مکندراج کے صحیح زمانہ کا اب تک تعین نہیں ہو سکا ہے۔ تاہم اتنا یقینی ہے کہ وہ قدیم دور سے تعلق رکھتا ہے اور بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جیت پال کا اتالیق تھا جو اس زمانے میں مہاراشٹر پر حکومت کرتا تھا۔ مکندراج نے پرامرتا Parama Amrita اور وویک سندھو Vivek Sindhu دو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ دونوں تصانیف زبان کے اعتبار سے بہت صاف ہیں لہذا محققین میں اختلاف ہے کہ آیا یہ کتابیں مکندراج کی ہو سکتی ہیں یا نہیں اس لئے کہ دنیانیشور کی تصانیف کافی پرانی معلوم ہوتی ہیں، تو یہ ایک ہی عہد کے ادیبوں کی زبان میں یہ فرق کس طرح؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کتابوں کو بعد کے دور میں زبان کے اعتبار سے جدید اور صاف بنا دیا گیا ہے۔ یہی تبدیلی بعد میں دنیانیشوری کے ساتھ ہوئی۔ فرق صرف یہ ہے کہ موخر الذکر کی جدید زبان کا سہرا مشہور سنت شاعر ایکناتھ کے سر باندھا جاتا ہے لیکن مکندراج کی زبان کے متعلق آج تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مکندراج کا زمانہ راجہ جے پال کا عہد (۱۱۹۱ء سے ۱۲۱۰ء) ہے۔ اور دنیانیشور نے راجہ رام دیو کا عہد (۱۲۷۱ء سے ۱۳۰۹ء) دیکھا۔ مکندراج اور دنیانیشور دونوں کی شاعری کا موضوع مذہبی امور اور فلسفۂ مذہب اور اس کے متعلقات تھے اور اس خیال کو عام کرنے کی کوشش کہ کوئی سب سے بڑی طاقت کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق خدا تک پہنچنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایمان، محبت اور خلوص ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

- - - - - - - - - - - - - -

۔ ۔ ۔ محض ظاہرداری سے خدا تک پہنچنا محال ہے۔ اس عہد میں گو کہ عوام کو سنسکرت زبان کا مطالعہ ممنوع تھا ان دونوں نے عوام کو سنسکرت اور متعلقہ علوم سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ اس مشن میں دنیانیشور کو ان کے بھائی نورتی ناتھ اور سوپن دیو اور بہن مکتا بائی نے بڑی مدد کی اور خود بھی شاعری کی۔ اسی زمانہ میں مکندراج اور دنیانیشور کے بعد نام دیو نے بہ حیثیت شاعر اور سنت کے جو متعدد ابھنگ لکھے وہ خدا سے لو، ایثار و خلوص سے متعلق تھے اس عہد کو مراٹھی ادب کا اولین دور خیال کرنا چاہئے جو ۱۲۰۰ء سے ۱۳۵۰ء تک تقریباً ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔ اس زمانے کا ادب مراٹھی کا قدیم ترین ادب خیال کرنا چاہئے۔ اس میں بھی نام دیو کا اسلوب مکندراج اور دنیانیشور کے مقابلے میں جدید، صاف اور خوبصورت ہے۔ اس عہد کے ادب اور روح عصر جدید میں خود نام دیو کا خاندان بھی بہت زیادہ متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ نام دیو کی ملازمہ جنابائی نے بھی اس عصری روح کو قبول کر کے ان خیالات کی تبلیغ میں حصہ لیا۔

نام دیو نے چودھویں صدی عیسوی کے نصف میں وفات پائی اس کے مرنے کے بعد قریب دو سو سال تک مہاراشٹری ادب میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہ ہوئی اور علاء الدین خلجی کی فتح دکن کے بعد مراٹھی ادب کا اثر و رسوخ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور اس کی جگہ فارسی نے لینی شروع کی جو بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور احمد نگر کی درباری زبان کی حیثیت سے درآئی اور سلطنت بہمنیہ کے قیام سے لیکر اس کے خاتمہ تک مراٹھی ادب کی ترقی رفتار بھی رک گئی لیکن سلاطین بہمنیہ کی آپس کی جنگوں کی وجہ سے ایک بار پھر مرہٹہ سپاہی ۔ ۔ سلاطین دکن میں آہستہ آہستہ شامل ہوتے گئے اور بڑے بڑے فوجی اور سرکاری منصب حاصل کئے اسی دوران میں برسوں سے رکی ہوئی مراٹھی ادب کی ترقی کا بیج پھوٹا اور ایکناتھ نے جو ۱۵۴۸ء میں پیدا ہوئے دنیانیشور اور اس کی تعلیم کو پھیلانے کی کوشش کی اور رواداری اور بھائی چارے کا سبق دیتے ہوئے آپس کی ذات پات کی تفریق کو مٹانے پر زور دیا۔ ایکناتھ کے دیگر ہمعصر شعراء میں داس پنتھ، رنگناتھ، رگھوناتھ، پنڈت آنند تنایا وغیرہ مشہور شاعر ہیں۔ مراٹھی ادب کا یہ دور پچاس سال کے مختصر عرصے پر (۱۵۵۰ء سے ۱۶۰۰ء) محیط ہے۔

اس دورۂ دوم کے شعراء نے سماجی اور مذہبی موضوعات ہی کو اپنایا اور مراٹھی ادب میں قومی رزمیے کی بنیاد ڈالی۔ زبان کے اعتبار سے نتائجاً سلاست و روانی بھی اس کی اصل خصوصیات ہیں اور اس کی بڑی وجہ فارسی الفاظ کا استعمال ہے۔ فارسی ادب نے مراٹھی ادب اور زبان پر اسی عہد میں گہرے اثرات چھوڑے۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ روزمرہ، محاورات اور دیگر فارسی اصطلاحات بھی فارسی میں مروج ہوئیں۔ یہ دور مہاراشٹر میں "تنازع البقاء" کا دور تھا۔ لہذا ادب

کی ترقی پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور اس کی یہ کمی بڑی حد تک تیسرے دور میں پوری کی گئی۔

مراٹھی ادب کا تیسرا دور تقریباً ۱۶۰۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے اور تقریباً دو سو سال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عہد کے سب سے بڑے شاعر جنھوں نے مرہٹہ قوم کی قسمت کو سنوارا وہ رام داس، تکارام اور مکتیشور ہیں جو ۱۷۰۰ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ تکارام نے ترکِ دنیا، رواداری اور خدا کی عبادت پر زور دیا۔ رام داس نے عمل پر اور ساتھ ہی مرہٹہ قوم کو منظم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔ انھوں نے ایک تعمیری ادب پیدا کیا۔ مکتیشور نے مہا بھارت اور رامائن لکھیں اور ان کے ذریعہ فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ عملی زندگی پر زور دیکر آپس کے اختلافات دور کرنے پر زور دیا۔ مکتیشور نے بھی اپنی "مہا بھارت" کے ذریعے مرہٹہ قوم کو منظم کیا اور شاندار ماضی کی ہی طرح پر شکوہ مستقبل کی یاد دلا کر مرہٹہ قوم کو ابھارا۔ اس عہد کے دیگر مشہور شعراء میں وامن پنڈت، شری دھر پنڈت اور مورو پنت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شاہیر (عوامی شاعر، بھاٹ) بھی پیدا ہوئے جنھوں نے جذبات سے مملو گیتوں سے اہم تاریخی واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرکے عوام کے جذبات کو ابھارا۔ اس زمانے میں عوامی ادب بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوا جس کا مقصد عوام کے ادنیٰ جذبات کی تسکین تھا جس کی بنیادی وجہ پیشوائی کا انحطاط تھا۔ باجی راؤ دوم اور اس کے ساتھی عیاشی اور رنگ رلیوں میں مصروف تھے چنانچہ اس دور کے چند شعراء نے پیشوا اور اس کے ساتھیوں کو خوش رکھنے اور اس کی ذہنی عیاشی کی خاطر ایسی نظمیں یا گیت لکھے جو مراٹھی ادب میں "لاونی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس طرح گویا مرہٹہ حکومت کی ترقی اور عروج کے ساتھ مراٹھی ادب بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا اور مرہٹہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ مراٹھی ادب میں بھی تنزل واقع ہوا۔ مختصر یہ کہ مراٹھی ادب کے اس عہد زریں میں متنوع قسم کا ادب پیدا ہوا جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے لئے مشہور ہے۔ مذہبی اور فلسفیانہ شاعری کے ساتھ ہی شعریت کے اعتبار سے بھی اس دور کا ادب اہمیت رکھتا ہے۔ نظم کے ساتھ ہی نثر بھی پیدا ہوئی گو وہ نظم کے مقابلے میں زیادہ قدامت کا حامل تھا۔ رام داس کی فلسفیانہ شاعری، تکارام کی پختگی، مکتیشور کا بیانیہ انداز اس عہد کے ادب کے جاذب نظر رنگ ہیں۔ اسی طرح وامن پنڈت کی نغمگی، مورو پنت کا انتخاب الفاظ (diction) یہ ساری خصوصیات ایک جگہ جمع ہو کر اس عہد کے ادب کو عہد زریں بنا دیتی ہیں۔ تقریباً یہی حال مرہٹہ ریاست کا بھی رہا۔

انیسویں صدی ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہیں سے ہندوستانی ادبیات میں جدیدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ ناول، ڈرامہ، سوانح عمری، تنقید وغیرہ اس زمانہ کی یادگاریں ہیں۔ اہم پس منظر یہ تھا کہ عام طور سے انگریزی تہذیب اور فکر و فن سے متاثر ہوئے۔ چھاپہ خانے قائم ہونے کی وجہ سے کتابوں کی وسیع پیمانے پر طباعت ہونے لگی اور پرانی ادبی دستاویزات کی تحقیقات کا کام شروع ہوا۔ انگریزی و سنسکرت عربی فارسی سے ترجمے ہونے لگے اور نثر نے باقاعدہ ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔ ناول و ادب نے مختلف موضوعات تاریخ، فلسفہ، مذہب وغیرہ کو بھی اپنے حلقہ اثر میں لے لیا چنانچہ مراٹھی ادب میں بھی ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔ نثر و نظم دونوں پر توجہ دی گئی اور اخبارات و جرائد کا آغاز ہوا جس سے ادبیات کو پڑھنے کے لئے عوام میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

انیسویں صدی اور آغاز بیسویں صدی کے اس مراٹھی ادب کی گرانقدر شخصیتوں میں پرشرام پنت گوڈبولے جنھوں نے شکنتلا اور اترا رام چرت کا مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ کرشنا شاستری چپلونکر نے مترجم "میگھ دوت"، وشنو شاستری چپلونکر جنھوں نے پہلی مرتبہ مراٹھی ادب میں تنقیدی مضامین لکھے بہت مشہور اور مقبول ہوئے اسی طرح واسو دیو کھرے کی "یشونت مہاکاویہ" ڈاکٹر کرتیکر، کرلوسکر، رانا ڈے، کولہاٹکر وغیرہ نے مراٹھی ڈرامے کو آگے بڑھایا۔ راجواڑے اور سردیسائی نے مورخ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ہری نارائن آپٹے جو عظیم ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اسی طرح سی وی ویدیا، گنجیکر، این سی کیلکر وغیرہ نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا۔ جسٹس رانا ڈے جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ سیاسیات پر اپنی تحریریں یادگار چھوڑیں اور بال گنگادھر تلک

مشہور قومی رہنما جنھوں نے گیتا کی تفسیر لکھی مرہٹی ادب میں بہت مشہور ہوئے اور بابائی راجواڑے اور پانڈے نے مرہٹی میں سوانح عمری کی داغ بیل ڈالی۔

مرہٹی ادب میں جدیدیت کا آغاز کیشوسوت (۱۸۶۶ء تا ۱۹۰۵ء) اور مشہور ناول نگار ہری نارائن آپٹے (۱۸۶۴ء تا ۱۹۱۹ء) سے ہوتا ہے۔ کیشوسوت نے اپنی شاعری میں ادبی روایات ہی سے نہیں بلکہ ہر ممکن طریقے سے انقلاب لانے کی کوشش کی اور تجربے کئے۔ نئی اصطلاحیں وضع کیں اور نئی ہئیت و موضوع اپنے۔ ان سب میں کیشوسوت یوروپی توسیع بیداری کا nationalism European رومانیت romanticism۔ اور سب سے زیادہ انگریزی ادب سے متاثر ہوئے اور اپنے ہمعصر شعرا اور نئی نسل کو متاثر کیا۔ نارائن وامن تلک (۱۸۶۲ء تا ۱۹۱۸ء) نے اپنی شاعری میں حسن پرستی اور جمال پرستی کا ثبوت فراہم کیا۔ رام گنیش گڈکری (۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۹ء) نے کیشوسوت اور آگرکر کی ترقی پسندی اور تلک اور چپلونکر کی قدامت کے احیا Revival کو ایک ساتھ ملا کر پیش کیا۔ اس نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ خاکوں میں سماجی تنگ نظری اور روایت پسندی کو ہدفِ ملامت بنایا۔

ہری نرائن آپٹے نے "کرمنک" نامی اخبار جاری کیا اور اس میں معیاری اور دلچسپ ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا پہلا ناول جو اس اخبار میں شائع ہوا "پن لکشات کون گھیتو" (لیکن سمجھ ہی کون لیتا ہے) تھا۔ اسی کے ساتھ ان کے دیگر چھوٹے چھوٹے مضامین بھی شائع ہوتے گئے۔ ہری نرائن آپٹے کی ساری ناولیں اور کہانیاں سماجی موضوعات سے متعلق ہیں ان کے افسانے "سپھٹ گوشٹی" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ہری نرائن آپٹے کے "کرمنک" کی طرح جس نے مرہٹی ادب میں امتیاز پایا۔ مرہٹی کے چند دیگر اخباروں نے بھی مرہٹی افسانوں کو رواج دینے میں بڑی خدمت کی ہے۔ خاص طور سے بمبئی کے مشہور رسالے "منورنجن" نے جس کو ۱۸۹۵ء میں کاشی ناتھ رگھوناتھ مترے نے جاری کیا تھا مرہٹی ادب میں افسانوی ادب کی اس تحریک کے بعد ناتھ مادھو، سہکاری کرشن، نارائن ہری آپٹے، پروفیسر پھڑکے، وستو سکھا رام کھانڈیکر اور رسالے گردمی نے اس صنف کو ترقی دی۔

مزاح نگاروں میں پروفیسر خاص دا تیک، کیشن لیئے، بوکیل کھانولکر، بجرکر، سودیاں، پردھت، ناڈکرنی، شنستری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے مرہٹی میں ظرافت و مضحکات کو نقطۂ عروج سے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ پروفیسر اچیے جنھوں نے سیاست و خطابت میں نام پیدا کیا ادب میں بھی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ دیگر ادبیات کی طرح مرہٹی ادب بھی مختلف ادبی تحریکوں کا مرہونِ منت ہے۔ موضوع اور ہیئت کے تجربے ہوتے رہے۔ جدید عہد میں موضوع و ہیئت کے لحاظ سے جو ترقی مراٹھی ادب نے کی ہے اس میں شاعری کے لحاظ سے پنڈھارکر، کانیٹکر، مادھو جولین، بورکر اور ریگے نے مقبولیت حاصل کی۔ ان سب میں عام موضوعات اور عوام کے دکھ درد میں حصہ لینے کی وجہ سے پنڈھارکر کی شاعری کو بے حد پسند کیا گیا۔ مردھیکر اور ریگے کی شاعری نے جدید زمانے میں مرہٹی شاعری کو نئی سمتیں عطا کیں اور ساری مرہٹی شاعری کو متاثر کیا۔ مرہٹی ادب کی دنیائے افسانہ اور ناول نامی پھڑکے، وی۔ ایس کھانڈیکر، مدکھولکر، اترے، پینڈسے اور خواتین میں مسز مالتی بیڈیکر، ورگیتا سانے نے بڑا نام پیدا کیا۔ افسانہ نگار خواتین میں مسز کتابائی دیکشت اور مسز کملابائی تاب نے متوسط گھرانوں کے گھریلو حالات سے متعلق افسانے لکھے۔ ڈرامہ کو مراٹھی ادب میں ترتیب کے صنفِ ادب کے سب سے اعلیٰ مقام ملا۔ پول دیشپانڈے کو اس ضمن میں حیرت انگیز حد تک مقبولیت حاصل ہوئی۔ دیگر نثری اصناف مثلاً انشائیہ وغیرہ میں رابعہ جوشی نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس سلسلے میں رابعہ جوشی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مرہٹی دان حضرات میں اردو افسانہ سے متعلق شوق اور دلچسپی پیدا کی۔ انھوں نے متعدد اردو افسانوں کے ترجمے مرہٹی میں شائع کئے ہیں جو "میلاد شریف" اور "البیلی واٹا" کے نام سے شائع ہوئے۔

مرہٹی ادب کی یہ ترقی جو تقریباً سات صدیوں پر محیط ہے کسی بھی ادب کے لئے باعثِ رشک ہوسکتی ہے اور اس کے لئے شاندار ماضی میں مستقبل کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

——

پروفیسر کیشو میشرام

مراٹھی کے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات

انسانی جذبات کے اظہار کے لئے زبان وجود میں آتی ہے انسان کی قوت، تجربے، کامیابیاں، ناکامیاں، زندگی کے ساتھ تواتر تصادم، ان سب کا اظہار زبان ہی کا ذریعہ ممکن ہے۔ انسان کی تاریخ صرف زبان ہی کو سکتی ہے، زبان ہی بتا سکتی ہے۔ چونکہ انسان اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے کہا گیا ہے۔ انسان بولنے والا جانور ہے۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے۔

مراٹھی زبان کے پیدائش و وسعت کا خیال کرتے وقت طرز تحریر میں کئی تبدیلیاں سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ اس مضمون کا عنوان مراٹھی کے بدلتے ادبی رجحانات ہے البتہ اس بات کو مدنظر رکھا جائے، کہ یہ ایک سرسری جائزہ ہے۔ اسٹائل ایسا لفظ ہے جو دھوکا دیتا رہتا ہے 'style is the man' یہ جملہ اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی سے کسی نہ کسی باب میں، کسی نہ کسی مد میں مختلف نظر آتا ہے دو آدمی اگر زندگی کے ایک ہی جذبات اور تجربات سے دوچار ہوں تب بھی جس وقت وہ ان کا اظہار کرنا یا لکھنا شروع کر دیں گے تو ان کا انداز یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوگا اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کا جائزہ لیتے وقت جہاں ناول، افسانہ، تنقید، انشائیہ، مضمون کی طرز تحریر اور انداز بیان کو پرکھنا مناسب ہے، وہیں پر نظم کی زبان کو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ لیکن مضمون تعدد سے مختصر ہونے کی وجہ سے ان تمام باتوں پر روشنی نہ ڈال سکوں گا، جس کا مجھے افسوس ہے۔

انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہونے کے بعد، یعنی ۱۸۱۸ء میں جب مراٹھی قلعوں پر انگریزی حکومت کے جھنڈے پھر پھرانے لگے طرح طرح کے پیشے وجود میں آئے، اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہر ایک نے ایک الگ راہ اختیار کی، اور پھر اسے ذریعہ معاش بنا دیا۔ انگریزی حکومت نے بڑی قدر سے اپنا کام چلانے، اس لئے ایک گروپ بنا لیا گیا اور انھیں سماج سیوا کے لئے تیار کیا گیا اسی وقت مراٹھی کہانی وجود میں آئی اور جو کچھ لوگوں کے سامنے لایا گیا اس نے کہانی کا روپ دھارن کر لیا۔

حکومت کی طرف سے جب قانون جاری کیا جاتا ہے تو اس بات کا ہر ممکن خیال رکھا جاتا ہے کہ بہرصورت اس پر زیادہ سے زیادہ عمل ہو اور وہ کارآمد ثابت ہو۔ انگریزوں نے جب ہندوستان کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ان کی بہت ساری باتوں کو ہم نے اپنا لیا ان کی تقلید شروع کر دی گئی انھیں دنوں یعنی ۱۸۷۴ء میں وشنو شاستری چپلونکر کے مضامین کتابی صورت میں منظر عام پر آئے ان کی طرز تحریر پر اڈیسن، میکالے، سپنسر وغیرہ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ آزادی سے پہلے کے ادب میں دو گروپ نظر آتے ہیں، ایک وہ جو پرانے طرز تحریر کے مالک تھے اور دوسرے وہ جن کی تخلیقات میں انگریزی مصنفوں کے چہرے دکھائی دیتے تھے۔ البتہ ان دونوں گروپ سے ایک فائدہ ضرور ہوا وہ یہ کہ معنوی اعتبار سے چاہے ادب میں ترقی نہ ہوئی ہو تب بھی quantity کے اعتبار سے ادب نے ضرور خاصی ترقی کی۔ اس دور پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو اس دور کے ادب پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تب بھی ہم تین چار نتائج ضرور اخذ کر سکیں گے۔

(۱) عورت کی خوبصورتی کی تعریف میں بڑھ گئے ہیں۔

(۲) غم، غصہ، نفرت، پیار غرض ہر طرح کے جذبات کا اظہار، بھڑکدار لفظوں کے ذریعہ۔

(۳) جذبات کی بہ نسبت زبان بلکہ مشکل زبان کو ترجیح دی جاتی تھی۔

(۴) ناول اور کہانی کے موضوع ۔۔۔۔ ۔۔۔ سرے سے غائب پھر بھی اس میں ہر قسم کی زندگی برقرار رکھی جاتی تھی۔

"دو چیزو ویری" ناول میں ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات کا ایک دلکش منظر: اس وقت اس کی گہری آنکھوں کی خوبصورتی اور اٹھتی ہوئی خوشبو کی وجہ سے اس کے دل کا کنول کھل اٹھا ... دل کی ... گہرائیوں میں ترنگ دوڑ اٹھی۔ اور اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو کی وجہ سے اس پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا اور خود کو وہ ڈوبتے لگے۔

دوسرے ایک ناول "منجو گھوش" ... ہیرو کا بیان

"कोरीव आकीदार नुपरां ... पत्थर-
... पसीने ... पुष्प शेजेवर मातो सांजीत-
केवल वसंतमासी ... पसत वायु ज्या
संगीतात मंद मंद गतीच्या शीतल लहरी सर्व गात्रांना
संतोषित करणाऱ्या ज्योत आहेत अशा या एकांत
कुंजात ... मजती शालू नेसलेली
शरीरा ... तेज: पुंज तप ... चे
सौंदर्य आरस प्रतिबिंब जिची कांती सिंह कटी..."

اور ایسے بہت سارے پیراگراف اس ناول میں موجود ہیں۔

اس ناول میں بالکل اسی طرح جب منجو گھوش کے والد ناراض ہو جاتے ہیں اس وقت بھی بالکل اسی طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ جملوں کی بناوٹ ... ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ سیمہ بیگم میں ایک جگہ جذبات کی خوبصورتی دیکھیے۔

"خط پڑھتے ہی بیگم کے دل میں حسد اور غصہ کی آگ جل اٹھی۔ اس کے دل میں جذبات کی رو سانپ کی طرح بل کھانے لگی۔ لگ رہا تھا جیسے سارا خون آنکھوں میں اتر آیا ہے۔ غصہ سے کانپتے ہوئے جسم پر بال کھڑے ہو گئے۔ پورا جسم سراپا تھر تھر کانپنے لگا۔ یہ سب کچھ اسرار کی سوت کی وجہ سے تھا!!!"

اس طرح مراٹھی کی طرز تحریر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ اور ادیب کے قدم اپنی اصل زمین کو تلاش کرنے لگے۔ اس اصل زمین کی طرف راغب کرنے والوں میں ہری نارائن آپٹے، وامن ملہار جوشی، شری کیتکر، ... وی۔ وا آئیر ... پیل ... پانڈے ... کھانڈیکر، ماڈکھولکر اور ... پھڑکے کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مراٹھی زبان اور طرز تحریر کو ترقی کی راہ دکھانے والے یہی لوگ پیش پیش ہیں۔ ... سماجی، سیاسی، طنز و مزاح، جذبات کی عکاسی غرض کوئی بھی موضوع ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ ... کھانڈیکر، ماڈکھولکر، وشرام بیڈیکر وغیرہ نے اسی وقت ... نمایاں تھا۔ بدلتے ہوئے طرز تحریر اور ماحول نے کچھ ... فنکار ہمیں دیے اور فنکاروں کے ساتھ نیا انداز بیان مراٹھی ادب ... کے مطابق جب نئی پود ... اپنے ہاتھوں ... تو جہاں وہ اسے آزادی دیتی ہے ... پھڑکے اور کھانڈیکر نے مراٹھی ... نئی طرز ... کی بنیاد ڈالی۔ اس سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے گا لیکن پھڑکے ... ہوئی زبان، دلچسپ بیان اور ... خیالات ... زبان ادب میں اضافہ ثابت ہوئے وہیں انھوں نے دھیرے دھیرے کچھ رکاوٹیں بھی پیدا کیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار، ... کے نام، باغ، سکول، بلڈنگیں، ہوٹل، خوشی، غم، غصہ یہ بھی ... کے بعد پھر سے سامنے آنے لگا۔ وہی باتیں، مقامات، کردار دہرائے جانے لگے۔ اپنے آپ کو دہرانے لگے۔ ... کوئی بھی زبان ... کے مطابق جب فنکار اپنے آپ کو دہرانے لگ جائیں تو دور ... ہٹا دینا چاہیے۔ نئی پود کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر زبان کی بقا کی ذمہ داریاں اپنے سر لے۔ ... یہ چند لوگوں کی میراث نہیں اس لئے ادب کی بقا کی ذمہ داری سب پر یکساں عائد ہوتی ہے۔ پرانے لوگوں کو سوچ سمجھ کر ہٹ جانا چاہیے اور نئے لوگوں کو سوچ سمجھ کر ہاتھ بڑھانا چاہیے۔

اسی وقت بابا سی مرڈھیکر کے ناولوں اور وسنت کانیٹکر کے مضامین نے پھر سے مراٹھی کی طرز تحریر اور انداز بیان میں نئی روح پھونک دی۔

ان لوگوں نے یہ ایک نئی راہ اختیار کرنی اور اپنے قلم کا لوہا منوا لیا۔ اسی دور میں یعنی ۱۹۴۵ء میں جب ہری بھاؤ آپٹے کے ایک مخصوص طرز تحریر سے لوگ اوب چکے تھے۔ لوگوں نے کھل کر۔ نقادوں نے ڈٹ کر لکھنا شروع کر دیا تھا کہ ایسے سدا شیو پینٹھے۔ سوا تر لکھنے والوں کو فوراً ہٹا دیا جائے اسی دور میں کچھ نئے لوگ اپنے نئے انداز کی وجہ سے فوراً سامنے آگئے جن میں ستری پینڈسے دینکیش، ڈگلگر، انّا بھاؤ ساٹھے، وانڈیکر، کھنکر پانیں، تھورٹ، وا۔ بھ۔ میرات دار، پو۔ بی۔ ریگے۔ اے۔ وی جوشی، بھال چندر سیمانے، مدھو منگیش کرنک، منوہر تلہار، شنکلے، بھاڈپا ھٹے، بابوراؤ گگل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اپنے اپنے گاؤں اور ملک کے مسائل دکھ، سماجی، سیاسی جھگڑے ان کی تحریروں میں نظر آنے لگے۔ "غریبی یا بالو" پینڈسے کا ناول شری، ڈگلگر کا "بنگر واڈی" اور شنکلے کے لکھے ہوئے نئے ناول "فٹک" کو اپنے اپنے خاص انداز بیاں کی وجہ سے ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ یہ ناول ادب میں اضافہ ثابت ہوئے۔ سچ کہا جائے تو یہی بات ... اگلے بھاڑے، شاستری جوشی، بی رگھو ناتھ کی تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے مگر ان کا رنگ اتنا صاف نہیں تھا کہ ان کی تخلیقات ... اپنی حیثیت منوا لیتیں۔

گنگا دھر گاڈگل، اروند گوکھلے، پو۔ بھا۔ بھاوے، کی زبان اور تحریریں ایسی نہیں ہیں کہ انھیں جلد بھلا یا جا سکے گا۔ گاڈگل نے جہاں مراٹھی ادب کو نمائندہ کہانیاں دی ہیں وہیں اپنی ایک خاص زبان بھی عطا کی ہے۔ گوکھلے کی ساری قوت جذبات کی عکاسی میں پائی جاتی ہے بھاوے گو کہ پرانی طرز تحریر سے ہمیشہ ہی وابستہ رہے ہیں پھر بھی ان کے یہاں نئے پن پر پھر بھی زور دیا گیا ہے۔

ی۔ اے کلکرنی۔ تارا و نرسے۔ بی تریم کھانولکر، پانولکر کمل دیسائی، پران مہتا۔ ان سبھوں نے ادب پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ سچ کہا جائے تو کسی بھی فنکار کو اس کے فن سے علیحدہ کر کے دیکھا یا پرکھا نہیں جا سکتا۔

تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کچھ نئے نام پھر اپنے مخصوص انداز بیان اور اپنی نئی کہانیوں اور نئے ادب کی وجہ سے سامنے آجاتے ہیں۔

بابل دیش پانڈے، لال جی پینڈسے۔ کسوا وتی، ...ش پانڈے۔ والیے را، شری جوگ، وال کلکرنی، مکتی بودھ۔ مرڈھیکر، زہیر، کسٹر، کھروی۔ کے بیڑیکر جہاں اپنا سکہ جما چکے ہیں۔ وہیں پر کلکرنی، یادھے برکیے راجے ادھیکش کے نئے پن سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مضامین یا کہانیاں، تنقید، ڈرامے، ناٹک سبھی چیزوں پر ان کے ساتھ اظہار خیال کرنا اور سبھی طرح کا ادب ایک ساتھ پرکھنا بہت ہی مشکل ہے لیکن اس کے باوجود سماجی سیاسی بدلتے ہوئے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ نئے مراٹھی ادب پر اگر نظر ڈالی جائے تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ مراٹھی ادب برابر ترقی کی راہ پر گامزن ہے جہاں پرانے نام نظر آتے ہیں وہیں کچھ نئے نام بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ صرف فن کار بدلتے نظر آئیں گے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ان کا تخلیق کردہ ادب بھی۔ ہر دور میں اس وقت کے پیدا کردہ ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن وقت یہ وقت اپنے تیور بدلتا رہتا ہے۔ کبھی ایک جگہ پر قائم نہیں رہتا اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ طرز تحریر بھی بدلتا جاتا ہے، بات کہنے کا انداز۔ اپنے خیالات کو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرنے کا زاویہ بدلتا جاتا ہے، مختلف ہوتا جاتا ہے۔ اتنا کہ وہ پرانے لوگوں سے بالکل میل نہیں کھاتا اور پھر محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان پرانے لوگوں کو اب اپنی جگہوں سے ہٹ جانا چاہیئے۔ ہٹ جانا چاہیئے تاکہ نئے لوگ ان کی جگہ لے سکیں۔

اس مضمون میں، صرف ایک ہی پہلو زیادہ اجاگر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ مضمون سرسری جائزے کی حیثیت رکھتا ہے ہری کیشو سے لیکر پیرنا پریٹ ایا، بابا پدم جی کے پہلے مراٹھی ناول سے اب تک کی مراٹھی کی بدلتی طرز تحریر اور مراٹھی کے بدلتے ادب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے اور ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم نام چھوٹنے نہ پائے ناموں کی ترتیب میں خصوصاً اس بات کا خیال رکھا گیا ہے۔ ■■

پ. م. دیپ اسنیروکر

مراٹھی افسانہ

کہانی بھی نظم کی طرح مراٹھی ادب کی ایک بہت پرانی صنف ہے۔ اس میں بہت سارے چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ ان میں کچھ رو... کہانیاں، پوتھا ہیں اور کچھ چیزوں کو... ہیں کہانی ہم ادب کی ایک ایسی صنف جس میں ہم ہر پہلو کو چھو سکتے ہیں۔ اس لئے جیسے جیسے انسان نے ترقی کی اس کی کہانی نے ترقی کی ہے۔ حتیٰ کہ رامائن اور مہابھارت کا اہم کہانی کا سا ہے۔ زندگی کی خوبصورتی، بدصورتی ہر بات کو لوگوں تک پہنچانے کا یہ ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اس وقت جسے ہم اصل کہانی کہتے ہیں اس کا بہت ہی قریبی رشتہ پرانی کہانی سے ہے۔ مثلاً اساپ کی کہانی وغیرہ۔

ہندستان میں انگریزوں کے اقتدار اور ان کے کلچر اور ادب کے زیر اثر سب ساری چیزوں کی کایا پلٹ گئی۔ اور اسی کا اثر ہماری زبان اور ہمارے ادب پر بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے انہیں کی وجہ سے نیا ادب ہمارے ادیبوں کے سامنے آیا۔ ۱۸۰۲ء میں مضامین کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اور اس کے بعد کہانی، ناول، ناٹک ایکانکی ڈرامے، نظم وغیرہ میں بے شمار تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ ۱۹۰۲ء سے قبل مہاراشٹر میں ماسک منورنجن، ادھانا، نویگ ماہنامے جاری تھے۔ البتہ ان کی تعداد اور تعداد اشاعت بہت کم تھی۔ ان دنوں تعلیم کا پھیلاؤ زوروں پر نہیں تھا۔ ان دنوں درمیانی طبقہ (برہمن کی) پوری توجہ نئی حکومت یعنی انگریزوں کے نئے نئے اقدامات کی طرف مبذول ہو چکی تھی اور اس لیے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۰ء تک لوگوں نے جتنی ترقی زندگی کے دوسرے شعبوں میں کی اتنی ترقی ادب میں نہ ہو سکی۔ ادبی ماہناموں کی تعداد اشاعت میں ذرہ برابر ترقی نہ ہو سکی حالانکہ کئی جگہوں پر دوسرے اخبار بہت ہی چل نکلے تھے۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ ان دنوں بہت سارے ادیب، مدیر بن گئے اس وجہ سے اس چالیس سال کے طویل عرصہ میں مراٹھی کہانی نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔ اس وقت قاری کے پاس وافر وقت تھا اور وہ زیادہ وقت مطالعہ پر صرف کرسکتا تھا اور ادیب اپنی فن کاری پوری طرح اجاگر کرسکتا تھا۔

۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۰ء تک کے درمیان ہری بھاؤ آپٹے نے بے شمار کہانیاں لکھیں۔ البتہ ان دنوں کہانیوں کو دوسرا درجہ حاصل تھا اور ناول کو پہلا۔ ہری بھاؤ آپٹے دلت پات سے متعلق بہت لکھا کرتے تھے۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ "[illegible]" بہت ہی مشہور ہے۔

"[illegible]" "[illegible]" "[illegible]"

"[illegible]"

ان تمام کہانیوں میں سے صرف ان کی ایک ہی کہانی، "[illegible]" بھی نئے قاری کے سامنے پیش کر دی جائے تب بھی مجھے یقین ہے وہ پسند کی جائے گی۔ "[illegible]" میں ان کی زندگی کے تجربات اور گہری نظر کے ساتھ ان کے وشال من کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا نظریہ "[illegible]" ناول میں پوری طرح سے واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ اور ان کے یہی نظریے اور باریک بینی دوسری کہانیوں میں بھی نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

مراٹھی میں کہانیوں کی مقبولیت کا سہرا شری وٹھل سیتا رام گرد جر کے سر ہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان گرد جر ہی صف اول کے لکھنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول تھے وہ پہلے کہانی کار ہیں اور اس کے بعد ناول نگار۔ ہری بھاؤ آپٹے کی کہانیوں میں جو چیزیں کہیں دکھائی نہیں دیتیں، وہ ساری باتیں ان کی کہانیوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ طنز، مزاح، زبان کی خوبصورتی، الفاظ کی نشست

برقرار ... کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے کوئی نئی اور رومانی بات، رومانس ... کہانی ... گرتے نے سب ... [illegible] ہی ایک مجموعہ عام ... سے مراٹھی ... زبان اور ... بیان ... نے کی ... پڑھے جاتے ہیں ... ادب کو وقت کے ساتھ دیکھ کر ہی لکھنا ... کے ساتھ ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

نئی کہانی کا جنم ۱۹۲۰ء کے بعد ہی ہوا۔ اس میں اکثر خوبصورت رچنائیں سامنے آئی ہیں۔ اس ... کی زبان اور کہانیوں ... پایا جاتا ہے۔ اس میں گوکھلے، ... ، دیشپانڈے سے سرگرم کار آشنا بائی تنر کے قابل ذکر ہیں۔ نئی کہانی کے جنم ... کی کہانیوں میں جذبات ... زبان، زندگی کا ... پیچ بھی کچھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کا

... [illegible] ... بہت ہی مقبول ہے۔ [illegible] ... اور ... پڑھتے وقت اکثر ... [illegible] ... ٹیگور کی کہانیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جیتے جاگتے کرداروں کا بہت ہی قریب سے مطالعہ کیا اور ان کی زندگی کو چھوٹے چھوٹے واقعات تک کو کہانی کا روپ دیا اور ایک نئے اور اچھوتے انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

دو اکر کرسن ... کھانڈیکر اور پھڑکے کے کا ... پھڑکے نے مراٹھی کہانی کو خوبصورت زبان سے نوازا ہے۔ ... درمیانی طبقے اور ... اس سے بھی اونچے طبقے کی انھوں نے ... کی ہے۔ ان کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ ان کے ناول بھی کافی مقبول ہیں۔ مشہور ہیں کھانڈیکر نے درمیانی طبقے کے سکھ دکھ پر ... سے پھڑکے نے جس طرح رومینٹک کہانیاں لکھیں کھانڈیکر نے ہر کہانی کے پیچھے ایک نئے عقیدے کو اجاگر کیا۔ [illegible]

[illegible] ... کوئی ... ان کے دور میں لکھا ... [illegible] بھی کافی مقبول ہیں۔

کھانڈیکر کے اس دور کے ... درمیانی طبقے کے گھر لو ... اور گھریلو زندگی ... ان کی ... طور پر نظر آتی ہے۔ [illegible] ... ان کی کہانیوں میں درمیانی طبقے ... [illegible] ... کا کھلے طور پر اظہار کیا گیا ہے۔ سچ کہا جائے تو انھوں نے عام لوگوں کو زندگی سے پیار کرنے کا راستہ دکھایا۔ ان کی ایک اور خصوصیت زبان کا با محاورہ استعمال ہے۔ انھوں نے کہانی مضمون اور سوانح نگاری کے فن کو اپنی کہانیوں کے ذریعہ بہتر طریقے سے لوگوں پر واضح کیا۔ انھوں نے نئے ادیبوں کے ذہن کو بالائے طاق رکھ کر زندگی کے صحیح تجربات کو کہانی کا روپ دیا اور اچھے فن کا نمونہ ...

۱۹۲۰ء کے آس پاس وامن چورگھڑے بحیثیت کہانی کار لوگوں کے سامنے آئے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک مراٹھی کہانی کی زبان اور انداز بیان کو نئے نئے موضوعات کی طرف راغب کرنے والوں میں ان کا نام پیش پیش رہے گا۔ ان کی کہانیوں میں چھوٹے چھوٹے جملے پائے جاتے ہیں۔ انسان کے تجربات، اس کے اندر اٹھنے والے جذبات، خیالات اور بہت ساری باتوں پر ان کی مضبوط گرفت تھی۔ چورگھڑے کی [illegible] ... کہانیاں بہت مقبول ہیں۔ چورگھڑے کا دل ایک شاعر کا دل تھا ... ان کی کہانیوں پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ زندگی کی بہت ساری ... انھوں نے ... کی ہے۔ البتہ اس کے بعد مراٹھی کہانی ... کا یا پلٹ گئی۔ بھانت بھانت کی بولیاں ... طرح طرح کے موضوعات نے مراٹھی کہانی کا دامن وسیع ہو گیا کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر نہ لکھا گیا ہو۔ ... نے رومانس سے بھری ہوئی کہانیاں لکھیں اس میں انسانی خواہشات

. . . کہانی ما گیا ہے ۔ ایک کو نا "मनाचे मळे" اسی
. آ . . . لڑکے کی کہانی ماخوذ ہوئی ۔
. . . ان ادر فی صدا ما فورات رتی کے سامنے
. . . . اسلام اسا کہا اور خود سامنے آجاتی ہے
. . . . نے ذکر کیا ہاں "सोनेरी स्वप्न भंगलेले"
. . ان کا انداز بیان کچھ اس . . . کہ . . . . دل پر اثر کرتا ہو۔
نئی کہانی کا دور میں آج ہو ، مد گوکھلے ، گنگا دھر گاڈگل ۔
وینکٹیش ماڈگلکر اور . . . کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں
. . . . گوکھلے نے مراٹھی کہانی کو . . ساری . . . سے مالا مال کر دیا
ہے ۔ طرح طرح کے لوگ نت نئے . . ان کی کہانیوں میں نمایاں
طور پر نظر آتے ہیں لوگوں کی عام زندگی پر ہر پہلو سے انھوں نے
سوچا اور لکھا ہے ۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ وہ کہانی کو کردار کے
سینے میں اتار دیتے ہیں ۔ اس لئے وہ آدمی کو زندہ رہنے پر اکساتے ہیں
کہانی سے ان کی زبان الگ ہو کر نہیں چلتی بلکہ ساتھ ساتھ رہتی ہے
انسان کے ہر سکھ اور دکھ میں وہ شریک دکھائی دیتے ہیں ۔ آج انسانی
زندگی کا جو مکمل ڈھانچہ بدل گیا ہے اس پر اور انسانی زندگی کی گمراہی
پر ان کی گہری نظر ہے ۔ انسان کی عظمت اور تقدس کا احساس ہمیشہ رہتا
رہتا ہے ۔

گوکھلے کے ساتھ ساتھ وینکٹیش ماڈگلکر نے بھی مراٹھی کو نئی طرز کی
کہانیاں دی ہیں ۔ ماڈگلکر کا دیہاتی زندگی کی عکاسی میں نمایاں حصہ ہے
اگر کہا جائے تو ان کی کہانیاں بالکل گاؤں کی کہانیاں ہیں ۔ وہ
انسان کی روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں ۔ ماڈگلکر براہ
راست زندگی سے مخاطب ہوتے ہیں اور زندہ کردار کو ہی
کہانی میں اجاگر کرتے ہیں ۔ زندگی کے سارے بہاؤ انھوں نے اپنائے
ہیں ۔ اس لئے ان کی کہانیاں متوجہ کئے بغیر نہیں رہتیں ان کے کردار
زندگی کے تمام دکھوں اور آسانیوں کی کھوج کرتے ہیں اس سے زیادہ
اپنی بساط سے اور اپنی حیثیت سے زیادہ پاؤں پھیلانے کی کوشش
بھی نہیں کرتے ۔ . . . .
. . . . ان کی کہانیوں میں دکھاوا اور تصنع نہیں پایا جاتا

ان کے یہاں سب سے اچھوتی بات تو یہ ہے کہ کردار موضوع کے اعتبار سے
ان کی گرفت میں . . . رہتے ہیں ۔ اور کہیں بھی ان میں جھول پیدا
نہیں ہوتا ۔

ماڈگلکر کی . . . . . دیکھو سے بھی باوری کے دامن میں
سے . . . . دلچسپی ڈالی ان کی کہانیوں میں سب سے
زیادہ پایا جاتا ہے ۔ ان کی کہانیوں میں قدرتی مناظر کے علاوہ جو جیتا
جاگتے بھی پائے جاتے ہیں ان کی تحریر پر نیچر کا بہت اثر رہا ۔
ماڈگلکر کے ساتھ ساتھ یعنی ان ہی کے دور میں گنگا دھر گاڈگل بھی
بہ حیثیت کہانی کار سامنے آئے اور ۱۹۵۱ء میں دونوں ہی کو اپنی اپنی
کہانی پر پہلا انعام ملا ۔ اور وہ پہلا انعام ان دونوں میں تقسیم کیا گیا ۔ ماڈگلکر
کی کہانی "काळ्या आली होती" اور گاڈگل کی "हेलावणारी गोष्ट" (۱)
یہ ایک انعام کی دو سا جھے دار کہانیاں ہیں

گاڈگل کی کہانیاں ، اروند گوکھلے اور ماڈگلکر سے بالکل ہی مختلف
ہیں ۔ الگ موضوعات کی ہیں ، عام انسانی زندگی کی عکاسی ، نوکری ، چاکری
آمدنی ، دکھ اور سکھ یہ سبھی کچھ ان کی کہانیوں میں نظر آئے گا ۔
. . . دور میں مرڈھیکر کی شاعری اور گاڈگل کی کہانی . . . نہیں . . .
کوئی ربط ضرور پایا گیا ، جس کا احساس ان دونوں کی تخلیقات کے
مطالعہ کے بعد ہوا جو کچھ مرڈھیکر کی شاعری میں نظر آتا ہے وہی گاڈگل
کی کہانیوں میں بھی پایا گیا ۔ عام انسان کی داستان پر ان کی گہری نظر ہے
ہماری زندگیاں بدل گئیں ، رہن سہن بدل گئے ، پرانے سانچے بدل
گئے . . . . مراٹھی
کہانی نے بھی نئی کروٹ لی ۔ اور نئی کہانی کا آغاز ہوا ۔ اور وینکٹیش
ماڈگلکر نے دیہاتی زندگی کو جو عکاسی کی ہے ۔ وہ آج بھی نئی کہانی میں
موجود ہے اس کا اثر اب بھی جاری ہے گلکر نے سبھی کچھ اپنی کہانیوں
میں سمو دیا ہے اور نئے کہانی کاروں میں یقیناً ان کا مقام بہت بلند ہے
اسی طرح آج کئی چھوٹے بڑے فنکار نئی طرز کی چھوٹی کہانیاں لکھ
رہے ہیں ۔ اور نئی نئی تخلیقات کو جنم دے رہے ہیں اور اپنی کسی ایک

کہانی نمبر ۱ اور ۲ اسی نمبر میں شامل ہیں۔

خصوصیت کی وجہ سے ادب میں اضافہ کر رہے ہیں۔ انا سکر جار ہے ہیں۔ دو دھیا کر پنڈلک کی نئی، دو پرانی سرحد پر شاعری کی طرح موثر کہانیاں، آنند یادو کی دیہاتی کہانی، بیٹے دنت دلوی کی [illegible] جیسی نئی طرز کی کہانیاں قاری کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ دلوی نے انساں کی داستاں (نفسیاتی خواہشات) کا جہاں اظہار کیا ہے وہیں [illegible] جیسی نئی طرز کی کہانی کو جنم دیا ہے۔ اسی طرح چی تریم کھانولکر، پانولکر، وجنے تینڈولکر نے بھی آج اپنے لئے ایک مخصوص جگہ بنائی ہے۔ کھانولکر کی [illegible] "رشتہ نہائی" تینڈولکر کی "[illegible]" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اچیوت بروے، شنکر پاٹل، د، ما میراشی اور کی طنز و مزاح سے پر کہانیاں نئی مراٹھی کہانی میں اضافے کا باعث ہیں اسی طرح شری نی دھار اے، ادھکاش، کمل ڈیسائی، سدھا نر دے، تارا وناریکر، شرش پے، دسو دھرا، پٹوردھن خواتین افسانہ نگاروں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی نئی طرز تحریر قاری کے دل میں اپنے لئے گھر پیدا کر لیتی ہے۔ رنجیت ڈیسائی جیسے پرانے کہانی کاروں کے ساتھ ساتھ د۔ پو۔ کالے، مدھو منگیش کرنک، ش۔ نا۔ نورے بھی آج ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور مراٹھی کہانی کے لئے کئی اور دوسرے دروازے کھول رہے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ان کی ساری ہی کہانیاں معیاری ہوتی ہیں البتہ ہر ایک کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ اپنے اپنے موضوعات اور علاقوں کی عکاسی ہی میں یہ نئے فن کار کوشاں ہیں، الگ الگ طبقوں پر ان کی گہری نظر اور چھاپ ہے اور اسی لئے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نئی مراٹھی کہانی کا یہ رنگ پہلے کے بہ نسبت اور بھی زیادہ گہرا اور سنجیدہ ہوگا۔ اور یہ نئی کہانیاں مراٹھی کہانی میں ایک نئے باب کا آغاز کریں گی۔

(ع‍ط) یہ کہانی بھی اس نمبر میں شامل ہے

چند نئی کتابیں

آزاد نظم اردو شاعری میں

کنول کرشن باد

قیمت ۷۱ روپے

•

عکس ریز

مظفر حنفی کی طویل طنزیہ نظم

قیمت : ۳ روپے

•

طوفانِ حوادث

پروین سرور کا جذباتی ناول

قیمت : ۳ روپے

•

کھلونے

مسعود مفتی کا اچھوتا ناول

قیمت : ۳ روپے

زیرِ طبع کتابیں

درد کا شجر

زبیر رضوی کا شعری مجموعہ

•

ٹُن ٹُوٹ

یوسف ناظم کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

•

ڈوبتے بھیگے ہوئے لوگ

اقبال مجید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

•

پہلی آواز

رتن سنگھ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

کتاب پبلشرز ، چوک ، لکھنؤ ۳

کماری وجیا سالوی

مراٹھی ڈرامہ

مراٹھی ڈرامے کی اصل ابتدا انگریزوں کے ابتدائی دور میں ہوئی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس سے قبل مراٹھی ڈرامے کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ شکنتلا کی مقبولیت آج کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ لیکن پہلے شاعروں کے لئے ڈرامہ لکھنا اور عام لوگوں کے لئے ڈرامے دیکھنا کچھ اچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن اسی وقت جب مراٹھی ڈرامے کا جنم ہوا اس وقت وہ صرف بالشت بھر ہی کا تھا۔ اس کی اہمیت یہ ہی کہ تھی مراٹھی رنگ بھومی کی بنیاد وشنو داس بھاوے نے رکھی۔ وہ خود ایک اچھے اداکار، ڈائرکٹر اور گلوکار تھے۔ کرناٹک کے لوگوں کی بھاگوت نام کی ایک ناٹک کمپنی تھی۔ انھوں نے سانگلی میں اپنا ڈرامہ اسٹیج کیا۔ اسی ڈرامے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے بھاوے نے رنگ بھومی پر [illegible] کے نام سے پیش کیا۔ مراٹھی کا سب سے پہلا ڈرامہ یہی ہے جو ۱۸۴۳ء میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد اور لوگ اس میدان میں اتر آئے اور انھوں نے [illegible] — [illegible] جیسے مذہبی اصولوں پر ڈرامے لکھے اور [illegible] سے رنگ بھومی پر پیش کئے۔ ان تمام ڈراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں نظم کے ساتھ ساتھ نثر بھی استعمال کی گئی تھی — طرح البتہ ان ڈراموں میں ادبی نقطہ نظر سے کوئی قابل ذکر بات نہیں پائی جاتی تھی یہاں تک کہ مزاح کے پہلو بھی ناپید تھے لیکن ان کی اہمیت کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے مراٹھی ڈرامے کو جنم دیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی اور نمونہ ہی نہ تھا اور نہ ہی کوئی دوسری مثال تھی جس کی بنیاد پر وہ اپنے ڈراموں کی بنیاد رکھ سکتے تھے

رنگ بھومی کی دوسری کڑی ۱۸۶۰ء کے بعد شروع ہوئی اور اس میں سے ایک نیا رنگ سامنے آیا ۱۸۶۰ء تک وہی پرانی روش باقی تھی [illegible] اور "[illegible]" جیسے ڈرامے [illegible] اسٹیج کئے گئے۔ رنگ بھومی کی باقی تمام روایات ویسی ہی باقی رہیں۔ صرف ڈرامے لکھے جانے لگے ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی انگریزوں کے زیر اثر تعلیم [illegible] آگئے۔ اور انھوں نے محسوس کیا کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے سامنے ان کے ڈراموں کی کوئی حیثیت نہیں۔ انھوں نے ہیملٹ اوتھیلو، رومیو اینڈ جولیٹ، کو مراٹھی کا روپ دیا اور کتابی صورت میں شائع کیا۔ اور انھیں کتابی ڈرامے (بکش ڈرامے) کہا جانے لگا۔ انھیں رنگ بھومی پر پیش کرنے کے بعد مراٹھی ڈرامے کی کایا پلٹ ہو گئی۔ خوبصورت پردے، خوبصورت اسٹیج، کپڑے اور ان کے ساتھ ہی اسٹیج [illegible] نظر آنے لگے اسی وقت سنسکرت اور انگریزی ڈراموں کو سامنے رکھ کر مراٹھی میں ڈرامے لکھے جانے لگے اور سب سے کامیاب تجربہ ۱۸۶۱ء میں [illegible] نے کیا اور ان کا لکھا ہوا ڈرامہ [illegible] بے حد کامیاب رہا۔ مراٹھی کا پہلا [illegible] مراٹھی ہی میں لکھا گیا۔ باقی ڈراموں کی طرح ترجمہ نہیں تھا اس لئے اسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے — [illegible] راگھو، آنندی بائی اور بھی ایسے دوسرے کردار [illegible] اسی ڈرامے کے بعد مراٹھی میں نئے ڈراموں کی ابتدا ہو گئی اور تاریخی ڈراموں کے ساتھ ساتھ سماجی ڈرامے بھی لکھے جانے لگے [illegible] کے آدھار پر لکھے ہوئے ڈرامے اور "[illegible]" جیسے سماجی ڈرامے وجود میں آ گئے۔ ان ڈراموں کی روش پہلے ڈراموں سے بہت ہی مختلف تھی۔ خصوصاً مکالموں کے منظر بہت ہی کم ہو گئے۔ گانوں میں نئے راگ آ گئے۔ اداکار اپنے ڈائیلاگ خود ادا کرنے لگے یہ تبدیلی ہمیں ۱۸۸۰ء کے بعد ہی نظر آنے لگی

۱۸۸۰ء میں کرلوسکر کا پہلا تجربہ "[illegible]" بہت ہی کامیاب رہا اور یہاں سے مراٹھی اسٹیج اور ڈرامہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اناصاحب کرلوسکر نے [illegible] ڈرامے لکھے۔ اور ان ڈراموں کے مطالعہ کے بعد مراٹھی ڈرامے میں بہت ساری تبدیلیوں کا آنا ضروری ہو جائے گا۔ کرلوسکر نے ہر ڈرامے میں اپنا ایک مقصد ضرور برقرار رکھا ہے کرداروں کو بھی پیش کیا ہے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہی نہیں انھیں خوبصورتی کے ساتھ سنگیت سے بھی سجایا ہے۔ دلچسپی برقرار رہے۔
مراٹھی ڈرامے میں نئی روح پھونکنے کا سہرا اناصاحب کرلوسکر کے سر ہے۔

اس کے بعد ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۰ء کا عرصہ مراٹھی رنگ بھومی کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس عرصہ نے مراٹھی کو اچھے فن کار اچھے ڈرامہ نویس دیئے ان میں پہلا نام گووند بلال دیول کا لیا جائے گا ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۳ء تک کا عرصہ دیول کا عہد ہے انھوں نے "[illegible]" یہ ڈرامے سنسکرت ڈراموں کے آدھار پر لکھے [illegible] اور [illegible] اور عثیلو اور تال ان دی رانگ کے تراجم ہیں اور [illegible] ان کی اپنی تخلیق ہے۔ ان کے ڈرامے پڑھنے کے بعد ان کی کچھ خصوصیات فوراً سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی زبان بہت ہی سلیس ہے۔ اور انھوں نے انگریزی ڈراموں کے تراجم میں بھی خاصا ماحول پیدا کیا ہے۔ یہ بات خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ دیول کے خود بھی اچھے ڈائرکٹر ہونے کی وجہ سے ان کے ڈرامے بہت ہی مقبول ہوئے۔ دیول کا ڈرامہ [illegible] سماجی ڈرامہ ہے اور مراٹھی ڈرامے کی تاریخ کا ایک انمول حصہ ہے۔ انھوں نے اس ڈرامے میں بچپن اور کافی عمر گزرنے کے بعد شادی کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے اور کوکن کی شادی بیاہ کی رسموں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ دیول کے دور میں مراٹھی ڈرامے موضوع اور اسٹیج کے اعتبار سے بہت ترقی کی۔

ان کے بعد ۱۸۹۳ء سے ۱۹۲۸ء تک کولہٹکر کے ڈرامے مراٹھی ادب میں اضافہ کا باعث بنے "मूकनायक" "प्रेम शोधन" اس طرح سے کل بارہ ڈرامے لکھے "[illegible]" "गुप्तमंजूष" کولہٹکر کے ان ڈراموں کو Camedias کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ڈراموں پر شیکسپیر کی تحریر کا بھی تھوڑا سا اثر پایا جاتا ہے ان کے یہاں جملوں کی بندش بھی تھوڑی سی کمزور پائی جاتی ہے کولہٹکر کی وجہ سے سب سے بڑی تبدیلی جو وجود میں آئی وہ ہے سنگیت انھوں نے اردو ڈراموں کی دھنیں مراٹھی اسٹیج کے لئے اپنائیں جس کی وجہ سے مراٹھی سنگیت اور اس کے گیت کافی مقبول ہوئے۔ نئے راگ وجود میں آئے ان کے ڈراموں میں۔ [illegible] آج بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بیوہ کی شادی پر انھوں نے زور دیا اور ہر ممکن طریقے سے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔ سماج سدھار میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن کولہٹکر نے اکثر و بیشتر اسٹیج کا خیال بالکل نہیں رکھا۔ وہ صرف یہی سمجھتے رہے کہ خوبصورت پردے ہی اسٹیج کی جان ہیں اسی وجہ سے اگرچہ ان کے کچھ ڈرامے بے حد کامیاب رہے لیکن اب انکے فن کو ایک معمولی سی چیز سمجھا جانے لگا ہے۔

مراٹھی ڈرامے کے مستقبل کو کرلوسکر، دیول، کھاڈلکر اور گڈکری کے ہاتھوں نے سنوارا ہے۔ مراٹھی رنگ بھومی میں شری پاد کرشن کھاڈلکر کو بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ انھوں نے ۳۰ سال تک متواتر ڈرامے لکھے۔ ان کے یہاں فن سے وفاداری کے ساتھ ساتھ ملک سے استواری کا بھی سبق ملتا ہے۔ سماج کے بھی بہت سارے پہلو نمایاں طور پر اجاگر کئے گئے ہیں وہ لوکمانیہ تلک گروپ سے متعلق نظر آتے ہیں اور انکے ڈراموں میں تلک کا پیغام بھی ملتا ہے۔ یعنی وہ سیاست میں "تلک وادی" نظر آتے ہیں۔ تاریخ اور دھارمک اصولوں کی بنا پر انھوں نے کل پندرہ ڈرامے لکھے ہیں "सं स्वयंवर" "कीचक वध" "कांचनगडची मोहना" "सं मानापमान" اور "भाऊबंदकी" "सवाई माधवरावाचा मृत्यू" خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ان میں بھی "सं बायकांचे बंड" "सवाई" "भाऊबंदकी" "मानापमान" کی وجہ سے ان کی مقبولیت صد درجہ بڑھ گئی माधवरावाचा मृत्यू کھاڈلکر نے ایک خاص اصول اور پیغام کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈرامے لکھے اور سیاست اور ادب کے ملاپ پر زور دیتے ہوئے اپنے سیاسی خیالات کا پرچار بھی کیا۔ زندگی کی زندہ کہانیوں کو انھوں نے

ڈراموں کا روپ دیا۔ اور عام لوگوں کے مذاق کا خیال رکھتے ہوئے انھیں نئے سندیش دیے، اپدیش دیے اس لیے لوگوں نے انھیں بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کے ڈراموں کے کرداروں کی زبان بھی اتنی سلیس تھی کہ عام آدمی بھی انھیں پسند کرتا تھا۔ کردار نگاری میں بھیم، شری کرشن، دروپدی، راگھو باد وغیرہ کے کردار قابل ستائش ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی طرح کھاڈیلکر کے ڈرامے بھی Character play کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کے بعد ایک اور ستارہ جو بہت جلد چمکا، اٹھا [illegible] رام گنیش گڈکری ہیں۔ ان کے ڈرامے ہیں [illegible] "[illegible]" [illegible] ہم ہیں۔ ان کے ڈراموں میں زبان کی خوبصورتی پر بہت زور دیا گیا ہے جیسی ایک مثال "[illegible]" ہے۔ اس کے کئی پیراگراف زبان کے بہترین نمونوں میں گنے جاتے ہیں [illegible] قابل ہیں لیکن زبان کے حسن میں کہیں خیال ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ صرف خوبصورت زبان اور خوبصورت جملے ہی ہاتھ آتے ہیں۔ وہ زبان کی شیرینی میں ہمیشہ ہی مگن رہتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں اکثر ناامیدی ہی پائی جاتی ہے پورے کے پورے ڈرامے ناامیدیوں سے بھرے پڑے ہیں اس لیے ان میں سچی اور اصل زندگی کی عکاسی بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے ڈراموں پر [illegible] کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن گڈکری کی زبان اور انداز بیان آج بھی قابل تعریف ہے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک [illegible] اس عرصے میں دو نام وامن دیوشاستری کھرے اور نرسیمہ چنتامن کیلکر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کھرے نے "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" اور بہت سے دوسرے ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈرامے سنسکرت ڈراموں کے آدھار پر لکھے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے نقطۂ نظر سے "[illegible]" "[illegible]" کامیاب ثابت ہوئے۔ این۔ سی۔ کیلکر کا ڈرامہ "[illegible]" بہت مقبول ہوا اور مراٹھی رنگ بھومی پر کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا۔ ان دوروں [illegible]

"[illegible]" "[illegible]" "[illegible]"

وغیرہ لکھے گئے مگر ان میں کوئی خاص قابل ذکر ڈرامہ نہیں۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء کے آس پاس کا عرصہ مراٹھی ڈرامے کے لیے بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بہت سارے تجربے کیے جا رہے تھے۔ اور دوسرے رنگ بھومی پر روزانہ نئے تجربے ہو رہے تھے۔ مراٹھی ڈرامہ دن دونی رات چوگنی ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ گندھرو ناٹک منڈلی، بلونت ناٹک منڈلی، یہ ناٹک کمپنیاں [illegible]

"[illegible]" "[illegible]" "[illegible]"

[illegible] اثر مرتب تجربے کر چکی تھیں۔ مہاراشٹر ناٹک منڈلی بھی صرف مقبول ہی نہیں تھی بلکہ اس نے کافی روپیہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت فلموں کی طرف لوگوں کا بالکل رجحان نہیں تھا۔ اس لیے یہ کمپنیاں ترقی کر گئی تھیں۔ البتہ ۱۹۳۰ء کے بعد رنگ بھومی کو قدرے زنگ لگنے لگا۔ کھاڈیلکر، گڈکری کے ڈرامے کی مقبولیت دن بدن کم ہو رہی تھی لیکن چند ڈرامہ نگار رنگ بھومی کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں بھا۔ وی۔ ورێرکر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، قابل ستائش ہے۔ انھوں نے دھارمک، تاریخی، سماجی، سیاسی سبھی قسم کے ڈرامے لکھے۔ سماج کے بہت سارے پہلوؤں کو انھوں نے اجاگر کیا۔

"[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" مگر ان کے چند اہم ڈرامے ہیں جو اگرچہ زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔ پھر بھی انھوں نے سماج کے بہت سارے نقائص کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور ہنڈے (جہیز) سے لے کر شراب بندی تک اپنے خیالات کا پرچار کیا۔ انگریز، نچلے طبقے سے ایک قسم کا لگاؤ تھا، محبت تھی۔ اس لیے وہ ہر وقت لوگوں کو اپنی غریبی دور کرنے کی صلاح دیتے رہتے تھے ۔۔۔ انھوں نے اپنے ڈراموں سے موسیقی کو ختم کر دیا۔ ابتدائی لمبی چوڑی تقریریں بھی ختم کر دیں اور پہلے ہی منظر میں سبھی کرداروں کی اسٹیج پر آمد کی جو پرانی روش تھی، ایک پرانی پرمپرا تھی، اسے بالکل ختم کر دیا۔ انھوں نے مراٹھی رنگ بھومی اور مراٹھی ڈراموں کو اصلیت کے نئے روپ سے آگاہ کیا۔ اس کے باوجود ان کے کرداروں میں مقبول رہنے کی وجہ سے ان کے ڈرامے

ادب کے شاہکار نہیں کہلاتے۔ پھر بھی ان کی نظر میں بہت گہرائی [illegible] اور انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو بخوبی دیکھا اور پرکھا ہے جس کا اندازہ ان کے ڈراموں سے ہو ہی جاتا ہے۔

مادھو نرائن جوشی نے "[illegible]" "[illegible]" "पैसा का पैसा" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" سماجی ڈرامے لکھے۔ انھوں نے ایک پرانی روش کو [illegible] کرداروں کا تعارف شروع ہی میں [illegible] کرنے کا طریقہ برقرار رکھا۔ [illegible] دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے [illegible] ان کے یہاں [illegible] پہلو بھی پایا جاتا ہے [illegible] ان [illegible] میں بھی انھوں نے زندگی کے [illegible] لیکن [illegible] لوگوں کے مذاق کا انھوں نے پاس [illegible] اور [illegible] کے پہلو کو ہاتھ سے کبھی جانے نہ دیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۵ء [illegible] پرشارام جوشی نے "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" چار ڈرامے لکھے [illegible] رنگ بھومی میں بہت کامیاب رہا۔ انھوں نے [illegible] دیا۔ البتہ ان کے کردار بہانے [illegible] اور گہرے رنگ لگاتے تھے۔

دیوداس رام چندر جوشی نے "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" [illegible] لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے رومانس کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں۔ ان کے ڈرامے رنگ بھومی پر [illegible] مقبول ہوئے۔ ان کے ڈرامے دیکھتے وقت آدمی کے دل پر [illegible] داروں کے لہجہ اور ڈائی لاگ کی وجہ سے گہرا اثر ہوتا تھا [illegible] جھوم اٹھتے تھے۔

ادبی لحاظ سے اور اسٹیج کے لحاظ سے داس دیو [illegible] نے کے "[illegible]" اور "[illegible]" یہ ڈرامے خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔ "رعایا کی خوش حالی پر ہی بادشاہ کا دار و مدار ہے" اس نظریے کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے "[illegible]" کی تخلیق کی ہے

"[illegible]" میں پیاہ سے قبل عورتوں کے خیالات اور ان کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے ڈراموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کرداروں کے ساتھ ساتھ واقعات کا ایک اٹوٹ تعلق ان کے ڈراموں میں پایا جاتا ہے۔ [illegible] نئے تجربوں میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان مراٹھی ڈراموں کو جو ایک نیا روپ ملا ہے۔ اس کی آہٹ بھولے کے सरला देवी میں بخوبی پائی جاتی ہے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء کے اس عرصہ میں چند اور ڈرامہ نگار بھی تھے [illegible] گو [illegible] پٹنے [illegible] ونیا نڈے، [illegible] دوسرے ڈرامہ نگاروں نے سیاسی، سماجی اور دھارمک ناٹک لکھے۔ ان میں سے کچھ ڈرامہ نگار ڈائرکٹر اور اداکار کی حیثیت سے بھی مقبول ہوئے۔ وی۔ جی۔ بیڈیکر نے "[illegible]" [illegible] کے آدھار پر لکھا۔ [illegible] کے اصولوں پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ اس ڈرامے میں بیڈیکر نے زبان کی خوبصورتی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اپنے ذاتی خیالات کا پرچار اور کلا کا بھرپور سنگم [illegible] پایا جاتا ہے۔ ڈرامہ نویس اوندھکر کے ڈراموں پر گڈکری کے [illegible] کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے ڈراموں میں [illegible] پیدا نہیں کر سکے۔

[illegible] ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصہ میں مراٹھی [illegible] ڈرامہ نگار [illegible] وی۔ [illegible] ڈیکر اور [illegible] کے [illegible] ڈرامہ نگار لوگوں کے سامنے آئے۔ [illegible] نے "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" ڈرامے لکھے ان میں صرف "[illegible]" ہی دستیاب ہوپاتا ہے ان کے ڈراموں پر کولھٹکر کے ڈراموں اور طرز تحریر کی گہری چھاپ ہے۔ ڈرامہ کے کردار اثر انگیز نہیں [illegible] نے "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" ناٹک سماجی ناٹک لکھے اور

"[illegible] आशा नाची" نامی تین ایک ایکٹ کے ڈرامے تخلیق کئے۔ پھڑکے کے ان ڈراموں پر گڈکری کے طرزِ تحریر کی چھاپ نمایاں ہے اور کہیں کہیں نوکری کی خواہش اور خواہش کی نوکری" جیسے گڈکری کا مخصوص انداز ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ "[illegible]" "[illegible]" کے موضوع [illegible] ہیں بلکہ کرداروں میں مزاح کا عنصر موجود ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کا جادو اور ذو معنی الفاظ کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ طنز، مزاح اور قدرے مترادفات بھی ان کے ڈراموں میں پائی جاتی ہے

نا۔ دھوت۔ سنئوکر نے مراٹھی ڈرامے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

[illegible] नवरा" वनहरिणी' [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] —

"[illegible] आशीर्वाद" — "समाजाच्या

ایسے بہت سارے" [illegible] — [illegible] —

ڈرامے انھوں نے صرف عورتوں اور بچوں کے لئے تخلیق کئے۔ انھوں نے یہ ڈرامے عورتوں اور بچوں کی تفریح کے لئے لکھے ہیں۔ ان کے یہاں اور پرانے کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے اپنے ڈراموں میں ایک پیغام بھی دینے کی کوشش کی ہے کہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر پیغام ملے تو لے لو ورنہ ڈرامے سے صرف لطف اٹھاؤ۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۳۵ء کے اس عرصہ میں ورکرا رہا ہے۔ دو ہی ڈرامہ نگار قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے بعد یعنی سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک اور ڈرامہ نگار سامنے لایا اس کا نام شری دھر وناٹک ورتک سا ہے ان کی "[illegible]" "[illegible]" [illegible] تینوں ڈرامے سنہ ۱۹۲۴ء میں ہی لکھے گئے۔ ان میں سے —— بے حد کامیاب رہا۔ یہ ڈرامہ نارو ے آत्मकथेचा [illegible] کے ڈرامہ نگاروں پرسن کے ڈرامہ A Counter کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ یقیناً مراٹھی ڈرامے میں اضافہ کا باعث ہے۔ یہیں سے نئے نئے موضوعات کی بہار رنگ بھومی پر نظر آنے لگی۔ اس سے قبل بھی ایک دو ڈرامہ نگاروں نے یہ کوشش کی تھی کہ لمبی چوڑی تقریریں

بنیادی حالتیں مگر ڈرامہ پھر اسی پرانی روش پر جا نکلا تھا۔ ورتک نے نئے سرے سے یہ تمام چیزیں اڑا دیں اور قارئین کی دلچسپی برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس دور میں رنگ بھومی پر اور بھی کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں جیسے اب تک عورتوں کا رول مرد کیا کرتے تھے اب عورتیں بھی اسٹیج پر آنے لگیں۔ عارضی تقریریں ختم کردی گئیں بلکہ کھڑکیاں اصل دروازے دکھانے کے لئے کارڈ بورڈ استعمال کئے جانے لگے اور سنگیت کو صرف دوسری جگہوں پر رکھا گیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء سے مرزا یا سا کیشو آتر ے نے ڈرامے لکھنا شروع کئے اور وہ آج بھی رنگ بھومی پر ابھرتا نام ہیں۔ [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

"उद्याचा संसार" "[illegible]" "[illegible]"

ان کے تمام ڈرامے رنگ [illegible] [illegible]

بھومی پر بے حد کامیاب رہے ان کے یہاں مزاح اور طنز کا بھرپور سنگم پایا جاتا ہے۔ سماجی مسائل ان کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں اور وہ اپنے کرداروں کے روپ میں سماج کے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں ان کے ڈراموں کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کا مقصد [illegible] بات بھی درست ہے لیکن उद्याचा संसार بہت ہی سنجیدہ قسم کے [illegible] [illegible] ڈرامے ہیں جن میں ہماری زندگی کی عکاسی پائی جاتی ہے ان کا ڈرامہ [illegible] یہ ایک ادبی شاہکار ہے۔ ان کے ڈراموں پر گڈکری کی طرزِ تحریر کی بہت چھاپ ضرور ہے ان کی سلیس زبان عام قاری کو زیادہ اپیل کرتی ہے اور اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے اترے کی شان آج بھی مراٹھی رنگ بھومی پر ثبت ہیں۔

اسی عرصہ میں آننت کانیکر نے کچھ انگریزی ڈراموں کو مراٹھی کا روپ دیا۔ ابسن کے ڈرامے DOLL HOUSE کو She stoops to Conquer کے گولڈ اسمتھ کے [illegible] کو What every کے جیمس بیری کے [illegible] کو Woman Knows کو [illegible] کے Strife" کے جان گالس ورذی کے [illegible] کو Attention

کو "सुवर्ण" کے نام سے مراٹھی میں منتقل کیا۔ تراجم میں بھی اصل کی شان برقرار رکھی گئی۔ ان کے ان ڈراموں نے مراٹھی رنگ بھومی کو کچھ عرصہ تک اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیا۔ مراٹھی رنگ بھومی کی شان باقی رہی۔ مگر ۱۹۲۰ء کے بعد خود ان صاحب کا رجحان فلم کی طرف ہونے لگا۔ اور دھیرے دھیرے مراٹھی رنگ بھومی کی حالت گرتی چلی گئی۔ مراٹھی رنگ بھومی اس گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کے لئے مو۔ گ رانگیکر جیسے فن کار سامنے آگئے اور انھوں نے وقت کے بدلتے تیور کا اندازہ لگاتے ہوئے مراٹھی اسٹیج کی پرانی شان باقی رکھنے کے لئے بہت ساری تبدیلیاں کیں۔ خصوصاً یہ کہ ڈرامہ میں گھنٹے ہی کا ہو۔ اس میں طنز و مزاح کے عناصر شامل ہوں۔ ناظرین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ہر چیز کا خیال رکھا جائے۔ سیٹنگ، زبان اور ان کے ساتھ اصل موضوع کا بھی خیال رہے۔ خود رانگیکر نے انہیں اصولوں کے ڈرامے لکھے۔

"कुलवधू" "आशीर्वाद" "नाटककार" "मामलेदार" "वैनतेय" "हिमालयाची सावली" "वहिनी" ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ان کا خاص نظریہ تجارت اور تجارت کے ساتھ مراٹھی اسٹیج کو زندہ رکھنا تھا۔ یہی ان کی خصوصیات تھیں اور یہ عذر بھی۔ اسی وجہ سے ان کے ڈراموں میں کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا ڈرامہ — कुलवधू بے حد مقبول ہوا۔ متعدد بار اسٹیج کیا گیا اور ہر تجربہ پہلے سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس کے باوجود ان کے یہ ڈرامے ادبی نقطۂ نگاہ سے صف اول کے نہیں کہے جا سکتے ان کا ادبی مقام کچھ قابل ستائش نہیں ہے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان دوسرے درجہ کے ڈرامہ نگار منظر عام پر آئے۔ جن میں بوڈس کا نتہ آپٹے دانار دیلنکر کے نام لئے جا سکیں گے۔ انگریزی۔ گجراتی۔ بنگالی ڈراموں کے مراٹھی میں تراجم بھی کئے گئے۔ مدھو سودن کالیلکر نے بھی اسی دور میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے لکھے ہوئے ڈراموں میں "दुरितांचे तिमिर जावो" پیارا ڈرامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پو۔ ل۔ دیشپانڈے کا دھارمک اصولوں پر آدھار پر تیار کیا گیا ڈرامہ "एका महालांत आले" اسی دوران یعنی سنہ ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آگیا۔ اور کئی دوسرے ڈرامہ نگاروں نے اپنی اپنی قوت کے مطابق تجربے کئے۔

۱۹۵۰ء کے بعد مراٹھی ڈرامہ کو اور زیادہ ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والوں میں وی۔ وا۔ شرواڈکر کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے ڈراموں میں "वैजयंती" "कौंतेय" "दूरचे दिवे" "राजमुकुट" "ययाति आणि देवयानी" نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ان کے سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ڈرامے "दुसरा पेशवा" اور "दुसरा पेशवा" ہیں جو سنہ ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آگئے۔ ان کے اندر کا چھپا ہوا فن کار انسان کی زندگی کے ہر پہلو پہ گہری نظر رکھتا ہے اور ہر چیز کی تہہ تک پہنچ کر انمول موتی کھوج لاتا ہے۔ ان کی ذاتی شخصیت بھی ان ڈراموں میں ابھر کر آئی ہے۔ ان کے ڈراموں کے کردار دشرامہ سودا، سردار، پیٹنے، وجیلہنی، کاشی بائی "दुसरा पेशवा" کا باجی راؤ، نانا ہو، ستان کرنے یہ سارے ہی کردار اپنے منھ میں اپنی زبان رکھتے ہیں اور ہر پہلو پر گہری نظر۔ مجھے تو ان کی کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ نظر آتا ہے۔ "दुसरा पेशवा" اور "कौंतेय" کے کرداروں کو مکمل طور پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے کا موقع ملا ہے۔

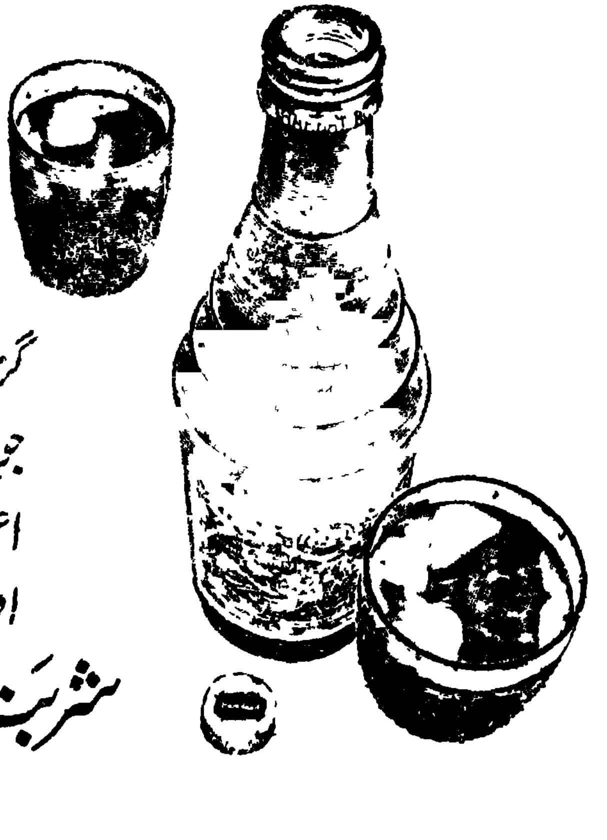
ماما ورکر اس دور کے بہت اچھے ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ڈراموں میں حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔ سماج کی گرتی اور سنبھلتی حالت پر ان کی گہری نظر ہے۔ "आरती" "चंद्र नाटक" "सोन्याचा देव" ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں فن، خیالات کا پرچار اور اپنے سندیش کا عجیب سنگم ہے۔ ان میں ایک عجیب قسم کا تناسب برقرار ہے۔ کوئی ایک پہلو دوسرے پر حاوی نہیں ہوتا۔

آج کے اس نئے دور کے فن کاروں میں پو۔ ل۔ دیشپانڈے کا نام بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی زبان اور انداز بیان ناظرین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ان کے ڈراموں کی کامیابی اور مقبولیت کی وجہ ان کا مخصوص انداز بیان، زبان اور طنز و مزاح ہے۔ یہ تمام باتیں ان کے مشہور ڈرامے "सदा सर्वदा" میں بدرجہ حسن و خوبی پائی جاتی ہیں۔ — "अंमलदार"

[illegible]
ان کے ان مشہور ڈراموں میں صرف [illegible] ہی انگریزی ڈرامہ کا ترجمہ ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد رنگین ڈراموں اور اسٹیج کی پائیداری کے لئے اور بھی نئے تجربے کئے گئے جو بے حد کامیاب رہے اور آج مراٹھی ڈرامہ اور مراٹھی اسٹیج جس قدر مقبول ہے کسی دوسری زبان کا نہیں ۱۹۵۰ء کے بعد مراٹھی ڈراموں میں "ون ایکٹ" پلے نے بھی کافی زور پکڑا اور یہ تجربے بھی بے حد کامیاب رہے۔ آج [illegible] مراٹھی رنگ بھومی پر نظر دوڑاتے ہیں تو یقیناً امید سی بندھ جاتی ہے۔ [illegible] دانوڈکر پلاکے آترے، پو۔ ل۔ دیشپانڈے، وجیا دھر، گوکھلے، کھانولکر وجے تینڈولکر کی تحریریں اپنے اندر ایک عجیب قسم کی کشمکش لئے ہوئے ہیں۔ آج کے یہ فن کار سیاسی اور سماجی ڈراموں میں بھی انسانی روح کی گہرائیوں تک پہنچنے سے نہیں چوکتے ہر باریک سے باریک پہلو پر ان کی گہری نظر ہے۔ آج کی عام زندگی جو الجھی ہوئی ہے، پچھلی [illegible] انسانی [illegible] کہاں کہاں بھٹکے گئے ہیں کہاں کہاں بھٹکے جا رہے ہیں ان سب [illegible] ان کے ڈراموں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان میں تینڈولکر، کھانولکر، اور دندگوکھلے کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

"[illegible]" [illegible] "[illegible]" نام کے ڈرامے انسانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ فن کاروں کی نظر بہت عمیق ہے اور وہ [illegible] کے ساتھ [illegible] بیان کے ساتھ مراٹھی رنگ بھومی پر پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ کام دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا قاری کا فرض ہے، نقاد کا فرض ہے۔ ہم سبھوں کا فرض ہے۔



ماہنامہ کتاب کی

۶
یادگار اشاعتیں

جو ہمیشہ زندہ رہیں گی

سالنامہ ۱۹۶۶
صفحات : ۱۶۶
قیمت : ۱½ روپے

اس یادگار نمبر میں آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن، مجید امجد، قاضی عبدالستار اور بہت سے دوسرے دوسرے فنکاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔

شوکت تھانوی نمبر
قیمت : ۲ روپے

اس نمبر میں شوکت تھانوی کی یادگار تصویروں اور بہترین مزاحیوں کے رنگا رنگ انتخاب کے علاوہ ایک ایسا ڈرامہ شامل ہے جو اس سے قبل کہیں نہیں شائع ہوا۔

افسانہ نمبر
قیمت : ۲ روپے

اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں کم و بیش دو ہزار افسانے تخلیق کیے جن میں سے رام لعل اور عابد سہیل نے ۲۷ افسانے منتخب کیے ہیں۔

نئی ہندی کہانی نمبر
قیمت : ایک روپیہ

اردو افسانے نے ہندی افسانے کو کس حد تک متاثر کیا ہے اس کا اندازہ آپ اس نمبر سے لگا سکتے ہیں۔

علی عباس حسینی نمبر
قیمت : ۱½ روپے

اس نمبر میں حسینی صاحب کی بہترین کہانیوں کے انتخاب کے علاوہ ان کے فن اور زندگی پر متعدد مضامین شامل ہیں۔

سالنامہ ۱۹۶۷
قیمت : ۳ روپے

۲۴۴ صفحات کے اس نمبر میں ۲۳ افسانے، ۴۵ منظومات اور ۴ فکر انگیز مضامین جن جدید شاعری پر ۶ مضامین بھی شامل ہیں سالنامہ میں شائع ہوئے ہیں

کتاب ہمیشہ غیر معمولی نمبر پیش کرتا ہے

سالانہ خریدار بن کر آپ بھی خاص نمبر رعایتی داموں پر حاصل کر سکتے ہیں

ماہنامہ کتاب
چوک لکھنؤ ۳

دیواکر کرشن

مرنالی کی کہانی

وہ حادثہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ بچپن کی کئی باتیں جنہیں میں بھول سی گئی ہوں وہیں کچھ باتوں کو میں بالکل نہیں بھولا سکی وہ برسات کے دن تھے۔ ان دنوں میری عمر بہت کم تھی۔ اشوک کی عمر پندرہ سال کی رہی ہوگی اور میں اس سے چار سال چھوٹی رہی ہوں گی۔ اندھیرا گھپ چھایا ہوا تھا۔ اور بجلی بھی چمک رہی تھی برسات کے وہ دن جب بھی یاد آتے ہیں آنکھوں کو جھڑی سی لگ جاتی ہے۔ رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ مجھ سے چھوٹے میرے بھائی بہن بھی اندر آ گئے تھے۔ اشوک بھی گھر میں موجود تھا۔ وہ میرا ماموں زاد بھائی تھا اکثر وہ ہمارے گھر چار چار دنوں کے لئے آ جاتا۔ اشوک اور ملا تو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی باہر آ جاتے تھے۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی؟ اشوک اور ملا دونوں ہی میرا منہ چڑاتے تھے۔ مگر باہر اندھیرا تھا اور اندھیرے میں نہ جانے کیا ہوتا ہے؟ اس روز دودھ دوہنے کی باری میری تھی۔ میں نے باہر آ کر اس شرط پر منظور کر لیا کہ اشوک دروازے میں کھڑا رہے تو میں دودھ دوہ لوں گی۔ ہم دودھ کا برتن لئے گائے کے پاس پہنچے ہی تھے کہ زور زور سے بادل گرجنے شروع ہوئے۔ زور کی بجلی چمکی۔ بجلی چمکتے ہی میں نے برتن چھوڑ دیا اور ڈر کے مارے جھپٹ گئی۔ میں بے حد گھبرا گئی تھی۔

ان کے کہنے کے مطابق ۱۱ سال کی لڑکی چھوٹی نہیں ہوتی۔ مگر گھبراہٹ کے مارے کچھ نہ سمجھ سکی، نہ ہی سوچ سکی۔ دوڑ کر اشوک سے جھپٹ گئی۔ اشوک نے مجھے بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ ایک بار اس نے منہ پر ہاتھ کبھی پھیرا نہ جانے میں کتنی دیر تک اس حالت میں رہی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش کھڑے رہے۔ بالکل خاموش۔ اور آج جب بھی اس حادثہ کی یاد تازہ ہوتی ہے، آنکھوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے۔

میں سب کچھ لکھنا نہیں چاہتی۔ اگر اسے کوئی پڑھے گا تو بہت وہ میرے متعلق کیا سوچے گا؟ پڑھنے کے بعد اگر وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند ہوا تو وہ جانے کیا کچھ سمجھ لے گی۔ شرم کے مارے میں پانی پانی ہو جاؤں گی لیکن اگر کبھی اسے اشوک پڑھے گا تو کم از کم وہ میرے دل کی بات تو جان سکے گا۔ میں نے تجھے اب سب کچھ بتا دیا۔ وہ مرد ہے۔ ... بھی کرتا۔ مگر میں ایک عورت ہوں۔ اور وہ بھی ... ۔ اس لئے بھلا کیا ... جو میں کہنا چاہتی ہوں۔

... میں آج ... اس کہانی ... ہی۔

اس ... عمر میں تو کچھ بھی بیت ... اس نے میری زندگی ویران کر دی ہے۔ سچ کہا جائے تو میں خود اب زندہ نہیں رہنا چاہتی اور اب زیادہ دن زندہ رہنے کی امید بھی نہیں ہے۔

سبھی کہتے ہیں مرنالی بہت ہی خوبصورت ہے، نازک ہے اور جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں تو میں جانتی ہوں خوش ہو اٹھتی ہوں، لیکن اب جب بھی کوئی تعریف پر اترا ... جانے کیوں مجھے اداس سا لگتا ہے۔ اور میں وہاں سے اٹھ کر کسی دوسری طرف چلی جاتی ہوں۔ ... ... آ کر اب ... ... کرتے ہیں خوب مزے میں ... سہیلیاں اکثر مجھ سے پوچھا کرتی ہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ... خفیف ہو جاتی ہوں مگر میرا من ہی ... رہتا ہے۔ کم سے کم آپ لوگوں کو اس بات سے اتفاق تو ہوگا ہی کہ لڑکیاں بھی اپنے سینے میں دل رکھتی ہیں۔ لیکن جب اسے چوٹ پہنچ جاتی ہے تو کیا ان کی آنکھوں میں نمی پیدا نہیں ہوتی ہوگی؟ پانی کا گھڑا زیادہ بھر جاتا ہے تو کیا ذرا سے

دھکے سے پانی چھلک نہیں پڑتا؟ بھرے ہوئے سمندر کو ہوا کی ذرا سی چھیڑ بھی چھلکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں ذرا بھی رو پڑیں تو آپ بھی ہنس پڑتے ہیں لیکن رو پڑنے کے سوا ان کے لئے کون سا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اشوک کے پتا جی، پونہ کے کسی اسکول میں مدرس ہیں۔ سبھی انھیں ماسٹر جی کہا کرتے ہیں۔ اشوک بھی تو اپنے بچپن ہی سے انھیں ماسٹر جی کہتا آیا ہے۔ میرے پتا جی ریلوے میں کلرک ہیں۔ ان کی پندرہ روپے کی نوکری اب کچھ اوپر پچھتر تک پہنچ گئی ہے۔ البتہ ماسٹر جی کی تنخواہ ان کی چالیس روپیوں کی نوکری اب چالیس پچاس تک پہنچ پائی ہے۔ دونوں ہی بچپن سے گہرے دوست رہے ہیں، دونوں کو تعلیمی شوق! ایک بار جمع ہو جاتے تو گھنٹوں بیت جاتے مگر کسی بات کا احساس تک نہیں رہتا تھا۔ انھیں کھانے کے لئے بار بار بلانا پڑتا تھا۔ دونوں کو تو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ ہمارے ابا اور ماسٹر جی ان دنوں کالج میں پڑھا کرتے تھے مگر نامساعد حالات کی بنا پر وہ بی۔ اے۔ پاس نہ کر سکے۔ ہمارے اور ماسٹر جی کے گھر میں کوئی زیادہ فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب بھی گھٹا بندھن کے دن میری ماں ماسٹر جی کو راکھی باندھے بنا نہیں رہتیں۔

اشوک ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے بعد ان کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہ پائی۔ اس لئے دونوں ہی اسے بہت چاہتے تھے۔ مگر لاڈ پیار سے بگڑ جانے کی ہمت بچے میں پیدا نہیں ہوئی۔ ماں کی آنکھوں میں تو ہر وقت آنسو چھلکا کرتے ہیں، اشوک کی ذہانت اور متواتر کامیابی کی وجہ سے کئی بار ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ ایک بار دیوالی کے موقع پر اسے ایک چھوٹا سا انعام ملا۔ اس وقت میں ماں کے ساتھ تھی۔ اس خوشی میں ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کا سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔ مگر آج ..... آج اشوک کوڑی کے مول کا نہیں۔ دنیا کی نظروں میں وہ ایک نیچ قسم کا انسان ہے۔ اس لئے کہ بے آبرو ہو کر کہیں فرار ہو چکا ہے۔ اور ان ساری باتوں کی ذمہ دار میں ہوں۔ میں ہی ابھاگن مرنالی!!!

ہمارے ابا کہا کرتے کہ ماسٹر جی کو بچپن ہی سے تعلیم کا شوق تھا۔ وہ نہایت ہی نیک اور اپنے اصولوں کے پابند انسان رہے ہیں۔ نئے لوگ انھیں سدھارک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غرض کہ نئے اور پرانے دونوں ہی قسم کے لوگوں میں ان کی خاص عزت تھی۔ ان کی صاف نیت اور تعلیم کی اٹوٹ لگن نے ان سے روپے پیسے کا موہ چھین لیا تھا۔ اس لئے اب تک وہ ابھی اس پرانی ہی حالت پر تھے۔ انھوں نے ہر مسئلہ پر گہرائی سے سوچنا سیکھا تھا۔ اشوک کی تعلیم کے مسئلہ میں بھی انھوں نے برابر پھونک پھونک کر قدم رکھا اور اشوک کو ہر کوئی اس کی صلاحیتوں کی بنا پر عزیز رکھتا۔ مگر آج وہ کہیں کھو گیا ہے، اس نے اپنے آپ کو چھپا لیا ہے تاکہ اس کے والدین کو لوگوں کے سامنے اپنا سر جھکا کر چلنے کی نوبت نہ آئے۔ اور اشوک کے بارے میں بھلا میں کیا کہہ سکوں گی، میری ہی وجہ سے تو آج وہ کہیں روپوش ہو گیا ہے ---!

بچپن میں ...... انہیں چاہئیے تھے وہ دن --- ان کم بخت یادوں نے ہی کہیں کا نہیں رکھا۔ لیکن یاد کئے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا۔ یادیں لمحہ بھر کی ہوتی ہے لیکن اس یاد کی کسک، جلن اور تپش تو زندگی بھر کے لئے ہے۔

کسی نہ کسی تعطیل میں اشوک ہمارے گھر آ ہی جاتا اور مسلسل چار پانچ دن تک رہتا۔ اس تمام عرصے میں میں پھولی نہ سماتی تھی۔ ہر بار میں اسے دو چار دن اور روک لینے کی بھر پور کوشش کرتی۔ وہ جب بھی دوبارہ آنے کا وعدہ کرتی۔ لیکن میں کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کیا کرتی لیکن اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ یہ بات یقیناً سچ ہے۔ بچپن کے اس پیار کو آپ غلط تو نہیں تصور کریں گے نا؟ اشوک جیسے مخلص، ملنسار اور ذہین لڑکے کے لئے اگر میں مچل بھی گئی تھی تو کیا اس میں میرا کوئی ذاتی قصور تھا؟

دوپہر کو ماں سو جاتی، میرا بھائی پڑوس کی بیو، میں اور اشوک طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے۔ مثلاً پانی کے کھیل میں ہم دلہا دلہن کو گھیر لیتے اور اشوک میرے قریب آکر پوچھتا۔ "مرنالی تم نے ٹکہ کیوں لے لیا ہے۔؟"

میں پوچھتی "یہ تم سے کس نے کہا؟"

"مجھے بیو نے بتلایا ہے"

پھر میں کھیل کے قاعدے کے مطابق بیو تائی کے قریب جاتی اور اس سے پوچھتی۔ "بیو تائی کیوں لیا ہے ٹکا تم نے؟"

"نہیں تو۔ یہ تم سے کس نے کہا؟"

"مجھے اشوک نے بتلایا ہے۔"

کبھی نہ ختم ہونے والا اور کسی بھی وقت ختم ہو جانے والا یہ کھیل برابر جاری رہتا۔ دو پیار کرنے والی ہستیاں دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر ایک گوشے میں آنے کی کوشش تو کرتی ہیں۔ مگر وقت کے بے رحم ہاتوں کسی ایک کو دوسرے سے دور ہونا ہی پڑتا ہے۔ جاتے وقت پاؤں کیسے بوجھل سے ہو جاتے ہیں۔ مگر ان ریشمی بندھنوں کو بے رکھنا ہی پڑتا ہے ورنہ یہ کھیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ پھر اشوک جب میرے قریب آکر وہی سوال کرتا تو میں اس کی شرٹ کے بٹن سے کھیلتے ہوئے کہہ اٹھتی "اشوک بس ہو چکا یہ کھیل! اب کوئی اور کھیل کھیلا جائے"۔

آج جب اُن باتوں کی یاد آتی ہے تو جی اور بے چین ہونے لگتا ہے آج صبح ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے بارہا سونے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہی بار بار وہی پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ نیشی نے اروِن سے مذاق کیا۔ اس لئے وہ دوسرے کونے میں جا کھڑا ہوا۔

"کیوں میرا چی نکا کیوں لیا تم نے؟"

"یہ تم سے کس نے کہا"

"پربھاکر نے"۔

اروِن نے نیشی کا نام نہیں لیا۔ پربھاکر کا نام لیا جس نے ٹکا دیا۔ اکر کا نام نہیں لیا جاتا۔ پیار کے کھیل میں کبھی واپس آنے کا کوئی نام نہیں۔ صرف متواتر پھیرے لگاتے رہنا چاہئے۔ بھگوان پربھاکر کے پاس وہ جا کھڑی ہوئی اور اس نے کہا "کیوں پربھاکر ٹکا کیوں لیا؟"

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"نچم نے"۔

اور بھگوان نچم کی طرف ٹکا پوچھنے کے لئے مڑ گئے!

پیار میں آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔ آج میں نے اپنے آنسوؤں سے ان سب کی پوجا کی۔ آج پورے دن میں میں کوئی کام نہیں کر پائی دن بھر یوں ہی نہ جانے کیا کیا یاد آتا رہا۔ اور آخر میں نے سوچا کیوں نہ کہیں سے کود کر اس زندگی کو ختم ہی کر دیا جائے تاکہ سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے اور ایک بار پھر اشوک کی یاد نے آ گھیرا کاش اس سے ایک بار ملاقات ہو جائے۔ اس سے ٹکا پانی کا کھیل پھر کھیلا جائے۔ آج مجھ سے اگر اتنی بڑی غلطی نہ ہوئی ہوتی تو کم از کم اشوک کے درشن تو ہوتے ہی رہتے۔

پیار کرنا یا پیار جتانا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ خصوصاً لڑکیوں کیلئے تو یہ کام بہت ہی آسان ہے۔ البتہ اس کا چھپانا بہت ہی مشکل ہے۔ لڑکی کو ماں باپ کا دھن کہا جاتا ہے ماں باپ اپنے اس دھن کے ساتھ کچھ اور دھن ملا کر دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں پر تو یہ لکشمی پروان چڑھتی ہے، پھلتی ہے، پھولتی ہے اور کہیں کہیں تو وہ گھر کے اندر چار دیواری میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ پھر کبھی سر اٹھانے کی مہلت تک نہیں ملتی۔ یہ لکشمی پہلے اپنے ارمانوں کا خون کرتی ہے۔ اور پھر دھیرے دھیرے اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے۔ دیکھنے والے! تو قسمت کو کوستے ہیں یا پھر سسرال کو۔ کیا جوان لڑکیاں اپنی عمر سہیلیوں کو اس طرح کوستی رہیں گی؟ کیا وہ مجھ سے کہہ سکیں گی کہ پیار کر کے تم نے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے؟ ساس ہمیشہ یہی کہا کرتی ہیں کہ پڑھی ہوئی لڑکیاں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ تو کیا غیر تعلیم یافتہ لڑکیاں کبھی پیار نہیں کیا کرتیں؟ سچ کہا جائے تو یہ پیدائشی مرض ہے۔ کسی کے کہنے سے یا نہ کہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟

"ہمارے گھر کی پچھلی طرف چھوٹا سا آنگن تھا اور آنگن میں پھولوں کا ایک درخت۔ ہم اکثر گرے ہوئے پھول اٹھا کر بالوں میں لگا لیا کرتے تھے۔ پوجا کے لئے ہار بناتے تھے۔ بھگوان کو کہاں فکر تھی ہمارے پھولوں کی؟ میں اکثر اشوک سے پوچھا کرتی "کیا میں پھول آپ کی نذر کر سکتی ہوں؟"

وہ ہنس پڑتا اور کہتا "کوئی ضرورت نہیں۔ ان پھولوں کو کون سنبھالتا پھرے گا؟ مجھے خوشبو کی جب بھی ضرورت محسوس ہوگی کیا میں تمہارے بالوں میں لگے ہوئے پھولوں کو نہیں سونگھ سکتا؟" پھر اشوک مجھ سے بہت ہی قریب آجاتا اور بالوں کو سونگھ کر کہتا۔ "مرنالی یہ خوشبو تمہارے بالوں ہی سے آرہی ہے یا ان پھولوں سے؟"

ہم نے ایک بار گڑیوں کا کھیل شروع کر دیا اس میں اس کی ہار ہوئی سزا کے طور پر اس سے ہم نے اس کی بیوی کا نام پوچھا مگر اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔ بولا "وقت آنے پر بتا دوں گا۔ لڑکی بھی اور سسرال بھی" میں نے اس سے کہا دیکھو اشوک بھولنا نہیں اس بات کو؟۔ ورنہ وقت آنے پر بھی......!"

مجھے یہ سبھی کچھ بار بار کیسے یاد آ رہا ہے۔ کیا اشوک گذری ہوئی باتوں کو یاد کرتا ہوگا! میرے بیاہ کے بعد اشوک سے کتنی ہی لڑکیوں نے شادی کی درخواست کی۔ مگر اس نے ان سبھوں کو یہی کہہ کر ٹال دیا کہ میں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اشوک کے اسکول کے زمانے میں اس کا ایک دوست تھا۔ اس کا نام رام بھاؤ تھا اور والد کا نام بھکم بھٹ۔ ان کی بچپن ہی میں ماں انتقال کر گئی تھی۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ وہ کبھی کبھار ہمارے یہاں آیا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے اشوک کا ذکر چھیڑا اور بات بتانے سے انکار کر دیا۔ اشوک کی بات تھی نا! اس لئے مجھے اس کے پیروں میں اپنا سر ٹیک رکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ آخر میں اس نے وہ بات کہہ دی، کاش وہ اسے نہ کہتی! اشوک سے بار بار اس کی آئندہ زندگی کے متعلق پوچھا جاتا، مگر وہ ہر بار ٹال ہی دیتا۔ آخر کار اس نے ایک روز کہہ ہی دیا "مجھے مزالی پسند ہے اور میں اس سے بیاہ کروں گا۔" اس کے ساتھی دن بھر اسے میرے تمہارے نام سے چڑھایا کرتے۔ اور وہ بے چارہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر جاتا۔ پڑھنے میں کافی ذہین تھا اور اکثر دوسروں کی مدد کرنے میں کوشاں نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے کہا "بس تم یوں ہی قصے گڑھا کرتی ہو اور میرے سر تھوپ دیتی ہو۔"

لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی بات لغو نہیں ہے۔

اس روز میں نے پھول ٹانکنے کے بجائے دیوی کے چرنوں میں رکھ دیئے اور اس خوشی میں پورا دن مست رہی، نہ کھا سکی نہ ہی سو سکی۔ ماں نے بار بار ڈانٹا مگر اس کے ڈانٹنے کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کاش اشوک سے صرف ایک بار ملاقات ہو جائے!

بہت دن بیت گئے۔ اشوک سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔

اس کی ملاقات میرے بیاہ کے موقع پر ہوئی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا! قسمت کو جو منظور تھا۔ جو ہونی تھی ہو کر رہی۔ اس واقعہ کو تین سال گذر گئے اور میرے بیاہ کا دن آگیا، سچ کہا جائے تو بیاہ کے موقع پر بھی میں چھوٹی ہی تھی، لیکن ہندو سماج بچپن کا سکھ حاصل کرنے کی کبھی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے یہاں لڑکیاں پہلے تو بہت ہی چھوٹی ہوتی ہیں۔ پھر بالکل ہی بڑی ہو جاتی ہیں۔ بیاہ کے لائق۔ میرا بھی یہی حال ہوا۔ ایک روز مجھ سے کہا گیا "اب تم بڑی ہو گئی ہو اور چھوٹے بچوں جیسی حرکتیں تمہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔" ان تین برسوں میں اشوک اپنے ماموں کے گھر میسور میں رہا۔ اس کے ماموں کو میسور میں کسی بیوپاری کے یہاں بڑی نوکری مل گئی تھی۔ اشوک نے جوں ہی فائنل پاس کر لیا۔ ماسٹر جی نے اسے ماموں کے سپرد کر دیا اور تاکید کی کہ اسے میسور میں ٹیکنیکل اسکولوں میں داخل کیا جائے۔ بھکم بھٹ پرلوک سدھار گئے اس لئے ان کے دونوں بچوں کو ایک بیٹا اور بیٹی کو ان کے چچا اپنے ساتھ لے گئے۔ رام بھاؤ کو کالج میں داخل کر دیا گیا اور اس کی چھوٹی بہن غالباً انگریزی کے چھٹے درجہ میں پڑھ رہی ہوگی لیکن اب تک اس کے بیاہ کی کہیں کوئی بات نہیں چل رہی تھی۔ اشوک نے تین سال میسور میں گذارے اور آخر کار انگلینڈ جانے سے قبل ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ تمام طلباء میں اول رہنے کے باوجود بھی وہ اپنی خراب صحت کی وجہ سے انگلینڈ نہیں جا سکا۔ اس نے طے کر لیا کہ صحت کے اچھے ہونے تک پونہ یا بمبئی کے کسی کالج میں داخلہ حاصل کر کے تعلیم جاری رکھے گا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میسور سے لوٹنے کے بعد اشوک سے وہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں پوجا میں مصروف تھی۔ ماسٹر جی اور ممانی دو روز پہلے ہی آ چکے تھے۔ البتہ اشوک نے یوں ہی کوئی حیلہ تراش کر دکن کالج میں اپنے دوست کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرا بیاہ پونہ میں ہوا۔ بیاہ کی رسم دھوم دھام سے منائی گئی۔ ان ہی دنوں ابا کی تنخواہ دو سو سے ساڑھے تین سو ہوئی تھی۔ بیاہ کے روز ہی وہ آ گیا اور دیو گھر[1] میں میرے قریب آ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی نہ جانے کیوں کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا۔ وہ کتنی دیر تک میری طرف دیکھتا رہ گیا۔ گھر میں سخت بھیڑ بھاڑ تھی۔ میرے دماغ میں تہلکہ اور عجیب خیالات کی قطاریں صف بستہ کھڑی تھیں۔ میں سمجھ رہی تھی اشوک کچھ نہ کچھ کہہ کر رہے گا۔ مگر وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اور پھر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے

---

[1] جہاں دیوی کی مورتی رکھی جاتی ہے اور وہ کمرہ صرف پوجا کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے۔

دیو گھر سے باہر نکل گیا۔ میں نے ماتی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر فوراً اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس روز مجھے پتہ چلا جنت اور جہنم میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے۔!

بچپن کی کبھی آشائیں پوری ہو جانا ممکن نہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ان میں ایک قسم کا جنون سا رہتا ہے اور ہوش کا دامن کبھی کبھار ہاتھ سے بھی نکل جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ اشوک نے بھی اسے بچپن کا کھیل سمجھ کر بھلا دیا ہو۔ مگر میں کیسے بھول سکتی ہوں! کاش میرا بیاہ اس سے ہو جاتا۔ لڑکیوں کو اس طرح سے کہنا بھی نہیں۔ کیونکہ کہتے ہیں اس طرح سے ان کی نیت میں فرق آ جاتا ہے۔

میری شادی ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ وہ کوئی انجینیر تھا نہ کوئی ڈاکٹر۔ دو ہزار روپوں کا "ہنڈ" دیا گیا۔ ان دنوں وہ دکن کالج میں تعلیم پا رہے تھے اور کیا چاہیئے تھا؟ پھر اشوک کے لئے یوں ہی اندر ہی اندر کڑھتے رہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اشوک تو محض ایک اسکول ماسٹر کا لڑکا تھا۔ بھلا وہ اتنا سبھی کچھ کہاں دے سکتا تھا؟ ہمارا گھر کاروباری ہونے کی وجہ سے دکشنا کی باتیں شائع ہوتیں یعنی میرے دل کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ لگتا تھا جیسے یہ پورا سنسار ایک چکی کی مانند ہے جس میں ہر چیز پیسی جا سکتی ہے۔ البتہ اتنا سچ ہے کہ اشوک اور اس کے والدین مجھے بہت زیادہ چاہتے تھے۔

شادی کو تین سال ہوگئے اور ان تین برسوں میں میں نے ہر ایک کو جان لیا اور ہر ایک نے مجھے۔ میری ماں اکثر کہا کرتی ہے کہ تم ہر بات کا اثر لیتی ہو۔ پتہ نہیں یہ بات کہاں تک سچ ہے؟ پر اتنا میں نے جان ضرور لیا تھا کہ زندگی میں سکھ کی تلاش میرے لئے بیکار تھی۔ بس درمیان میں اشوک بالکل ہی سنبھل گیا تھا اور آزادی سے ہر طرف گھومنے لگ گیا تھا۔ اگر میں پونہ رہتی تو وہ پونہ آکر رہ جاتا یا اگر میں سسرال میں رہتی تو وہ سسرال کبھی دو ایک روز کے لئے ضرور چلا آتا۔ میرے سکھ دکھ کا حال پوچھتا۔ البتہ میں نے کبھی بھی اس سے کھل کر بات نہیں کی۔ جب بھی میں اس کے بیاہ سے متعلق پوچھتی تو وہ ٹال جاتا۔ میں سوچتی خدا کرے اشوک سب کچھ بھول گیا ہو تاکہ کم از کم وہ آئندہ سکھ کی زندگی بتا سکے۔ البتہ مجھے وہ سب کچھ اپنی سسرال میں نہ مل سکا جس کی تمنا تھی اور جس کا ملنا نہایت ضروری تھا۔ وہ بہت ہی سیدھے سادے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ بہترین جوڑی ہے، وہ اکثر میری خوب صورتی کی تعریف کرتے رہتے اور میں سوچا کرتی غالباً ان کی چاہنے کی وجہ صرف میری خوبصورتی ہے۔ سچ کہا جائے تو پیار کا روپ بھی Skin-deep کی طرح ہے اور اس کا راز کبھی بھی نہ کھل سکے گا۔

یہ بات مجھے لکھنا نہیں چاہیئے تھی مگر مجبوری کے تحت بتانا مناسب سمجھتی ہوں اور وہ یہ کہ ہم دونوں کے دل کبھی نہ مل سکے۔ پتہ نہیں اس دنیا میں کتنوں کے دل مل جاتے ہوں گے؟

بابا نے ماسٹر جی کے پاس میرا ٹیوشن رکھ کر مجھے سنسکرت اور انگریزی کی تعلیم دی۔ سب مجھے تعلیم یافتہ ہی کہتے تھے حالانکہ یہ سلسلہ کبھی بال بودھ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ مجھ پر ہمیشہ طنز کئے جاتے کہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ہی میں اپنا دل میکے ہی میں چھوڑ آئی تھی۔

میرے چیچک نکل آئی لیکن گھر میں رہنے کے باوجود بھی انھوں نے کبھی میرے کمرے کا رُخ نہیں کیا۔ اسے میری بدقسمتی ہی کہئے کہ میں اس بیماری سے بھی بچ نکلی اور چیچک نے کوئی ایک بھی داغ میرے جسم پر نہیں چھوڑا۔ بائیں گال پہ ایک بہت ہی چھوٹا سا کالا داغ رہ گیا تھا مگر سبھی اسے دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ اس سے تمہاری خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

اس کے بعد ماموں کا پونہ سے تبادلہ ہوگیا اور انھیں بورڈنگ میں رہنا پڑا۔ میں سارا دن لے ماموں کے گھر یعنی سسرال آگئی۔ وہ انہونی سی بات ہو کر رہ گئی، اس کا ذکر تک کرنا بے کار ہے مگر اس کے لئے تو اشوک جیسے شخص کو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہونا پڑا۔ ہمارے پاپا زاد ماموں سے متعلق غالباً سبھی واقف تھے اور اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ ان کی نظر کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں سامنے کے نل پر کپڑے دھو رہی تھی۔ ماموں اخبار پڑھنے میں منہمک تھے کوئی دو بجے کا وقت ہوگا۔ ساس پڑوس کے گھر میں چلی گئی تھی سردی کے دن باہر دھوپ بالکل ہی صاف تھی صبح ہی میں نے اشنان کیا تھا۔ میرے بال کھلے کر ٹنگ لٹک رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے

وقت میں کچھ نہ کچھ تو یاد آ ہی جاتا ہے۔ مجھے یکایک اشوک کی یاد آ گئی۔ نہ جانے کیا کر رہا ہوگا اس وقت! کافی وقت گذر گیا۔ میں کپڑے دھوئے اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ اسی وقت ماموں کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ انکی آواز قدرے کانپ رہی تھی۔ "ذرا پانی تو لاؤ۔"

میں نے لوٹا بھر کر ان کے پاس ہی رکھا اور جوں ہی جانے کے لئے

مڑی انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور انھوں نے مجھ سے وہ طلب کیا جس کی مجھے ان سے کبھی اُمید نہیں تھی۔ میں گھبراہٹ کے مارے چیخ پڑی۔ اور اپنا ہاتھ چھڑا کر پڑوس کے اس گھر میں داخل ہو گئی جہاں میری ساس بیٹھی ہوئی تھیں میں اُن سے کچھ اور نہیں کہہ سکی صرف اس کے سوا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میں اکیلے میں گھبرا گئی تھی۔ آدمی اکیلے پن سے گھبراتا ہے رات کے اندھیرے سے گھبراتا ہے لیکن اسے سب سے زیادہ گھبراہٹ اور خوف تو ان آدمی نما کُتوں سے ہی ہوتا۔

میں ساس کے ساتھ گھر چلی آئی، پورا گھر کھلا پڑا تھا، ماما جی کہیں باہر چلے گئے تھے۔ میں نے اُسی وقت اپنی ماں کو کہہ دیا کہ وہ اگر مجھے اس گھر میں رکھیں گی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔

اس کے تیسرے ہی روز آپا مجھے ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے گھر لے گئے۔ اس بات کا ذکر میں نے اُن سے اور اپنی ماں سے کیا۔ باقی لوگوں نے اتنا ضرور جان لیا ہو نہ ہو کوئی بات ضرور ہو کر رہ گئی ہے البتہ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی جان نہ سکے۔

اس کے بعد میں نے ستارا کا رخ کبھی نہیں کیا۔ انھوں نے بھی اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر تم اسے ستارا بھیج دو گے تو پھر کبھی میں اس کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ میں کبھی کبھار تھانہ جایا کرتی البتہ زیادہ تر ماں ہی کے ساتھ رہتی۔ ان دنوں پونہ میں انٹر کے امتحان کی تیاریاں جاری تھیں۔ اشوک چھٹیوں میں کھڑکی آ کر رہا کرتا تھا۔ وہ دن میرے بہت ہی اچھے گذرے تھے۔ اس بار تو وہ پورے بیس دن رہا ———— اور یہ پورے بیس دن میرے لیے سکھ کا ساگر ٹھہرے۔ مگر اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا ہماری کہانی کا وہ آخری موڑ تھا۔ اب صرف میں رہ گئی ہوں البتہ یہ "میں" صرف بجھی ہوئی شمع کی نشانی ہے۔ ہمارے کھڑکی کے گھر میں جگہ کی قدرے تنگی ہے۔

[illegible]

سرے پر میں اور میرا بھائی سویا کرتے تھے۔ تو دوسرے پر اشوک کئی دن یوں ہی گذر گئے۔ ایک روز میرے بھائی نے اشوک کے قریب ہی سونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی مطابق نوکر نے بستر لگا دیا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اشوک نہ جانے کیوں پریشان تھا؟ وہ اپنی پریشانی کو دور کرنے کے لئے باہر چاندنی میں جا بیٹھا میں بھی سوچتے سوچتے ہی سو گئی اور دیے کے بجھنے تک کی خبر مجھے نہ ہو سکی۔

آدھی رات کو یکایک میں جاگ پڑی۔ اشوک دھیرے دھیرے میرے جسم پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مجھے ماما جی کا یکایک خیال آ گیا میں پسینے سے شرابور ہو گئی اور یکایک ڈر کے مارے چیخ پڑی کیا اشوک اس قدر نیچ ہو سکتا ہے؟ ماما جی کے ساتھ اگر وہ حادثہ پیش نہ آتا تو غالباً میں کچھ نہ کہتی۔ مگر دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میرے چیخ پڑتے ہی سارے لوگ دیوان خانے میں جمع ہو گئے۔ اشوک میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سبھی لوگوں کو نزدیک دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں رو پڑی جو کچھ لوگوں کو سمجھنا چاہئے تھا سبھی سمجھ گئے تھے آپا نے اسی وقت اشوک سے کہا: "صبح سے قبل ہی تم یہاں سے چلے جاؤ۔" اشوک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماں مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔

اور اشوک صبح ہونے سے قبل ہی نہ جانے کب گھر سے نکل گیا!

سبھی لوگوں نے یہ کوشش کی کہ بات گھر سے باہر تک نہ جائے مگر یہ ماما جی اور ماسٹر جی تک پہنچ ہی گئی۔ ماسٹر جی آپا کے پاس آ گئے۔ انھوں نے پوری واردات کہہ سنائی۔ ماسٹر جی کی آنکھیں مسلسل بہتی رہیں اشوک گھر سے فرار ہو گیا۔ اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ بات گاؤں گاؤں پھیل گئی سسرال سے لے جانے کے لئے اب تک کوئی نہیں آیا اب میں صرف چند دنوں کی مہمان ہوں عنقریب پرلوک سدھار دوں گی

پورے ایک ماہ کے بعد شام کا وقت تھا سات بج رہے ہوں گے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ میں اکیلی دروازے میں کھڑی نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی کہ ایک بھکاری سامنے آ کھڑا ہوا۔ "مرنالی" میں نے اشوک کی آواز فوراً پہچان لی۔ "پچھلے سات دنوں سے میں تم سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں اور آج یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔ دنیا کے

[illegible]

پھوٹ کر رونے لگا۔ جس اشوک کے خلاف کوئی اپنی زبان تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ آج سارے ہی اسے اپنی نظروں سے گرا چکے تھے۔

"اشوک تم نیچ نہیں ہو! میں ہی ابھاگن ہوں۔ میں آج خود ہی اپنی نظروں سے گر چکی ہوں!"

"مرنالی اس رات میں بری طرح بے چین تھا۔ طرح طرح کے خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ دیا کب کا بجھ چکا تھا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں میرے من میں کوئی پاپ نہیں تھا۔ تمہارے لئے کوئی برا وچار نہیں تھا۔ دنیا کی نظروں سے تو بالکل ہی گر چکا ہوں لیکن مرنالی تم اپنی نظروں سے نہیں گرانا۔ خدا کے لئے اتنا ظلم مجھ پر نہ کرو۔ بچپن ہی سے میں تمہاری پوجا کرتا آیا ہوں لیکن قسمت میں کچھ اور ہی تھا۔ اگر میں گنہ گار ہوتا تو یقین کرو کب کا اپنی زندگی ختم کر چکا ہوتا مگر اب زندہ رہ کر مر رہا ہوں کم از کم تم مجھے پاپی نہ سمجھو۔ اور ہاں خدا کے لئے تم مجھے بھول جاؤ"

اس کے بعد اس نے اپنا سر نیچا کر دیا۔ میرے گھر کی چوکھٹ کو پرنام کیا۔ اور دور ہوتا چلا گیا۔

میں نے آواز دی اور کہا "رک جاؤ اشوک"، لیکن اشوک نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ اور آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور میرے دل میں طوفان آ گیا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی اور ہم آج ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے کبھی نہ ملنے کے لئے۔ ہمیشہ کے لئے [illegible] بجلی چمک رہی تھی۔ اسے میرے دکھوں سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔

اب کیا بچا ہے کبھی کچھ ہو گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ بھی ہو چکا۔ اشوک تو سمجھ رہا ہوگا میں کتنی کٹھور ہوں۔ کاش اسے صرف ایک بار ہی میرے جذبات اور خیالات کا پتہ لگ جائے۔ میں روز ہی روتی ہوں اور اشوک کی ماں بھی اور ماسٹر جی بھی۔۔ اب میں بالکل ہی کٹھور ہو جاؤں گی۔ بالکل سخت۔ اتنی سخت کہ مجھ میں زندگی کی نرمی کا پھر کبھی احساس تک نہیں ہوگا۔ یہ سب کچھ میں نے صرف اشوک کے لئے لکھا ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں، کسی اور پڑھنے والے کے لئے۔ اشوک کی قسم دے رکھی ہے میں نے۔"

- - - - - - - - - - -

مرنالی کی بیماری کے دنوں میں یہ مسودہ میرے ہاتھ لگا۔ اس کی قسم مجھ پر لاگو نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے میں قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ اور قارئین کا الزام اپنے سر لینے کے لئے تیار ہوں۔ زندگی کی سب سے پیاری چیز یعنی مرنالی اب نہیں ہے صرف اس کی یہ کہانی ہی میرے پاس بچی ہوئی ہے۔ اور اس کہانی کو میں اس لئے شائع کر رہا ہوں کہ کبھی تو یہ کہانی اشوک کی نظروں سے گذرے گی تو اسے مرنالی کے خیالات اور جذبات کا اندازہ ہو سکے گا۔ اشوک میرا دوست تھا اور یقیناً وہ ایک دیو دوت تھا۔ اس کہانی کو اس نے کوئی عنوان نہیں دے رکھا تھا، اس لئے میں نے اسے "مرنالی کی کہانی" کے نام سے آپ لوگوں کے سامنے رکھا ہے ــــــــ

مرنالی ہر وقت مجھے یاد آتی ہے اور جس قدر میں اسے یاد کرتا ہوں اشوک بھی کوئی اور اسے [illegible] تو یاد کرتا ہوگا اور جب بھی مجھے اس کی یاد آتی ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں مجھ جیسا بدنصیب آدمی کوئی نہیں ہے۔

یشونت گوپال جوشی

سامنے دیکھنے والی لڑکی

کوئی چھ ماہ قبل کی بات ہے ۔ بارش کے دن تھے ۔ رات بھر خوب مینہ برسا تھا ۔ مگر اس وقت چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی ، جس میں تمازت بھی تھی اور تازگی بھی ۔ نجانے کیوں کئی بھیگے راستوں میں عجیب سی کشش پیدا ہو گئی تھی ۔ دھلے دھلے راستے کچھ اور صاف ہو گئے تھے ۔

میں یوں ہی بے سوچے سمجھے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا ۔ یکایک میری نظر سڑک کے بیچوں بیچ جا کر ٹھہر گئی ۔ وہ سیدھی میری طرف آ رہی تھی ، کچھ انیس بیس کا سن ، سانولا جسم ، بڑی بڑی آنکھیں بالکل اپنی سیدھ میں دیکھتی ہوئی ۔ جب وہ میرے قریب سے ہو کر آگے نکل گئی تو میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا کہ وہ کس طرف دیکھ رہی ہے ۔ مگر وہ کسی طرف نہیں دیکھ رہی تھی ۔ سامنے بالکل سامنے ، نہ اِس طرف نہ اُس طرف ، ٹکٹکی باندھے ، جیسے اس کی نظریں بالکل سیدھی لکیر پر پڑ رہی ہوں ۔ وہ اسی وقت کرانے کی ایک دوکان میں داخل ہو گئی ۔ اُس نے کچھ سامان خریدا اور اپنا راستہ لیا ۔ نہ جانے کیوں ، اس دن سے میرے دماغ کے ایک کونے میں محفوظ ہو گئی ہے اور ہمیشہ اپنی اسی ایک حالت میں پائی جاتی ہے اپنی سیدھ میں دیکھتی ہوئی ۔ اس روز سے جب بھی وہ مجھے نظر آتی ہیں اسے دیکھنے میں محو ہو جاتا ۔ نجانے کیوں ؟ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب اس راز کو جان کر ہی رہوں گا کہ وہ ہمیشہ اسی ایک حالت میں کیوں پائی جاتی ہے ؟ اپنی سیدھ میں دیکھتی ہوئی ۔ اس روز سے جب بھی وہ مجھے نظر آتی ہیں اسے دیکھنے میں محو ہو جاتا ۔ نجانے کیوں ؟ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب اس راز کو جان کر ہی رہوں گا کہ وہ ہمیشہ اسی ایک حالت میں کیوں پائی جاتی ہے ۔ وہ ہمیشہ سامنے ہی کیوں دیکھا کرتی ہے ؟

سانولے رنگ کا وہ جوان جس کی عمر قریباً تیس سال کے لگ بھگ ہوگی ، میرے قریب سے گذرتا ہوا اس کے گھر میں داخل ہو گیا ۔ اس نے میرا سرتاپا جائزہ لیا تھا لیکن وہ بالکل خاموش تھا ۔ اسی وقت میرے ساتھی نے کہا ۔ " ہمارے محلے کا یہی ایک عجیب جھونپڑا ہے کیا تم نے کبھی اس کی بیوی کو نہیں دیکھا ۔ ؟ "

" بہت ہی خوبصورت ہے کیا ۔ ؟ " میں نے پوچھا ۔

" نہیں بالکل نہیں ۔ یہ کم بخت چھٹا ہوا بدمعاش ہے اور اس کی بیوی بہت ہی سیدھی ! بالکل معصوم ۔ ہمیشہ اپنی ہی سیدھ میں دیکھتی ہوئی پائی جاتی ہے ۔ اندھیرے میں چھوٹے بچے دیکھتے ہیں تو ڈر کے مارے دبک جاتے ہیں ۔ " میں نے تعجب خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا ۔

" مگر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ؟ "

میں نے کہا ۔ " کیا میں اسے اس وقت دیکھ سکوں گا ؟ "

" چلو دیکھ لیتے ہیں اگر وہ باہر ہوگی تو یقیناً ہم اُسے دیکھ لیں گے "

ہم نے اپنا رخ اس احاطے کی طرف کر دیا جس میں وہ عجیب قسم کی جھونپڑی تھی ۔ اور جھونپڑی کے دروازے پر وہی لڑکی ! اپنی سیدھ میں دیکھنے والی !! اس وقت بھی وہ بالکل اپنے سامنے دیکھ رہی تھی ۔ !

" اور بھی کچھ بتا سکو گے تم اس عورت کے متعلق ؟ " میں نے اپنے دوست سے دریافت کیا ۔

" سنتا ہوں اس کا شوہر کہیں پینتیس روپے پر نوکر ہے ۔ تنخواہ کے روز صرف بارہ روپے اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے گھر خرچ کے لئے گھر کا کرایہ بھی اس میں سے ہی ادا کیا جاتا ہے ۔ گھر میں جتنا بھی سامان ہے اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے ہو سکتی ہے ۔ ایک ہی ڈبہ ہے

جس میں پانی بھرا جاتا ہے، وہ گرم کیا جاتا ہے گھر کا سارا خرچ اس کی بیوی اس بارہ روپئے میں ہی پورا کرتی ہے۔۔۔!

ایک روز میرے پتا جی نے پوچھا تھا: "سکھو! تمھارے شوہر کو پینتیس روپئے ملتے ہیں نا۔۔۔؟" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"پھر تم دونوں کی زندگی میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کیا ایک جوڑے کے لئے اتنے روپئے کافی نہیں ہیں؟" اس نے دھیرے سے جواب دیا "وہ میرے ہاتھوں میں صرف بارہ روپئے تھما دیتے ہیں۔"

"اور باقی روپئے؟" میرے پتا جی نے پوچھا

"وہ اپنے پاس رکھتے ہیں اپنے ذاتی خرچ کے لئے!"

"کیا کوئی لت ہے انھیں؟ شراب یا پھر کوئی ایسی ہی چیز۔۔۔؟"

"کیا صرف ان چیزوں پر وہ اتنے روپئے خرچ کر دیتے ہیں۔؟"

"وہ کہتے ہیں کہ میں ذرا کفایت شعار ہوں اس لئے نپٹ لیتا ہوں ورنہ ان روپوں میں بھی بہت مشکل ہے۔ ویسے انھیں کسی بری چیز کی عادت نہیں ہے۔"

میرے پتا جی مسکرائے اور انھوں نے کہا "وہ کہتے ہیں، تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے!" ان کے اس جملے سے طنز جھلکتا تھا۔ مگر اس نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کے عادات و اطوار کیسے ہیں؟ مزاج کیسا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ نہ وہ کسی سے بات کرنا پسند کرتی ہے اور نہ ہی محلے بھر میں کوئی ایسا ہوگا جو اس سے بات کرنا پسند کرتا ہو۔ صبح شام یا دوپہر کوئی بھی وقت ہو اگر اسے گھر میں کوئی کام نہیں ہے تو وہ سوتی ہوئی پائی جاتی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہوگا کہ اس کی آنکھوں پر نیند کے اتنے گہرے سائے کیوں ہیں؟ کبھی کبھار وہ اپنے شوہر کے سگار کے خالی ڈبے جمع کرتی ہے اور اس کا ہار تیار کرکے اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے یا پھر ان خالی ڈبوں سے ریل گاڑی بناتی ہے اور پورے گھر میں چھک چھک کرتی پھرتی ہے۔ ویسے وہ جوان ہے مگر ذہن سے ابھی تک بچپن چپکا ہوا ہے۔

اسے اتنا بھی یاد نہیں کہ اس کے والدین کب اس دنیا سے چل بسے۔ اس کے ایک دور کے رشتہ دار نے اسے پالا پوسا۔ اب سے کوئی چار سال قبل اس کا بیاہ ہو گیا۔ بیاہ کے دن تک اس کا وہ رشتہ دار نہیں رہا۔ اب کہیں نہیں ہے۔ اگر وہ ہوتا تو یقیناً اس سے ملنے آتا۔ نہ وہ آتا ہے اور نہ ہی کبھی اسے اپنے اس رشتہ دار کی یاد آتی ہے۔

یہ دونوں میاں بیوی کبھی آپس میں باتیں کرتے دکھائی نہیں دیتے شوہر تو اکثر گھر سے باہر ہی رہتا ہے۔ البتہ اسے ہر صبح کھانا کھاتے وقت کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ شام کو بھی بھولے سے کبھی کھانے آ جاتا ہے۔ اکثر اس کے آنے سے پیشتر ہی اس کی بیوی کھانا کھا چکی ہوتی ہے۔ اس کے شوہر کے بے شمار دوست ہیں۔ مگر ان میں سے ایک بھی دوست کبھی اس کے گھر نہیں آیا۔ اس کی جھونپڑی ایک عجوبہ ہے، اس کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی اور سب کے لئے۔!

نہ جانے کیوں میں مسکرا پڑا اس وقت مجھے محسوس ہوا پانی کے اندر رہنے والا جو غلطی سے خالی تھیلی میں بند ہو گیا ہو اور جو اس خالی تھیلی سمیت گھر کے کونے کھدرے میں گھومتا پھر رہا ہو۔ انجانے پن میں بنا سوچے سمجھے بغیر جانے بوجھے بے کل ہو کر در در گھومتا جائے اور گھومتے گھومتے تھک ہار کر اپنے حواس کھو بیٹھے۔ کہیں ایسی حالت تو نہیں ہوئی اس عورت کی؟ کیا وہ بھی اب اپنے ہوش و حواس کھونے تک اس بند کمرے میں یوں ہی گھوم رہی ہو!" ہو سکتا ہے ڈر اور خوف کے سبب اس نے اپنے لئے سارے دروازے بند کر لئے ہوں اور صرف زندگی کے دن پورے کر رہی ہو۔۔۔ -

سمندر میں طوفان آتے ہیں ندی میں سیلاب آتا ہے بڑے زور شور کے ساتھ اور ساحل پر اپنا سر پٹخ کر لوٹ جاتا ہے۔ لیکن ساحل پر واقع گڑھا پانی سے بھر جاتا ہے اور پھر وہ پانی واپس نہیں لوٹتا۔ ہاں اس گڑھے میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ سمندر سے دور ہو جاتا ہے۔ پھر اس پانی کو دھوپ کھاتی ہے یا آنے جانے والے لوگ اسے روند دیتے ہیں۔ اس کے سوا اس کے لئے اور کون سا راستہ بچا ہے؟ اب وہ اپنے بہاؤ کے ساتھ واپس تو نہیں جا سکتا۔۔۔۔؟ بالکل اسی طرح ایسے کئی لوگ زندگی کے اس بہتے ہوئے دھارے سے الگ ہو کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ اور پھر خاموشی کے سوا ان کے لئے کوئی راستہ نہیں رہتا۔ پھر انھیں کسی ایک چیز کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے اس لڑکی کے سامنے دیکھنے کی وجہ یہی ہو۔۔۔۔۔؟

اندھے کے کان تیز ہوتے ہیں۔ بہرے کی آنکھیں۔ ایک کی کمی دوسرے سے پوری نہیں ہوتی مگر کسی ایک میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ کسی ایک کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ کچھ کر نہیں سکتے۔ کوئی کام نہیں نہ کوئی اپنی باتیں سنتا ہے

ورنا ناپسند کرتی ہے۔ جانے کے لئے تو دنیا نہیں، رہنے کے لئے کوئی کام نہیں
پھر صرف چھوڑ دو، ان تیز دھار کی طرف [illegible] دیکھا جائے تو کس
طرف نظریں دوڑائی جائیں۔؟

اس لمحہ ایک بار پھر میرے دوست نے مخاطب ہو کر کہا۔ ایک
[illegible]

"کون سی بات" بے اختیار میں پوچھ بیٹھا۔

"دنیا کی ساری چیزوں کی قیمتیں [illegible] اگر قیمت
پوچھنے پر وہ سو روپے بتا دیتی ہے۔ چونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کی
ساری زندگی بھر اسے نصیب نہیں ہوگی۔ اس لئے وہ کسی بھی چیز کی قیمت
سو گنا زائد بتا دیتی ہے۔ البتہ مرتی۔ چادر، بلاؤز جیسی چیزوں میں [illegible]
ایک دو پیسے کم [illegible] کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ میں خاموشی سے
سنتا رہا۔ اور نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ ایسی کئی باتیں اب دیکھے کیسے
گھاؤ ہیں۔ مگر یہ گھاؤ سبھوں کو دکھائے نہیں جاتے۔ یہ ہر کوئی انھیں دیکھ
کیسے سکتا ہے۔؟ سمجھ کیسے سکتا ہے۔؟

اس کے چار روز بعد پھر وہ مجھے اس سڑک پر دکھائی دی۔ میری
طرف آرہی تھی۔ بالکل سامنے دیکھتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ دیکھ رہا تھا سر تا پا اس کا
جائزہ لے رہا تھا۔ میری ان نظروں میں تعجب کے ساتھ ساتھ ہمدردی کی جھلکیاں
بھی موجود تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اپنی سیدھ میں دیکھتی ہوئی کہہ
اٹھی۔ تمہارا ہے ہی کون۔ کوئی ماں نہیں، بہن نہیں، بیوی نہیں ۔۔۔
"اس طرح ہمیشہ میری طرف کیوں دیکھا کرتے ہو۔؟ شرم بھی نہیں آتی تمہیں!"
اتنا کہنے کے بعد وہ تیزی سے اپنے جھونپڑے کے احاطہ کی طرف مڑ گئی۔
بس سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف اتنا ہی سمجھنا باقی تھا۔ وہ بھی پورا ہو گیا۔
اور مجھے معلوم ہوا کہ ہتھیلی میں اچانک بند ہونے والے چوٹ کے دانت
بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ دانت بہت ہی تیز ہوتے ہیں۔ چونکہ آدمی جب
اپنی ایک حس کھو دیتا ہے تو دوسری میں کئی گنا زائد قوت آجاتی ہے!

وی۔ سی کھانڈیکر

سرد ہوا

گھنٹیوں کی آواز گونج اٹھی۔ ایک، دو، تین، چار ۔۔۔۔

گیارہ گھنٹے بج چکنے کے بعد ونت راؤ نے اپنے آپ سے کہا "بس! پتہ نہیں اس چوکیدار سے انھیں کون سا حساب لینا تھا!" پھر بھی اس نے ایک اور ضرب لگا ہی دی۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ بہرصورت ۱۲ بجے تک سارا کام ختم کر دینا ہے مگر خدا کی طرح وقت بتلانے والی یہ گھڑی بھی انسان کی پروا کبھی نہیں کرتی۔ ونت راؤ نے دونوں میز پر دیکھا۔ ایک پر وہ فائلیں پڑی ہوئی تھیں جن کا کام پورا ہو چکا تھا، اور دوسرے پر وہ جنھیں ابھی پورا کرنا باقی تھا۔ دونوں ہی برابر تھے جیسے جڑواں بھائی ہوں۔

انھوں نے لوٹے میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور غٹ غٹ پی گئے۔ مگر اس سے ان کی پیاس میں کمی نہیں ہوئی۔ لگتا تھا بھری دوپہر میں اسٹیشن سے پانی لاکر اس لوٹے میں رکھ دیا گیا ہو۔ ٹھنڈا پانی پینا بھی ایک قسم کا نشہ ہے۔ جب تک آدمی اپنی عادت کے مطابق ٹھنڈا پانی نہ پی لے اسے کسی طرح کا چین نصیب نہیں ہوتا۔ ونت راؤ دل ہی دل میں اپنی بیوی کو کوسنے لگے۔ ٹیبل پر پڑی ہوئی فائلوں کی طرف دیکھ کر انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔ "ہماری تکلیفوں کا اندازہ تو ان کو کبھی نہیں ہوتا۔ تم جیسی بے جان چیز تک کو ہم اپنی گردن اور کاندھے پر لئے پھرتے ہیں۔ مگر یہ عورتیں ۔۔۔ ؟ انھیں تو بس اسی قدر معلومات ہوتی ہیں کہ بازار میں کون کون سی نئی ساڑیاں آگئی ہیں۔ اور اس معاملے میں ان کا حافظہ دوکانداروں سے بھی زیادہ کام کرتا ہے۔ مگر ہمیں ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کا انھیں کبھی احساس ہی نہیں رہتا۔ اگر وہ اس کے چاروں طرف ایک گیلا کپڑا ہی رکھ دیتی تو ۔۔۔۔۔"

ونت راؤ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ سڑک پر تیز رفتار سے گزرتے ہوئے اڑنے والے پتوں کی طرف دیکھ کر انھوں نے پھر اپنے آپ سے کہا "یہ آخری تاریخ ہے۔ ... کے مہینے میں نہ تہوار ... ہے یہ کوئی جھوٹ نہیں، دن بھر دفتر میں کام کرو اور شام کو پھر گھر آتے فائلیں لئے بیٹھے رہو۔" سامنے والے گھر کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ "کیوں ونت راؤ! نیند نہیں آئی کیا؟" انھوں نے جواب دیا "میں تو سو ہی سکتا ہوں مگر وہ کچہری والا صاحب خواہ مخواہ بھی آکر مجھ سے ہی پوچھے گا 'کیوں ونت راؤ! کام پورا ہو گیا؟' ... کھینچ کھینچ کر کام نہیں ختم ہوتا۔" البتہ انھوں نے یہ جواب نہیں دیا۔ پوچھا "کیوں دادا! کیسے ہو!" کچھ نہ کچھ تو انھیں پوچھنا ہی تھا۔

"... گرمی کا بہت زور ہے۔ ابھی نیند نہیں آتی۔ ... کیوں بند ... ہے؟"

"ہو سکتا ہے ہڑتال ... ہو گی" کہہ کر ونت راؤ زور زور سے ہنسنے لگے۔ "صرف ہم کلرک ہی ہڑتال پر نہیں جا سکتے باقی سبھی لوگ سبھی ساہوکار ....!"

ونت راؤ ... اپنے ٹیبل کی طرف آ گئے۔ باہر سرد ہوا کا نام نہیں۔ گھر میں ٹھنڈا پانی نہیں۔ مزدور ہڑتال پر جا سکتے ہیں اور جس وقت چاہیں استعفیٰ دے سکتے ہیں مگر کچہری میں کام کرنے والے کلرکوں کو ہڑتال کرنے کا کوئی ادھیکار نہیں اور شادی شدہ مردوں میں استعفیٰ دینے کی ہمت نہیں۔ دوسرے گھر سے لڑکے کے رونے کی آواز آئی۔ ونت راؤ نے سوچا ہو سکتا ہے اس نے ایک آدھ ہاتھ پیر دبا دیا ہو۔ ابھی دو گھنٹے بعد ... چاہئے۔ اس میں رونے کی آواز کس لئے؟ شادی ہو ...

ویسے تو زندگی میں مزے ہی مزے ہیں لیکن شادی کے فوراً بعد زندگی کی اصل حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس میں بھی کبھی کبھار ٹھنڈی ہوا ضرور آتی ہے، مگر زیادہ بارش کی وجہ سے بھی تو پسینہ آتا ہے۔

دو بجے کے بعد انھوں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور کھڑکی کے نزدیک جا کر کھڑے ہو گئے تاکہ کچھ تو ہوا کا اثر ہو، مگر ابھی تک ہوا بند تھی۔ دامو آنا سامنے کھڑکی میں کھڑے تھے۔

"کیوں دامو آنا؟"

"کیا کیا جائے بھئی۔۔؟"

جیسے دو پرانے پیڑ ایک دوسرے کی عمر کا پتہ لگا رہے ہوں۔

اس کے بعد وسنت راؤ بستر پر دراز ہو گئے۔ تھکا ہوا جسم تو سو گیا مگر دماغ اس حالت میں بھی دفتر کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دفتر کا صاحب بار بار کام پورا نہ ہونے کی وجہ سے پھٹکار رہا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا جیسے وہ فائلوں کے انبار میں دب گئے ہوں۔ آخری خواب تو اس سے بھی بھیانک تھا۔

یکایک گھر کی فضا بدل گئی، اور اس نے جیل کا روپ اختیار کر لیا اور ہاتھ کی گھڑی کی جگہ بیڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ وارڈر کی طرف انھوں نے مڑ کر دیکھا وارڈر کے فرائض ان کی بیوی ہی انجام دے رہی تھی۔ نیند کی خرابی اور بے چینی کی وجہ سے ان کی آنکھ آٹھ بجے ہی کھل گئی تھی اور وہ معمول کے مطابق دامو آنا کے گھر اخبار پڑھنے چلے گئے۔ راجکوٹ کے مسئلے پر مہاتما گاندھی نے برت رکھنے کا اعلان کر دیا تھا، یہ پڑھتے ہی ان کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ چونکہ انھیں مہاتما گاندھی سے بہت عقیدت تھی۔ ڈانڈی کے سفر کی ایک تصویر انھوں نے کمرے میں لٹکا رکھی تھی۔ دینو ہمیشہ اس تصویر کی طرف دیکھ کر "دادا جان" کہا کرتا تھا۔ اس بات سے سبھی واقف تھے اور دامو آنا تو خصوصاً اس کا ذکر کرنا قابلِ فخر سمجھا کرتے تھے۔

راج کوٹ کے سیاسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے بہت سا وقت گذر گیا۔ انھوں نے گھر آتے ہی اشنان کیا۔ اور کھانا کھانے کے لئے آکر براجمان ہو گئے۔ چاول زیادہ دیکھ کر انھوں نے کہا۔ "کم کر دو تھوڑا سا۔"

"کیوں آج روٹی پکائی نہیں گئی۔۔۔"

وسنت راؤ نے گہری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "برتن میں چاول بھی تو کم ہی نظر آ رہے ہیں۔"

"کھانا اکیلے ہی کا پکایا گیا ہے۔"

"تو پھر کس کے لئے۔۔۔؟"

"ہش! آج تو منگل وار ہے۔"

"صرف منگل ہی کیوں عورتوں کو تو سبھی وار کے اپواس رکھنے ضروری ہیں۔۔۔"

"کیوں؟"

"گھر بیٹھے بیٹھے کھانا کیسے ہضم ہوگا۔"

آج روٹی نہیں پکائی گئی، اس لئے آج یوں ہی طنز کئے جا رہے ہیں، اس بات کا اسے اندازہ ہو گیا تھا، اسی لئے وہ خاموش رہی۔ وسنت راؤ نے گھر سے باہر قدم رکھا، البتہ وہ من ہی من میں اپنی بیوی کو کوس رہے تھے۔ چاول سے زیادہ مجھے روٹیاں بھاتی ہیں اس بات کا اسے پتہ ہونے کے باوجود بھی اس نے آج چاول ہی پکائے، ہاں بھئی، پیار کے رنگ جتنے بھڑکدار ہوتے ہیں اتنے ہی کچے بھی ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد دو برس تک یہی بیوی میرے چاروں طرف بھونرے کی مانند گھوما کرتی تھی اور اب اسے میرے دکھوں اور سکھوں کی پرواہ تک نہیں۔ ان دنوں میں پان کا بیڑا تک نہیں چھوتا تھا، مگر وہ زبردستی بنا کر دے دیتی تھی، اور اب میں نے پیٹ بھر کھانا کھایا یا نہیں اس تک کی اسے پرواہ نہیں۔۔۔ بیوی یعنی پاؤں کی۔۔۔۔۔۔! لیکن میں بی اے پاس ہوں نہیں تو ضرور جملہ پورا کر دیتا۔

راستے سے گذرتے ہوئے اخبار بیچنے والے چھوکروں کی آوازیں اُن کے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ اور بار بار گاندھی جی کی ستیہ گرہ کی یاد دلاتی رہیں مگر بیوی نے روٹیاں بند کر دی تھیں اس کے سامنے یہ خبر اب کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

شام کے چھ بجے وہ کچہری سے باہر آ گئے۔ دھوپ میں تیزی تو نہیں تھی، پھر بھی ان کا پارہ برابر چڑھا ہی تھا۔ کام پورا کرنے کے باوجود بھی صاحب نے اس میں غلطیاں نکال کر رکھ دی تھیں۔ گھر کے سامنے ہی ان کے دو دوست مل گئے، انھوں نے چائے کا مطالبہ کیا دونوں دوستوں کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہو گئے۔ ان دونوں کو باہر بٹھا کر وہ خود اندر گئے اور بیوی سے کہا "دو پیالی اور بنا دو" چونکہ چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھی ہی تھی۔

"دینو سو گیا ہے آدھی پیالی چائے اس کی بچی ہوئی ہے۔"

"اور تم؟"

"میرا کیا، آج اپواس ہے میرا، جلد ہی کھانا کھاؤں گی۔"

وسنت راؤ نے ڈیڑھ پیالی چائے دو پیالیوں میں انڈیل لی اور اس طرح باہر آ گئے۔

ایک دوست نے پوچھا "کیا وسنت راؤ تم نہیں پیو گے۔؟"

سچ پوچھا جائے تو انھیں چاہیے کہ وہ اندر ہی بیوی کے ساتھ پئیں شوہر راجہ اور بیوی رانی۔

وسنت راؤ کو یکایک کل رات کا خواب یاد آیا، گھر جیل اور بیوی اور وارڈر۔ وہ اندر کمرے میں آ گئے۔ بیوی اسٹو جلانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"میں باہر جا رہا ہوں"

"پانچ منٹ کے بعد جائیں تو بہتر ہوگا"

وسنت راؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور باہر آ کر دوستوں سے پوچھا "گھومنے چلیں گے؟"

"واہ کیوں نہیں ان دنوں میں تو شام کے وقت اکثر ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔"

دوسرے نے فوراً کہا "لیکن ہمیں تو دیر جی کے گھر جانا ہے۔"

"ارے ہاں — انھیں تو اپنے ساتھ لیکر گھر جانا ہے وہ بھی سات بجے تک۔"

وسنت راؤ اکیلے ہی گھومنے کے لیے باہر نکل پڑے کچھ تو شب بیداری کی وجہ اور کچھ دل کی بے چینی کی وجہ ان کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ انھوں نے یوں ہی نگاہ اٹھائی، سامنے برہمچاری کا پوسٹر آویزاں تھا۔

وہ اندر داخل ہو گئے۔ پکچر ابھی ابھی شروع ہو گیا تھا۔ اس سے قبل انھیں اس میں کسی سا کوئی لطف حاصل نہیں ہوا تھا۔ مگر آج ان کی دلچسپی برقرار تھی۔ درمیانی وقفے میں انھوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی انھیں وہ دونوں دوست دکھائی دیے جو ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ وسنت راؤ نے سوچا ممکن نہ ان سے پوچھا جائے کہ "شاید آپ لوگ دیر کے گھر سے سیدھے یہاں چلے آئے" مگر نہ جانے کیوں انھوں نے اپنی جگہ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی لاپرواہی سے بیوی کی لاپرواہی کا انھیں زیادہ احساس تھا۔ جو بار بار بے چینی کا باعث ہو رہی تھی۔

نو بج چکے تھے مگر ابھی تک گرم ہوا چل رہی تھی۔ جیسے سرد ہوا آنکھ مچولی کے کھیل کی طرح کہاں چھپ گئی تھی۔

وسنت راؤ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ جب باہر اتنی گرمی محسوس ہو رہی ہے، تو پھر گھر میں نہ جانے کتنی گرمی ہوگی!" بیوی شاید سو بھی چکی ہوگی۔ اگر وہ پروسنے کے لئے اٹھ بھی جائے تو میں بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے ٹال دوں گا۔ سچ کہا جائے تو گھر میں بھی ایک قسم کی سیاست چلتی رہتی ہے، سیاست میں گاندھی جی کا اپواس تو اثر رکھتا ہے مگر گھر میں ہم مردوں کا اپواس کیا اہمیت رکھے گا۔۔۔؟"

گھر کے دروازے پر ہی بیوی ان کی منتظر تھی "چلو اچھا ہوا تم آ گئے۔"

وسنت راؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اندر کی جانب مڑ گئے۔

"ابھی تک میں نے اپواس نہیں چھوڑا ہے۔"

"یعنی تم ابھی تک بھوکی ہی ہو؟" وسنت راؤ کو یکایک احساس ہو گیا کہ ان کی بیوی ان کے لئے ہی ابھی تک بھوکی رہی ہے۔ "میں نے سوچا تھا اپواس رکھ کر اسے راستے پر لے آؤں گا مگر اس نے تو اپنی ہی کل سیدھی کر دی۔"

لیکن پہلی ہی سلامی میں کوئی بھی اپنے ہتھیار نہیں ڈال دیتا۔

"کیا لگا رکھی ہے اس اپواس کی گھوشن؟"

"ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو میں نے دینو کے لئے پانچ منگل بدل رکھے ہیں۔"

"دینو کے لئے!"

"ہاں! کل رات اچانک اسے پھر بخار آ گیا۔ میں نے فوراً اس بابائی کے لئے پانچ منگل کو اپواس رکھنے کا طے کر لیا۔ کل پوری رات وہ بے چین رہا میں اسے زانو پر لیے بیٹھی رہی۔"

"تم نے مجھے کیوں نہیں آواز دی!"

"کچہری میں بھی تو آپ کو بہت سارے کام ہوتے ہیں اور ان دنوں تو آپ گھر میں بھی دو دو بجے تک کام کرتے رہتے ہیں، اس بات کا مجھے بخوبی احساس ہے، اگر کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے آپ کا بیاہ ہوتا

ہوتا تو یقیناً اس نے آپ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا ہوتا۔"

صبح میں روٹی نہ پکانے جانے والا مسئلہ یک لخت حل ہوگیا۔ شب بیداری کی وجہ سے وہ روٹی نہ بنا سکی۔ یہ معمہ ابھی ابھی ان کی سمجھ میں آگیا۔ صبح کی گرہ شام میں کھل گئی۔

لیکن غصہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے کہا "میں ڈاکٹر کو لانے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"گھر آنے کی فیس دو روپئے ہے۔ دس بج رہے ہیں۔ شام میں تو بخار کے اترتے ہی میں دینو کو لیکر ... سے ڈاکٹر کے ... ہاں ہو آئی۔ آپ کو اس ماہ نئی رسٹ واچ بھی تو خریدنی ہے۔"

"بیوی نے ڈاکٹر کی فیس تک بچالی تھی اور میں ...... !"

بیوی کے ساتھ وہ دینو کو دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ بخار ابھی تک نہیں اترا تھا۔ بیوی نے ایک برتن میں چاول کی گنجی بنا رکھی تھی۔ اور دوسرے میں چاول بگھارے گئے تھے۔ "یہ دو دو برتن کس کے لئے ہیں۔۔؟!"

"ایک آٹھ بجے واپس آنے والے شخص کے لئے اور دوسرا نو بجے کے بعد واپس آنے والے کے لئے۔"

"لیکن تمھیں چاول کہاں زیادہ بھاتا ہے؟"

"صبح کے چاول میں کھالوں گی۔"

ونت راؤ نے سوچا مردوں کے دکھ صرف اوپری ہوتے ہیں۔ دکھاوے کے ہوتے ہیں اور عورتوں کے دکھوں کی کوئی سیما نہیں۔ یہ سارے کے سارے اندرونی گھاؤ ہوتے ہیں۔ اور جن کی تہوں تک ہماری نظریں پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں۔

ونت راؤ کی بیوی نے باورچی خانے کا سارا کام مکمل کر لیا۔ اور پھر دینو کے کمرے کی جانب مڑ گئی مگر دینو کے کمرے تک نہ پہنچنے کی وجہ سے سخت حیرت ہوئی۔ جوں ہی وہ ونت راؤ کے کمرے میں داخل ہوئی اس نے دیکھا دینو ان کے بستر پر پڑا سو رہا تھا اور ونت راؤ پنکھا جھل رہے تھے۔

"کیا لیجا سکتی ہوں دینو کو؟"

"اول ہوں؟"

"لیکن کیوں؟"

"چونکہ وہ صرف تمہارا نہیں ہے۔"

"لیکن ان دنوں آپ بھی تو کچہری کے کاموں کے لئے رات میں جاگتے رہتے ہیں۔"

"تم دینو، صرف تمہارا نہیں، ہم دونوں کا ہے۔ دو بجے تک اسے میں سنبھالوں گا، اس کے بعد تمہاری باری۔"

ونت راؤ کی بیوی مسکرا پڑی چونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایک بار وہ سو گئے تو پھر صبح سے پہلے آنکھ ہی نہیں کھلتی اس لئے انھوں نے اپنا نمبر پہلے ہی چن لیا ہے۔

ونت راؤ نے گیارہ گھنٹے سُنے اور پھر بارہ مگر اس کے بعد ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ درمیان میں آنکھ کھلتے ہی وہ پنکھا جھلنا شروع کر دیتے تھے۔ مگر پھر نیند کا غلبہ آہی جاتا۔

یکایک کسی کی ہنسی سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ دینو بستر سے باہر چلا گیا تھا اور ان کا ہاتھ دھیرے دھیرے پنکھا جھلنے کا کام کر رہا تھا دینو کی ماں نے کہا "ہاتھ میں کافی تاثیر ہے خوب پسینہ آیا ہے دینو کو۔"

"لیکن میرا ہاتھ اب میرا کہاں رہا ہے۔"

"یعنی؟"

"وہ کب کا دوسرے کے ہاتھ میں دیا جا چکا ہے اور یہ اثر اسی ہاتھ کا ہے۔" ونت راؤ دھیرے دھیرے اپنی بیوی کے قریب آنے لگے۔

اس وقت سامنے کی کھڑکی سے آواز آئی "کیوں ونت راؤ ابھی تک جاگ رہے ہو کیا؟ مجھے آج بہت گرمی کا احساس ہو رہا ہے۔" ونت راؤ اپنی کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہہ اٹھے۔ "آج کیا سرد ہوا چل رہی ہے۔"

دامو انّا برس پڑے۔ "واہ رے! کہاں چل رہی ہے ٹھنڈی ہوا؟ ونت راؤ کا دماغ تو نہیں چل گیا!"

لیکن ونت راؤ کا دماغ تو کل ٹھکانے پر نہیں تھا۔۔۔

اور آج؟

آج ان کا من موسے ہوئے گا رہا تھا، گنگنا رہا تھا، گھریلو سنسار کی برتن سخت دھوپ میں بھی بہار کی خوشگوار ہوا چلتی ہی رہتی ہے، بہتی ہی رہتی ہے۔

■■

نا۔ سی۔ پھڑکے

میرا دیش

پلیٹ فارم پہ قدموں کی آواز پیدا کرتے ہوئے دھیرے دھیرے چلنے والے اس شخص کی طرف کوئی بھی متوجہ ہو سکتا تھا لیکن اس وقت لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ یہ دن کا وہ حصہ تھا جب اکثر پلیٹ فارم پر گنے چنے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ پانچ چھ قلی اپنے اپنے کاموں پر مصروف ہونے کی وجہ سے اس کی طرف دھیان نہ دے سکے [illegible] بڑی وجہ یہ تھی کہ گاڑی کے لئے ابھی کافی وقت تھا۔ اور ایسے وقتوں میں مسافر ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کی بجائے پلیٹ فارم پر ہی گھومتے نظر آتے ہیں۔ مسافروں کی ان دیرینہ عادتوں سے قلی بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے وہ بھی اس شخص کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ اگر کسی کو اس قدر فرصت ہوتی تو یقیناً وہ اس کی طرف راغب ہوتا کیونکہ اس کے جسم کی مضبوطی اور دلکشی کے علاوہ اس کے کپڑے بھی اپنی طرف راغب کرنے والے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے [illegible] سے ادھار لئے ہوں۔ داڑھی کے ساتھ ساتھ سر کے بال بھی اس قدر بڑھے ہوئے تھے جیسے کسی [illegible] ہیں [illegible] کیا [illegible] اس طرح کا [illegible] تھا [illegible] آنکھیں جیسی تھیں [illegible] کیونکہ [illegible] آنکھیں چہرہ [illegible] تھیں۔

شمال مغرب کی جانب سے جو پھاٹک جنکشن کی طرف کھلتا تھا اسی پھاٹک کے ذریعہ وہ ایک گھنٹہ قبل اسٹیشن پر آدھمکا تھا۔ اور مغرب میں دور تک چلے جانے والے چھوٹے راستے سے اسے شہر کی جانب جانا تھا۔ گاڑی کے لئے ابھی کافی وقت ہونے کی وجہ سے وہ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ گھنٹہ بھر پہلے جب وہ صدر دروازے سے اسٹیشن پر آیا تو ایک قلی نے پراسرار لہجے میں پوچھا تھا "صاحب کوئی سامان۔۔؟"

"میرے [illegible] ہاتھ بالکل خالی ہیں کوئی سامان نہیں۔" اس نے یہ جملے اتنی [illegible] پراثر انداز میں کہے کہ قلی کو بہت ہی بڑے صاحب ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک اینگلو انڈین چھوکرے سے [illegible] انگریزی میں گاڑی کے آنے کا وقت دریافت کیا اور پھر ایک اسٹال کی جانب بڑھ گیا۔ [illegible] ہندوستان کی جاری جنگ [illegible] ذاتی فسادات [illegible] ان کتابوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور سوچنے لگا۔ آدمی [illegible] وقت کے [illegible] کس قدر [illegible] ہے۔ سبھی [illegible] ان دنوں انہی باتوں کے [illegible] کتابوں [illegible] لگے ہوئے پوسٹروں کی طرف چلا گیا۔ ضرورت کے وقت ہی سفر کیجئے۔ سفر میں سامان زیادہ نہ ہو۔ [illegible] کے لب کھلے اور کھل کر بند ہو گئے۔ ابھی جس گاڑی سے وہ اترا تھا وہ کیا کچھ سامان سے بھری ہوئی تھی اور سبھی گاڑیاں اسی طرح لدی پھندی [illegible] تجربہ تھا کیسی [illegible] اس اشتہار کا [illegible] آرٹسٹ نے بے حد [illegible] وہاں سے وہ [illegible] کی طرف مڑ گیا [illegible] تین [illegible] جو اس وقت [illegible] اسٹال کے قریب چائے پی رہے تھے [illegible] مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ اور [illegible] بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا ہوا ایک بورڈ لٹک رہا تھا: "افواہوں پر دھیان نہ دیجئے۔ بیکاری کی گفتگو نقصان دہ ہے۔" وہ لوگوں کے پاس ہی کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک شخص اس سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا "بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے۔؟ جو کچھ ظلم و تشدد

ہمیں لگتا ہے اس کی ذمہ دار کانگریس ہی ہے۔ خیال ہے تمہارا؟" مگر اس نے خالص انگریزی میں جواب دیا۔ "میں آپ لوگوں کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں ــــ" اور آگے بڑھ گیا۔

ابھی چالیس منٹ اور تھے۔ دھیرے دھیرے بھوک زور پکڑ رہی تھی۔ جو اسے ریسٹورنٹ کا راستہ دکھا رہی تھی۔ جب وہ ریسٹورنٹ کی جانب جانے کے لئے مڑ رہا تھا، اچانک ایک صاحب آکر ٹکرا گئے۔ ان کی عینک گر پڑی مگر جب انھوں نے اپنی عینک آنکھوں پر چڑھالی اور اسے بغور دیکھا! اور پہچاننے کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا "ارے تو یہاں ہے" مگر اس شخص نے اس کے بالکل قریب ہو کر کہا "اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو بالکل ظاہر مت ہونے دو۔"

ادھر کوئی بھی نہیں تھا یہ دیکھ کر اس نے پوچھا "لیکن تمہاری یہ پوشاک یہ حالت؟ آخر کہاں جا رہے ہو؟ کیا تمہیں تمہارے پکڑے جانے کا ذرہ برابر بھی خطرہ نہیں؟"

وہ مسکرایا۔ "ایسے کئی بھیس میں بدل چکا، پولیس مجھے پکڑنے میں ابھی تک کوئی کامیاب نہیں ہو پایا۔" پھر وہ اس سے اور قریب ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ کہتا رہا۔ سننے والے نے کہا۔ "نہیں دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو بھیا!" دور سے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے اپنے دوست سے ہاتھ ملایا۔ اور ریسٹورنٹ کی جانب مڑ گیا۔

"کہیں دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟" دوست کا یہ جملہ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ریسٹورنٹ بالکل خالی تھا اس نے بیرے کو آواز دی۔

بہت دور سے جواب ملا "آیا صاحب" مگر جواب کے ساتھ ساتھ بیرا حاضر نہیں ہوا اسے کسی طرح کی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ صرف اس کے دوست کا کہا ہوا جملہ اس کے کانوں میں بج رہا تھا "کہیں دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟" میں اور دیوانہ پن؟ گاندھی جی نے جب "کریں گے یا مریں گے" کا نعرہ بلند کیا تھا، دیش بھر میں دیوانہ پن ہی شروع ہو گیا تھا کتنے لوگ "کریں گے یا مریں گے" کی نذر ہو چکے تھے۔ اور کئی اس راہ پر گامزن [illegible] کا نعرہ جتنا سا نعرہ ہو چکا تھا۔ اسی لئے لوگ دیوانے [illegible] بھی ساتھ نہیں تھا۔

۱۹۴۲ء میں جب آزادی کی تحریک نے زور پکڑا اس نے کالج کو خیرباد کہا۔ کئی مضامین میں اول رہنے والے اس طالب علم کی زندگی کو نئے دھارے پر جاتے ہوئے دیکھ کر بہتوں نے کہا تھا "یہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے" اس کے والد کا پنشن پر گذارا ہوتا تھا۔ ماں کئی دنوں سے بستر علالت پر تھی۔ چھوٹی بہن جوں توں اسی سال ایس۔ ایس۔ سی میں داخل ہوئی تھی۔ اور چھوٹا بھائی مشکل سے ابھی آٹھ سال کا تھا۔ اس کے نام وارنٹ جاری ہونے سے پہلے ہی وہ گھر بار چھوڑ چکا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی بہن سے کہا تھا "گھر کی ساری ذمہ داریاں میں تمہارے سر سونپ کر جا رہا ہوں خیال رہے کسی کو بھی میری کمی محسوس نہ ہونے پائے۔"

اس کم سن بہن نے ساری ذمہ داریاں اپنے سر لیتے ہوئے کہا تھا "ہاں میں سب کچھ سنبھال لوں گی" وہ آواز کتنی گہری اور کتنی سخت تھی، کتنا اعتماد تھا اس آواز میں کیا اس کا بھی یہ دیوانہ پن نہیں تھا۔؟

پورے دیش بھر میں اس سرے سے اس سرے تک ایک ہی فرض کو انجام دینا تھا۔ گو کہ وہ اپنے ملک سے بہت دور تھا اس کے باوجود یہاں بھی ظلم و تشدد، سزا، مار پیٹ، جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔ اور لوگوں کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے گاندھی جی کے نعروں کے متوالے بلا خوف و خطر یہاں پر بھی اپنا کام بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ اس کے نام وارنٹ جاری کیا گیا تھا۔ والد کی پنشن بند ہو چکی تھی۔ فرنگیوں نے اسے پکڑنے کے لئے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا۔ شاید اب والد پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ ضعیف بیمار ماں میری جدائی کے غم کو برداشت نہ کر سکی ہوگی اور اس دنیا سے چل بسی ہوگی۔ چھوٹی بہن حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھکن سے چور چور ہو چکی ہوگی۔ مگر یہ وقت صرف اپنے ہی گھر سے اور گھر کے افراد سے متعلق سوچنے کا نہیں تھا۔ ان گنت لوگ چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ اور اس ایک آواز کو کونے کونے میں پھیلانے میں کوشاں تھے۔

کل دیوالی کا بڑا دن تھا۔ آج تک یہ تہوار وہ اپنے ہی گھر پر مناتا آیا تھا۔ پچھلے آٹھ دنوں سے وہ متواتر یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ دیوالی کے موقعہ پر اپنے گھر پہنچ جائے۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبنے کے باوجود بھی اسے رہ رہ کر گھر والوں کی یاد ستاتی تھی۔ خدا جانے وہ کس طرح زندگی کے دن بتا رہے ہوں گے؟ دھیان، فکر کے ساتھ دوسری چیزیں بھی

یادیں اس سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ جس کا پتہ اسے اخباروں کے ذریعہ ہو ہی جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دیکھا کرتا کہ اس کی بہن چھوٹی سی تھیلی ہاتھ میں سنبھالے گھر کی جانب جا رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی مٹی کے تیل کی بوتل ہاتھوں میں تھامے کیوسک گھر اپنے نمبر کا انتظار کر رہا ہے۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ رات گئے تک وہ اپنے گھر سے متعلق سوچا کرتا۔ اور صبح سویرے اٹھ کر جب 'وندے ماترم' کی گھوشنا کرتا تو اپنے آپ کو کچھ دیر کے لئے ہلکا سا محسوس کرتا جیسے اس کے سارے دکھ دور ہو گئے ہوں۔

آخرکار آج صبح ہی وہ گھر واپس جانے کے ارادے سے نکل پڑا تھا۔ شام ہونے تک گھر پہنچ جائے گا۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ اپنا ہر ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ تاکہ کوئی آفت نہ آئے وہ صرف ایک دن کے لئے اپنے گھر رہنے والا تھا۔ کہیں تم دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟"

اسی وقت پلیٹ فارم کے گھنٹے کی آواز چاروں طرف پھیل گئی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ — بیرے نے مخاطب ہو کر کہا "کیا لاؤں صاحب —؟"

"کچھ نہیں گاڑی کے چھوٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"نہیں صاحب! پونہ سے گاڑی پلیٹ فارم کی طرف آ رہی ہے، اسی لئے گھنٹہ بجایا گیا تھا۔"

اس نے گھڑی کی طرف نظر کی۔ ہاں واقعی ابھی پچیس منٹ اور باقی تھے۔

"تو پھر چائے لے آؤ۔ اور چائے کے ساتھ کیکس!"

"کنٹرول کا زمانہ آ گیا ہے صاحب۔ کیک کہاں سے ملیں گے؟ بمبئی کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی اب باجرہ کے کیکس ملتے ہیں۔"

"گرم توس مل سکیں گے؟"

بیرا کیا کہنا چاہتا تھا اس کا اندازہ اس نے اس کی آنکھوں سے کر لیا تھا۔ سبھی لوگ اس کونے سے اس کونے تک یہی کہہ رہے تھے، کوئی آہستہ، کوئی دبی دبی زبان میں، کوئی سر راہ!

"چائے ہی لے آؤ"

"ہاں چائے ضرور دے سکتا ہوں۔ لیٹن صاحب کی مرضی ابھی تک باقی ہے۔ البتہ شکر جتنی لا کر رکھ دوں گا اسی پر قناعت کیجئے۔ اس سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔"

سکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں جب وہ جا کر بیٹھ گیا تب اسے محسوس ہوا۔ بس صرف دو گھنٹوں میں میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اور سال بھر کے دکھ ہنستے کھیلتے دور کر دوں گا۔ گاڑی دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے سرک رہی تھی تبھی سیٹیوں کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ گاڑی اپنی جگہ رک گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مگر اس کے ہی کمپارٹمنٹ میں دو ہتھیار بند پولیس داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ جس شخص کے ہاتھوں میں بیڑیاں تھیں اسے اس نے پہچان لیا تھا۔ پتہ نہیں وہ ان لوگوں کے جال میں کس طرح پھنس گیا تھا؟

پلیٹ فارم پھر سیٹیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ اور گاڑی نے دھیرے دھیرے اپنی رفتار تیز کر لی۔ اس نے سوچا اب میرے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی آنکھیں موندے آنے والی گھڑی کا انتظار کروں۔ مگر اس نے سگریٹ کی ڈبیا اپنی جیب سے نکالی اور پولیس والوں کے سامنے کر دی۔ چاروں نے سگار اپنے ہونٹوں تلے دبا لیا۔ اور دھوئیں کے ساتھ ساتھ باتیں بھی شروع ہو گئیں۔ اس نے جان لیا اب کوئی خطرہ نہیں۔ اگلے اسٹیشن پر ہتھیار بند پولیس اس شخص کو تیسرے درجہ کے کمپارٹمنٹ میں لے گئی۔ مگر گاڑی ابھی تک چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس لئے اس نے تفتیش کی پتہ چلا آج صبح ہی سے ڈی آئی جی کل رات کے خطرناک ڈاکہ کی پہچان بین کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں اسی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ گاڑی میں دوسرے درجہ کا کمپارٹمنٹ ایک ہی ہونے کی وجہ سے ڈی آئی جی کا اسی ڈبہ میں آنا ممکنات میں سے تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ ڈی آئی جی کو بھی سگریٹ پیش کر کے تجربہ کیا جائے۔ مگر زہر کی شناخت کے لئے اس کا کھانا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اپنا کمپارٹمنٹ بدل دیا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم سے آگے بڑھی اس کے سامنے ایک ادھیڑ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سفر کے دوران میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو بنا سوچے سمجھے بغیر کسی پہچان کے بکتا شروع

کیونکہ میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص بالکل اسی قسم کا تھا" میں تمھاری زبان سے ناواقف ہوں "

"یعنی آپ ہمارے ملک کے نہیں ہیں ؟"

اس نے نفی میں اپنی گردن ہلائی۔ اس کے باوجود بھی اُس شخص نے خاموشی اختیار نہیں کی۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں۔۔ ؟"

"میرٹھ سے "

او ہو ! یعنی آپ بہت دور سے آرہے ہیں "

"جناب آج کا یہ جو تھا دن بھی ریل میں بیت رہا ہے "

"میرٹھ : یعنی دہلی سے قریب ہے نا ؟"

"جی ہاں !"

"وہاں کے حالات ان دنوں کیسے ہیں ؟"

"میں ان حالات سے قطعی ناواقف ہوں غم روزگار نے اتنی مہلت کہاں دی ہے کہ یہ دیکھتا پھروں کہ اپنے چاروں اور کیا ہو رہا ہے۔ کنزہ اکسٹر ہوں۔ ہوں۔ مزدوروں کے ساتھ پورا دن گذر جاتا ہے "

"پھر بھی ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ وہاں کے حالات کافی بدل چکے ہیں۔ ان دنوں کیا کچھ نہیں ہوتا صاحب ! پرسوں ہی کی واردات ہے یہاں پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ سامنے زیورات پڑے ہوئے تھے۔ ان کو انھوں نے چھو تک نہیں، اور نہ ہی خون خرابہ کیا ـــ گاؤں میں چھ رائفلیں تھیں۔ انھوں نے وہ رائفلیں اور نقدی جس قدر بھی ہاتھ لگی سمیٹتے ہوئے چلتے بنے بڑی خاموشی سے آئے اور اسی انداز سے چلے گئے" اس نے کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کیا۔ یہ جتانے کے لئے کہ مجھے آپ کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر اس شخص نے خاموشی مناسب سمجھی۔ سگار پیش کرتے ہوئے کہا" لو سگار پیو "

مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

اس پر بھی وہ خاموش نہیں ہوا۔ پوچھ بیٹھا "کیا آپ کبھی نہیں پیتے ؟"

سگریٹ جلا کر پھر وہ نئے سرے سے شروع ہوا "کئی لوگ اس شخص کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ گرتا چلا گیا۔ کئی کہتے ہیں

بمبئی کے ہی آس پاس چھپا بیٹھا ہے۔ سرکار نے تو اسے پکڑنے والے کو پانچ ہزار روپوں کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس انعام کو پانے کے لئے کئی اس کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ اس کے گھر کے چاروں طرف پولیس کی بڑی نگرانی ہے۔ گھر میں داخل ہو کر اس کے باپ کو ڈرا دھمکا کر پوچھا جاتا ہے "بتاؤ وہ کہاں ہے ؟ ظاہر ہے گھر کے لوگ بتانے سے معذور ہیں۔ انھیں اس بات کا کس قدر احساس ہوگا اور نہ جانے ان لوگوں پہ کیا گذرتی ہوگی ؟ مگر مجھے یقین ہے وہ ہمیشہ یہی دعا کرتے ہوں گے کہ خدایا اُسے کبھی گھر آنے کی ہدایت نہ دے۔ اگر وہ یہاں چلا آئے گا تو یقیناً پکڑا جائے گا۔ کتنی تعجب کی بات ہے۔ مگر وقت ہی کچھ ایسا آگیا ہے کہ اس کی واپسی کی دعا کرنے کے بجائے اس کی دوری کے لئے دعا کر رہے ہیں "

اس نے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "وہاں جو جھونپڑیاں نظر آرہی ہیں۔ کس کی ہیں ؟ کون لوگ بستے ہیں ؟ اس نے جواب دیا۔

"پولینڈ سے ڈھائی تین ہزار لوگ آگئے ہیں۔ ان ہی کی بستی ہے۔ بڑی ٹھاٹ کی زندگی گذار رہے ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ سنا ہے اب ان کے ناچنے کے لئے ایک بڑا ہال بھی بنایا جا رہا ہے۔ ہر ایک آدمی کو تین روپئے روز کے حساب سے بھتہ بھی مقرر ہے۔ اب ہم بھی اس بات کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں کاش سرکار ہمیں بھی ان مہمانوں کے زمرہ میں داخل کر دے چونکہ ہمیں ایک سیر شکر اور آدھی بوتل مٹی کے تیل کے لئے گھنٹہ گھنٹہ بھر کیو میں کھڑے رہ کر دھکے کھانے ہوتے ہیں۔ مہمانوں کے لئے ملیدہ اور میزبانوں کے لئے دھتورا۔ ان دنوں انصاف کا قانون ہی بدل گیا ہے "

اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر پڑا۔

"ارے بھئی یہ اسٹیشن نہیں ہے۔ یہاں کس لئے اتر پڑے ہو ؟"

"اگر پانی مل جائے تو ہاتھ منہ دھو لوں"

مگر وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس نہیں لوٹا۔ یہ دیکھ کر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ اب رہ گیا نا وہ اسی اسٹیشن پر اس کے اسٹیشن پر رہ جانے کا دکھ اسے کم تھا غم تھا تو اس بات کا کہ اب اس کی باتیں سننے کے لئے کوئی موجود نہیں تھا۔

اسٹیشن سے قریب تین چار فرلانگ پر ہی ایک چھوٹا سا مندر تھا سیڑھیوں کے قریب ہی بیٹھا وہ سوچ رہا تھا میری غیر حاضری سے ہر ایک

سکا ناک میں دم آ گیا ہے۔ اگر میں اس وقت گھر چلا جاؤں تو یقیناً پکڑا جاؤں گا۔ اب کوئی بھی میری واپسی کا انتظار نہیں کر رہا ہو گا۔ وہ لوگ یہی دعا کر رہے ہوں گے کہ خدایا اسے گھر آنے کی توفیق نہ دے۔" اس نے سوچا یہ دیوالی نہ سہی، اگلی دیوالی ہی میں گھر پر مناؤں گا۔ کبھی تو آزادی کی صبح مسکرائے گی نا؟ پھر آج گھر واپس جانا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے برابر ہے۔ اس نے گھر جانے کا خیال ترک کر دیا۔ رات کی آخری گاڑی باقی تھی۔ وہ اس گاڑی سے واپس جا سکتا تھا۔

سورج کی کرنیں مدھم ہو گئی تھیں۔ اور اندھیرا دھیرے دھیرے اپنے قدم جما رہا تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ اس وقت اس کا دھیان اس نئی بستی کی طرف چلا گیا۔ آج ہم اگر بے گھر ہو چکے ہوتے تو پولینڈ کے لوگوں نے ہمیں رہنے کے لئے گھر اور زندگی کی دوسری سہولتیں مہیا کی ہوتیں؟ کیا وہ اپنے دیش میں ہمیں مہمانوں کی طرح رہنے کا ادھیکار دیتے۔؟

"اس درخت کو کیا کہتے ہیں؟" اچانک آواز سے وہ ایک دم چونک پڑا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کا استعمال کیا گیا تھا۔ اور سوال پوچھنے والی ایک عورت تھی۔ اس کی باہیں بہت ہی گوری تھیں۔ اور کپڑے بھڑکدار۔ خراب دودھ پر جس طرح دھبے اُبھر آتے ہیں بالکل اسی طرح کے دھبے اس کے جسم پر دکھائی دیتے تھے۔ آنکھیں نیلی اور بہت ہی گہری۔

اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اور اس درخت کے کچھ پتے ہاتھوں پر ملتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ اس کی ناک کی طرف لے گئی۔ ملے ہوئے پتے سونگھتے ہی اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب بارش میں گھومنے کے بعد سردی ہوتی تھی تو ماں سردی کے اثر کو دور کرنے کے لئے جو کاڑھا تیار کر کے پلاتی تھی بالکل یہی خوشبو ان پتوں سے آ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ لمحہ بھر کے لئے پھر سے چھوٹا ہو گیا ہے اور اس کا بچپنا واپس لوٹ آیا ہے۔

"میں اس کے نام سے تو ناواقف ہوں مگر اس کا استعمال جڑی بوٹی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟"

"آخر تمھیں اس درخت سے کیا لینا دینا۔ تم یہاں کی تو دکھائی نہیں دیتیں؟"

"ہاں میں دور دیش کی رہنے والی ہوں۔ میرا دیش پولینڈ ہے ہم بے آسرا لوگ تمھارے دیش میں آسرے اور سہارے کے لئے آئے ہیں۔ پچھلے تین ہفتوں سے متواتر میں ہر شام اس گھاٹی کی طرف نکل جاتی ہوں اور نئے نئے درختوں سے متعلق معلومات حاصل کرتی ہوں۔ یہ ساری معلومات میری ڈائری میں درج ہیں۔"

اس لمحہ اس نے سوچا یہ بیس بائیس سال کی کم سن لڑکی اپنے دیش سے دور دوسرے ملک میں درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کی معلومات حاصل کر رہی تھی اور انھیں اپنی ڈائری میں درج کر رہی تھی۔ کیا اگر ہم ہندوستانی اس طرح دوسرے دیش میں جاتے . . . . تو اس طرح معلومات حاصل کر کے اپنی ڈائری میں اس کی رپورٹ رکھتے؟

"جان پڑتا ہے تمھیں اس سے کافی دلچسپی ہے؟"

"ہاں میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ممکن تھا کہ مجھے سند بھی مل جاتی۔ مگر ہمارا دیش اس جنگ کی آگ میں بھسم ہو گیا، اور سارے حالات بدل گئے۔"

"میں چاہتا ہوں تم کچھ اور بھی کہتی جاؤ اور میں سنتا جاؤں۔"

وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ سگار جلایا اور کہنا شروع کیا۔

"ایک طرف سے روسی فوجیں اور دوسری طرف سے جرمن فوجیں پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔ ملک بھر کے لوگ دونوں فوجوں میں تقسیم ہو گئے۔ کھیت، گھر، دیہات، شہر آگ کی نذر ہو گئے۔ میرے پانچ بھائی میدانِ جنگ سے واپس نہیں آئے۔ اور نہ ہی میرے منگیتر صرف میں اور میرے بوڑھے پتا بچ گئے۔ الگ الگ راستوں پر بچے کھچے لوگ چل پڑے۔ چاروں طرف جنگ کی آگ ایسے وقتوں میں زوال کو جگہ کون دے گا؟ انگلینڈ کی سفارش پر کچھ لوگ ہندوستان چلے آئے الغرض . . . . وہ خاموش ہو گئی۔

اس نے پوچھا۔ "کیا تمھیں کسی بات کی تکلیف ہے یہاں؟ تم سکھی نہیں ہو؟"

"سکھ کس چیز کا نام ہوتا ہے مجھے پتہ نہیں؟ میرے پانچ بھائی، میرا منگیتر کوئی نہیں بچا۔ پچھلے دو سالوں سے وہاں کیا ہوا ہے کسی بات کا ہمیں علم نہیں۔ ان لوگوں کی تصویریں میرے پاس [illegible]۔

انھیں گھنٹوں، تکا کرتی ہوں اور اپنے آپ کو جھوٹی تسلّی دیتی ہوں۔ کہ وہ زندہ ہیں۔ ان سے کبھی نہ کبھی، ضرور ملاقات ہوگی۔ تم لوگوں نے ہمیں سہارا دیا۔ اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس وقت ہم اپنے دیش سے بہت دور ہیں۔ میرا دیش، میرا دیش، میرا ملک، میرا گھر! ایک سنگار اور!"

"تم نے میری باتیں بڑی خاموشی سے سنیں لگتا ہے جیسے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ اس نے شب بخیر کہا اور اپنی بستی کے راستہ پر چل پڑی۔

وہ چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں اپنی ہی جگہ قائم رہا۔ اس نے سوچا پولینڈ والے اگر یہاں آکر رہ رہے ہیں تو یہ ان کی غلطی نہیں۔ مجھے ان سے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے۔ ہندستان نے ہمیشہ اپنے مہمانوں کی عزت کی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں اس خیال نے جڑ پکڑ لی۔ نہ میں بھی نرواسی ہوں، پولینڈ سے آنے والے لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ بسے ہیں اور میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔ اور پھر بھی ہر ایک چیز کو خیر باد کہہ چکا ہوں وہ اپنا ملک چھوڑ آئے ہیں اس لئے نرواسی ہیں۔ اور میں اس دیش کا رہنے والا ہوں یہی میری سرزمین ہے۔ یہی میرا گھر ہے۔ میرے ماتا، پتا، بھائی، بہن سبھی یہیں ہیں۔ اس کے باوجود بھی میں اپنے ہی دیش میں نرواسی ہوں میرا اپنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں ہے۔ میرا دیش —— میرا دیش !!!

گنگا دھر گاڈگل

زنگ آلود چہرے

اتوار کی دوپہر سر پر چڑھ کر بول رہی تھی۔

بمبئی میں فسادات کی آگ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مورتیاں توڑی جا رہی تھیں، مسجدیں ویران کی جا رہی تھیں، شہر میں کرفیو نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن ایسی بھری دوپہر میں بیرو واڑی کی چال کی پہلی منزل پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھٹمنڈے کی اس چال میں پچاس روپوں سے لیکر ڈیڑھ سو روپے تک کی آمدنی پانے والے لوگ بستے تھے۔ اور سچ کہا جائے تو ہر ذات کی ایک خاصی ذات ہوتی تھی۔ البتہ روٹی اور بیٹی کے دونوں رواج برابر قائم تھے۔ تمام لوگ صاحب کو خوش رکھنے میں ہر وقت کوشاں نظر آتے تھے۔ چونکہ اس امر سے وہ بخوبی واقف تھے، جہاں صاحب خوش ہوئے وہیں تنخواہ کی رقم میں اضافہ ہو گیا۔ وہاں کی عورتیں اپنے شوہر کی تنخواہ اور ان کی ذاتی خوبصورتی پر ناپی تولی جاتی تھیں۔ نوکری کرنا۔ تنخواہ پانا اور شادی کرنا، بچوں کو پڑھانا پھر پنشن لیکر گھر بیٹھ جانا، یہی ان کی زندگی کا مقصد۔ البتہ بیمہ نکالنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ ٹھکرا اور مٹی کا تیل ان کے لئے ایک اہم مسئلہ تھا۔ گنپتی پوجن سب سے بڑا مذہبی فرض، اور غریبی آبا و اجداد کی میراث تھی۔ سماجی، مذہبی، سیاسی مسئلوں کی صفوں بستہ قطاریں ہی کھڑی کیوں نہ ہو جائیں وہ اپنی جگہ سے رتی برابر بھی ہلنا ایک عظیم گناہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

کھٹمنڈے کی اس چال میں گو کہ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی پھر بھی چلبلی مائی بائی اپنے شوہر کو ڈانٹ رہی تھیں جس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ قریب کے کمرے میں انا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ سج نگاہ بنڈو پنت اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے وہ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامنے والی خوبصورت لڑکی کی طرف ان کا کوئی دھیان نہیں۔ اسے انھوں نے ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ شام راؤ دروازے پر بیٹھے ہوئے اپنی پرانی چھتری کی مرمت کر رہے تھے۔ ڈانگلے اور گل اپنا پورے ہندو مہا سبھا کے مسئلوں پر بحث کر رہے تھے۔ اور ایک نئے بیاہتا جوڑے کے کمرے کا دروازہ معمول کے مطابق بند تھا۔ اس وقت آٹھ سال کا لڑکا داسو گیلری میں آ کھڑا ہوا اسے محسوس ہوا جیسے کوئی واردات ہو جائے اور وہ یکایک اس کی اطلاع چال والوں کو دے سکے اور اپنی بہادری کا پروانہ حاصل کر سکے۔ بنڈو پنت نے ایک بار نوکرانی کا ہاتھ پکڑا تھا۔ نوکرانی نے ایک زوردار طمانچہ سے اس کا جواب دیا تھا۔ اس اہم خبر کی اطلاع بھی داسو نے ہی چال والوں کو دی تھی۔ ویسے اس نے اس نو بیاہتا جوڑے کو دروازے سے کئی بار جھانک کر دیکھا تھا، مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اس لئے وہ یہ اہم خبر لوگوں تک پہنچانے سے قاصر رہا۔ اس بات کا اسے دکھ ضرور تھا۔ البتہ شام راؤ نئی مشینیں خرید لائے تھے اور مادھو راؤ کے گھر میں لڈو بن رہے تھے، ان باتوں کی اطلاع ماں تک پہنچائی تھی۔ اس نے گیلری میں سے راستہ کی جانب دیکھا اسے ایک ۔ ۔ ۔ ۔ گونہ خوشی حاصل ہوئی، راستے سے لگ کر ہوتے کی دوکان جو ایک مسلمان کی تھی، غنڈے اس کے دروازے توڑ رہے تھے، ایک نے تالا توڑ دیا، دوسرے نے دروازے نکال پھینک دیے اور تیسرے نے کانچ کی الماریوں پر ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ ان کی اس جرارت پر لوگ دبک گئے البتہ وہ اندر ہی اندر بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اب تک

پھر پوپد طمانچہ جڑ دیا۔ اور اپنا راستہ لیا۔ دامو کا سر گھومنے لگا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ گھر میں پہنچتے ہی اس نے ساری حقیقت ماں سے بیان کی۔ آنا کو اس کے پیٹے جانے کی بہ نسبت تھیلی کے کھو جانے کا غم تھا۔ اس لئے وہ رہ رہ کر دامو کی طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پولیس کے آتے ہی غنڈوں نے اپنا راستہ لیا اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے جوتے چور ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑنے لگے۔ ایک لڑکا جو اپنے ساتھ تین چار عورتیں اور ان کے سارے بچے جوتے چرانے کو لے آیا تھا۔ آگے آگے دوڑ رہا تھا اور عورتوں اور بچوں کو تیز تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ البتہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر اتنا بھی دیکھ سکے کہ اس کا یہ چھوٹا سا کارواں ابھی اور کتنے پیچھے رہ گیا ہے ...... ؟!!

اروند گوکھلے

ماتم

آپا جی کے یکایک بے ہوش ہو جانے کی اطلاع صبح اخبار دے چکا تھا۔ اس کے بعد گاؤں سے آئے نیتاؤں نے بھی یہی خبر سنائی۔ شاید ریڈیو پر بھی ہزاروں لوگوں نے اس خبر کو سنا ہوگا۔ میں کچھ مصروف رہا، اس لئے ریڈیو کا براڈکاسٹ میرے کانوں تک نہ پہنچ سکا۔ اپنے وزارتی کاموں اور دوسری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر میں ان سے ملاقات کے لئے روانہ ہوگیا۔ سچ کہا جائے تو آپا جی اس سے قبل بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے لیکن موت کے گہرے سمندر تک جاکر واپس آگئے تھے۔ اخبار والوں نے اس بار پھر لکھا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکن آپا جی کی موت کی خبر دے رہی تھی۔ وہ اب چند لمحوں کے مہمان ہیں، اس کے بعد زندگی کی ساری دوڑ دھوپ ایک نقطہ پر آکر جم جائے گی۔ اور اس کے بعد پھر کبھی ان کی خلوص بھری آواز سنائی نہیں دے گی۔ ان کے آخری درشن کے لئے میں تڑپ اٹھا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ سماج کے کرتا دھرتا تھے۔ ایک بڑے نیتا تھے۔ بلکہ اس لئے کہ میرا اور ان کا خون کا رشتہ تھا۔ میری بیوی بھی حد درجہ اداس ہوگئی تھی مگر آپا جی کے گاؤں جانے کی رائے سے متفق نہیں تھی۔ چھوٹی بچی کی طبیعت قدرے ناساز تھی۔ اور بڑے لڑکے کا امتحان قریب تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کے گھر نہ جانے کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ پچھلی بار جب آپا جی بستر مرگ پر تھے اس وقت وہ میرے ساتھ ان کے گھر آئی تھی۔ آپا جی بے حد مخلص انسان ہیں، انہیں اپنے سارے رشتہ دار عزیز ہیں۔ ان کے نزدیک رشتہ میں کوئی فرق نہیں، چاہے رشتہ قریب کا ہو یا دور کا۔ مگر وہاں پر ان کے اپنے لوگوں کو ان سے دور رکھا گیا تھا اور ان تک رسائی ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ آپا جی کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ چھوڑیے میری اور میری تو کیا بات ان کی اپنی بیوی اور بچوں کو کہاں ان سے قریب رہنے کی اجازت تھی۔ انھیں اکیلے میں کبھی رہنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ مصروفیت، بے کار مصروفیت۔ دورے، چرچے، سبھائیں۔ جشن، افتتاح اور نہ جانے کیا کیا! بیوی کی آپا جی کے گھر نہ جانے کی رائے سے ایک حد تک میں بھی متفق تھا۔ مگر زندگی کی وہ روز کی انجمنیں الگ اور موت کی آخری انجمن الگ۔ اس لئے میں نے سارے وسوسوں کو پرے رکھ کر ان کے گھر کا راستہ لیا۔ میں نے سوچا اس وقت آپا جی کے آخری لمحات میں ان کے دونوں بچے ان سے قریب ہوں گے۔ ان کی بیوی زار و قطار رو رہی ہوگی۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہہ رہے ہوں گے۔ اور آپا جی پوچھ رہے ہوں گے، "————— کیا میرا سوتیلا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔؟ کون کون آیا ہے۔؟ کہاں ہیں وہ سارے میرے اپنے، لے آؤ انھیں، میرے قریب لے آؤ ----- !"

گھر چھوڑنے سے قبل میری بیوی نے کہا تھا: تم وہاں جاکر کیا کروگے؟ ان کے اپنے ڈاکٹر ہیں، ہاتھ بٹانے کے لئے دوسرے نیتا ہیں، ان کے ساتھ کام کرنے والے اور کتنے لوگ ہوں گے۔ اتنی بھیڑ میں تمہیں کون پوچھتا پھرے گا؟ واقعی میں، وہاں جاکر کیا کرسکوں گا؟ مگر نہیں، مجھے جانا چاہیے، ان کے آخری درشن کے لئے، ان کے بچوں کو دلاسہ دینے کے لئے، سال جی کے آنسو پونچھنے کے لئے! رات کے اندھیارے میں جب گاڑی پوری رفتار سے چلنے لگی تو مجھے پرانی باتوں کو دہرانا تھا، جتنی یادوں کو سمیٹ کر کچھ دیر کے لئے کھو جانا تھا، مگر اسی وقت میرے گاؤں کے دو نیتا دکھائی دیئے اور انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا: فون آیا تھا، بچنے کی کوئی امید

نہیں سے غم کا ایک طوفان میرے اوپر سے گذر گیا۔ میں نے مسافروں کے ہجوم میں اپنے لئے جوں توں جگہ بنا لی۔ مگر سامنے بیٹھا ہوا وہ بڑی توند والا نیتا مجھے بےحد کھٹک رہا تھا، ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ دوسرا جو ابھی ابھی آپا جی کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ بڑی بیہا یک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے آپا جی کے بے ہوش ہونے کی خبر صبح کے اخبار میں پڑھی تھی اور ان دونوں کو فون پر اطلاع دی گئی تھی حالانکہ ان کا آپا جی سے دور دور تک کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی انھیں لے جانے کے لئے گاڑی آنے والی تھی۔ اسی وقت پھر ایک بار بیوی کے جملے کانوں میں گونج اٹھے "کیا کرو گے تم وہاں جا کر؟ کون پوچھتا پھرے گا تمھیں؟ ان کا ہاتھ بٹانے والے گروپ کے لوگ ...... نیتا۔ کرتا دھرتا..." میرا سر دھیرے دھیرے بھاری ہو رہا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ آج کی اس شب بےداری کو کبھی میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔

صبح ہو گئی اور گاڑی اسٹیشن پہنچنے سے قبل ہی کسی نے بتایا کہ آپا جی چل بسے۔ مجھے ایسا لگا کہ ساری دنیا ایک نقطے پر آ کر رک گئی ہے اور چاروں طرف آنے والی بھانت بھانت کی آوازیں ڈوب گئی ہیں۔ ہمارے خاندان کا ایک روشن چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ ان کے آخری درشن کے لئے ہزاروں لوگ اپنے اترے ہوئے چہرے لئے ان کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دونوں نیتا آگے چلے گئے۔ انھیں لینے کے لئے وقتِ مقررہ پر گاڑی پہنچ چکی تھی۔ مجھے گاڑی جلد نہ مل سکی۔ آپا جی کے دونوں بیٹے میری نظروں کے سامنے کھڑے دکھائی دیتے تھے نہ جانے وہ مجھے دیکھتے ہی کیا کہہ اٹھیں گے؟ وہ ادھ کھلی کلیاں ...... ایک ایک کر کے سبھی میری نظروں کے سامنے آتے اور پھر غائب ہو جاتے۔

آپا جی کے گھر کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ پولیس اور ان کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے لیڈر ان کے گروپ کے سارے آدمی کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ میں نے اپنے لئے راستہ بنا لیا۔ مگر جب گھر میں قدم رکھا تو بہت سارے لوگوں نے مجھے آ گھیرا...... "تمھارا آپا جی سے کیا رشتہ ہے؟ کون لگتے تھے وہ تمھارے؟ کہاں رہتے ہو تم؟" ان بےتکے سوالات کی بھرمار سے میں بھنا گیا۔ آخرکار میں گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر جانے کی خوشی ضرور تھی مگر دوسرے لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے میری روح کوئی دھیرے دھیرے قبض کر رہا ہو۔ دیوان خانے میں کیتا کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ لوگ ہلکے قدموں سے آ رہے تھے۔ کچھ جا رہے تھے ان آنے جانے والوں میں اکثر نیتا، یا اخبار کے ایڈیٹر، فوٹوگرافر، آخری سفر کی تفصیلات حاصل کرنے والے نامہ نگار تھے۔ اس کے بعد آخری درشن کے لئے ان کی لاش کو سامنے کی طرف لا کر رکھ دیا گیا۔

آپا جی کے آخری درشن کر لئے۔ اور میں نے ان کی راہ چھوڑ کر ایک الگ راستہ اختیار کر لیا۔ میں نے سوچا تھا ماں جی، آپا جی کا سر اپنے زانوں پر رکھے بین کر رہی ہوں گی، جو زار و قطار رو رہی ہوں گی اور دونوں بچے...... "لیکن یہ سب کچھ کہاں تھا؟ آپا جی اکیلے ہی، ایک اکیلے ......؟ میں ان سے اور قریب ہو گیا۔ آپا جی کا ایک شاگرد ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ان کی جگہ سنبھالنے والا نیا نیتا دھیرے دھیرے پاٹھ کر رہا تھا اور مالا جپ رہا تھا۔ ان کے چاروں اور جتنے بھی چہرے تھے، سارے کے سارے نئے تھے اور بالکل اجنبی! اور جن کا آپا جی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے اپنا سر جھکایا، اور تب پیچھے کی جانب مڑ گیا۔ زینہ طے کر کے دالان کا راستہ لیا۔ دالان میں آپا جی کے سوتیلے بھائی سے مڈبھیڑ ہوئی انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کب آئے؟"

"ابھی ابھی آ رہا ہوں"

"اور تم؟"

"کل ہی صبح کی گاڑی سے"

"اور ماں جی ——؟"

انھوں نے دیو گھر (پوجا کا کمرہ) کی طرف اشارہ کیا۔ میں پوجا گھر کی جانب مڑ گیا۔ سوتیلے بھائی، مگر کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ دونوں سوتیلے بھائی ہوں گے۔ کبھی ایک نے دوسرے کی شہرت کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ دونوں ہی اپنے کاموں میں مگن۔ دیو گھر کے کونے میں آپا جی کی بیوہ اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے خاموش نظروں سے دیو گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے اس کے پیر چھوئے اس نے میری طرف بالکل نہیں

دیکھو۔ مجھے پہچاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ اپنے ہی غم میں ڈوب گئی [illegible] سونی نظروں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ غم کا اتھاہ سمندر!۔

[illegible] مجھے محسوس ہوا کہ ساری کائنات یکایک بدل گئی ہے۔ ماں جی [illegible] گھر کی جانب آ رہی تھیں۔ انھوں نے آپا جی کے لئے سب کچھ برداشت کر لیا تھا۔ جدائی، بھوک، طرح طرح کی افواہیں، ذمہ داری اور نہ جانے کیا کیا! البتہ انھوں نے آپا جی کو سب کچھ دے دیا۔ سکھ ان کی جھولی میں ڈال دیئے اور خود ساری عمر آپا جی کا پیچھا کرتی رہیں ان کے تیتے جیم دوڑتی رہیں۔ اور مرنے کے بعد اپنے شوہر کی لاش کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے کا موقع بھی میسر نہیں ہوا [illegible] ایک بڑے نیتا کی بیٹی تھیں اس لئے وہ سب سے الگ ایک کونے میں ماتم کر رہی تھیں درمیانی دالان میں دونوں بیٹے گھٹنے ہوئے چہرے لئے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہے تھے۔ سارے رشتہ دار اندر کی جانب جمع ہو کر آپا جی کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔!

اور باہر لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ ماتم کرنے والوں کی صفیں بچھی جاتی تھیں ان کا ہر دل عزیز نیتا آج ان سے جدا ہو گیا تھا انھوں نے ان کی لاش کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا پھولوں اور آنسوؤں کا نذرانہ دیا جا رہا تھا۔ جنتا کی سیوا کے لئے جس نے اپنا ایک ایک عضو ضائع کر دیا تھا۔ آج بالکل ہی ختم ہو جانے کے بعد ان کی لاش پر بھی ان کی بیوی اور بچوں اور رشتہ داروں کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں نے باہر کی جانب نظریں دوڑائیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے آپا جی بہت سالوں پہلے ہم سے دور جا چکے تھے۔ ان کی بیوی ان کے لئے کب کی مر چکی تھی۔ سارے رشتہ ناطے ٹوٹے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ پھر ہم ان کے لئے ایک الگ طریقہ سے، ایک خاص سلیقے سے کیوں ماتم کرتے پھر رہے؟ کیوں اپنے غموں کا اظہار کرتے پھر رہے؟ آپا جی کی لاش کو اٹھایا گیا۔ لوگ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہے تھے۔ اور میرے دل کی گہرائیوں کے اندر کوئی بین کر رہا تھا" دھیرے دھیرے آنسو بہا رہا تھا! ماتم کر رہا تھا!!!

وینکٹیش ماڈگلکر

دیوا سٹولھار

ابھی ابھی دیپ جل اُٹھے تھے اور کسانوں کی عورتوں نے چولھے جلا کر کھانا پکانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ پورا دن کام کر کے لوٹے ہوئے کسانوں نے اپنے بیلوں کو رسی سے باندھ کر ان کے سامنے کھانے کے لئے چارہ رکھ دیا تھا۔ ماروتی کے دیول کے سامنے لڑکے کھیل میں مست تھے اور کھیل کے درمیان میں بار بار چلاّ اٹھتے تھے۔ سنار کے گھر کے سامنے جو پیپل کا بڑا پیڑ ہے، اس پر کوّے اپنی کریہہ آواز دل میں چلا رہے تھے۔ آپس میں جھگڑ رہے تھے، پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔

چاوڑی کے چاروں طرف گھوم کر دیوا، ہریجن اور مہار، پاٹل کے دروازے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ دیو نے گھنگھرو لگی لکڑی کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور کان پر دوسرا ہاتھ رکھ کر چلاّ اٹھا۔ "کل صبح تعلقہ کے دیوی، ڈاکٹر آنے والے ہیں۔ گاؤں والوں سے التماس ہے کہ وہ اپنے اپنے بچوں کو یہاں لے آئیں اور انجکشن لگوائیں۔" ٹوپیا نے ہاتھ میں جو چھوٹا سا ڈھول تھا تھا، دیوا کی تقریر ختم ہوتے ہی اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ سارے گاؤں والے راضی ہیں نا؟

ٹوپیا نے دیوا سے کہا: "چلو بس اب کافی ہو گیا۔ چلو ہم چلتے ہیں۔"

دیوا نے ہریجنوں کی بستی کا راستہ لیا۔ اور ٹوپیا اپنے علاقہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد دیوا اپنی چھوٹی سی نوکری لے کر دھوبی، چمار، سنار اور لوہاروں کے گھروں کے چکر کاٹنے والا تھا، روٹی کے لئے۔

سچ کہا جائے تو وہ اسی کا حقدار تھا، چونکہ نئے سال سے "منادی" کی لکڑی اس کے کندھے پر آ گئی تھی۔

گاؤں اور سرکار کی نوکری میں وہ اگلے الیکشن تک بندھ گیا تھا۔ وہ اگلے الیکشن کے وقت گاؤں کے پاٹل کے سامنے وہ اپنی لکڑی کسی اور ہریجن کے حوالے کرنے والا تھا۔ اور پھر سولہ سالوں کے بعد اگر پھر اسے موقع دیا گیا تو وہ اسی کام کو سنبھالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کئی سالوں سے یہ رسم جاری تھی اور کئی سال زندہ رہ سکتی تھی۔

سو فیصدی تو نہیں، البتہ دیوا بہت حد تک بہت ہی سیدھا سادا انسان تھا۔ سیدھا سادا اس لئے کہا جائے گا کیونکہ گاؤں کے اور ہریجنوں کی طرح وہ مغرور یا منہ پھٹ نہیں تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں تھیں البتہ اس حد تک نہیں جس حد تک گاؤں کے اور چمار اس مرض کا شکار تھے۔ کبھی کبھار تو ایسی چیزیں دوسرے لوگوں کی وجہ سے بھی آدمی میں سرایت کر جاتی ہیں۔ کنبی، مارواڑی اور برہمن ان لوگوں سے بالکل جانوروں کا سا برتاؤ رکھتے ہیں۔ جانوروں کو چرانا، لکڑیاں توڑنا، جنگل سے گھاس کاٹ کر لانا اور ایسے بہت سارے کام انھیں بنا مزدوری کرنا پڑتے ہیں۔ ان کاموں کے کرنے میں انھیں ایک بھی پیسہ نہیں ملتا۔ کوئی اُجرت نہیں دی جاتی۔ اس لئے اکثر ہریجن منہ پھٹ اور مغرور ہو جاتے تھے۔ مگر دیوا میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا اور قد چھوٹا۔ وہ کبھی بھی کسی کا دل توڑنا جرم سمجھتا تھا۔ اسی لئے صبح سے شام تک کام کرتا رہتا اور شام کو روٹی کھا کر ایک لمبی سی ڈکار لے کر مطمئن ہو جاتا۔ اوروں کی طرح نہ برہمنوں کو گالیاں دیتا اور نہ ہی کبھی منہ چڑھا کر بات کرتا۔ اکثر ہریجن بے گار ٹالنے کے حیلے تراشا کرتے تھے۔ اگر کوئی اُن سے لکڑیاں چیرنے کو کہہ دیتا تو وہ بُرا سا منہ بنا کر کہہ دیتے۔ "یقیناً میں آپ کا حکم نہ ٹالتا۔ مگر میرا یہ ہاتھ بالکل ہی اپنی قوت کھو چکا ہے۔"

جیسے بھینس نے سینگ مارا تھا۔" مگر دیوا بیگار ٹالنے کے لیے کبھی نہ۔ پرا شتا۔ بس کسی کے کہنے کی دیر ہوتی اور وہ کام میں جٹ جاتا اور صبح سے شام تک کام میں مصروف دکھائی دیتا جو کچھ میسر ہوتا حلق کے نیچے اتار دیتا۔ اور سکھ کا سانس لیتا۔ گاؤں کے کام سنبھال کر وہ سرکار کے کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

گھر سے ٹوکری لے آیا اور روٹی کے لئے ہر دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوتا جب وہ سارے گھر گھوم چکا تو اپنے گھر کا راستہ لیا۔ کڑوے تیل کے دیے کی روشنی لیپی ہوئی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ چھوٹا لڑکا، ایشورا اس دیے کی روشنی میں دیواروں پر اپنی انگلیوں کے اشارے سے ہرن کی تصویر بنا رہا تھا۔ تائی اس کی بہن درمیانی حصے میں بیٹھی ہوئی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی، رانی، دیوا کی اردھانگنی ہے، جو چھوٹے پرہلاد کو دودھ پلا رہی تھی۔ جب بھی وہ گھر میں چلا کرتی، زور زور سے پاؤں پٹکا کرتی۔ اور جب باتیں کرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی مالے دار کی بیوی محو گفتگو ہے۔ وہ بھی صبح سے شام تک کام میں مصروف رہتی اور وقت آنے پر کلہاڑی لیکر لکڑیاں توڑنے کے لئے گھر سے نکل پڑتی۔ دیوا اپنے گھر کے سبھی لوگوں سے بے حد پیار کرتا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی کہ اس کے پیار کا جواب ہمیشہ پیار سے ہی دیا جاتا۔

چولھے میں آگ تھی، اس میں قدرے دھواں بھی تھا۔ کھنگ کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

دیوا کے گھر میں داخل ہوتے ہی رانی نے بچے کو نیچے بٹھا دیا۔ اور دیوا سے مخاطب ہوئی۔

"ترکاری تیار ہے، تم روٹی کھا سکتے ہو۔"

روٹی کا نام سنتے ہی ایشورا نے تصویریں بنانا بند کر دیں اور ناک پونچھتے ہوئے ماں کے نزدیک آکھڑا ہوا۔

"ماں مجھے بھی بھوک لگی ہے"

اسی وقت تائی نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اپنے پیٹ کا طبلہ بجاتے ہوئے کہا "ماں مجھے بھی۔"

دیوا نے ہاتھ پاؤں دھولئے رانی نے سالن کی کٹوری میں سالن انڈیل دیا اور اسی کے قریب ہی دیوا براجمان ہوگیا، اس نے ٹوکری میں سے روٹی نکال لی اور سالن کے کٹورے میں ڈبو دی۔ تائی اور ایشورا نے بھی اپنی اپنی روٹی لے لی اور کھانا شروع کر دی۔ رانی نے بھی چھوٹے پرہلاد کو اپنے قریب بٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ کھاتے کھاتے اس نے پوچھا۔ "کل کون ما[illegible]ٹر رہا ہے؟" کون سا آئے گا؟"

بڑی ڈاکٹر۔ بیضیوں کی چیر پھاڑ کرنے والا۔ اس روگ کو مٹانے والا۔ دیوا نے جواب دیا:

"تو پرہلاد کو بھی انجکشن لگوانا ہوگا۔"

"جی ہاں لگوانا ہی چاہیئے۔

"میں نہیں لگواؤں گی۔ کل جب چاند نکلے گا اور چاندنی چھٹکے گی تو مجھے آپا پراہمن کے کھیتوں میں جانا ہے کام کرنے کے لئے۔"

دیوا نے پوچھا "اور تیرے لئے روٹی کا کرا؟"

رانی نے اپنا لقمہ نیچے ہی رکھ دیا، اور کہا۔ "کل جمعرات ہے نا؟"

دیوا جہاں محنتی تھا، خوددار بھی تھا اور مذہبی بھی تھا۔ اس لئے وہ ہر جمعرات کو اپاس کرتا۔ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاتا۔ دن ڈھلتے ہی رانی کچھ میٹھا پکا دیتی۔ اور دیوا میٹھا کھا کر اپنا اپاس توڑ دیتا۔ رانی کے یاد دلاتے ہی اس نے کہا "ہاں میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اس دیو کی ڈاکٹر کی گڑبڑی میں۔"

رانی بھولی نہیں سمائی۔ اس نے میٹھے میٹھے پرہلاد کو چوما اور قدرے فخر کے ساتھ دیوا کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

ایشورا جو پانی پی رہا تھا پانی پیتے پیتے رک گیا اور اپنے باپ سے پوچھ بیٹھا "کیا مجھے بھی انجکشن [illegible] جائے گا۔"

ہری جنوں کے سب ہی لڑکے بڑوں سے ایسے اور کارے سے ہی مخاطب ہوتے ہیں۔

"تم تو بالکل گدھے ہو۔ ابکیس کیا انجکشن لگوانا ضروری ہے؟ "جس وقت تم پرہلاد کے جتنے تھے، اس وقت تمہیں ٹیکہ لگوایا جا چکا ہے۔"

ایشورا نے اپنے ٹیکے کا نشان دیکھا اور تائی نے بھی، پھر دونوں نے اپنے اپنے بازوؤں کا مقابلہ کیا یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کی پھلیاں زیادہ ابھری ہوئی ہیں۔ کھانے سے فراغت حاصل کرتے ہی دیوا نے اپنی لکڑی سنبھال لی۔ اور تختے کی طرف روانہ ہوگیا۔ تختہ ہریجنوں کی

ایک مخصوص عمارت تھی۔ فرصت کے لمحات میں ہر کوئی یہاں آکر دم لیتا تھا صحیح کہا جائے تو ایسی عمارت ہر ہریجن وسَتی میں دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ عام گھروں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ چونکہ جہاں باقی گھروں پر صرف چھپر دکھائی دیتا ہے وہیں اس عمارت پر کھپریل پڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس عمارت کو کہیں سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ اس عمارت پر بھی سفیدی کردی گئی تھی۔ نمبر لکھوایا گیا تھا اور تعلقہ کے پینٹر رگھوناتھ سنار کے ذریعہ ایک دیوار پر ڈاکٹر امبیڈکر کی تصویر بھی بنوائی گئی تھی۔

دیوا جس وقت منتر میں داخل ہوا اس وقت دوسرے سات آٹھ ہریجن دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا دیا روشنی پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا اور قدرے گورا، ماروتی سماج سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے چار کتابیں پڑھی تھیں اور کچھ دنوں بمبئی رہ کر آیا تھا۔ اس لئے اسے بہت ساری باتوں کا پتہ تھا۔ سارا ہریجن محلہ اسے ماروتی انجینیر کہہ کر پکارا کرتا۔ ان کے دلوں میں اس کے لئے بہت عزت تھی۔ دیوا بھی ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اور ماروتی کی باتیں سننے میں محو ہوگیا۔

"اب انگریزوں کا راج نہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کانگریس سرکار نے راج چھین لیا ہے۔ اور اب نہرو بابا اور گاندھی بابا سب سے بڑے نیتا ہیں۔ راج اب انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ گاندھی بابا بھی ایک نئے مہاراج کے اوتار ہیں۔ ان کے یہاں چمار، مہار، منار، ہریجن، برہمن میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے یہاں سب برابر ہیں۔"

دیوا کے دل میں یہ بات فوراً اتر گئی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ گاندھی بابا اور نہرو بابا کے سامنے اسی وقت اپنا سر جھکا لیا اور ماروتی سے پوچھ بیٹھا "اس میں کوئی بات جھوٹ تو نہیں نا؟"

"تم لوگوں کو جھوٹ سنانے سے مجھے کیا ملے گا؟ اب تو ہم ہریجنوں کے بھی اچھے دن آئیں گے ہم سے کوئی دور نہیں بھاگے گا ہمارا ہاتھ اس کے جسم کو لگنے پر اب وہ اشنان نہیں کرے گا۔ اپنا وہ ذات والا بابا امبیڈکر وہ بھی تو ایک نہرو اور ایک گاندھی کے جسم کے قریب بیٹھا کرتا ہے۔ اسی کے کہنے پر تو ہندواری کے ہری بوا کو ان دونوں سے ملوایا گیا۔ بابا امبیڈکر ہم لوگوں کو اپنی اولاد کے برابر سمجھتے ہیں۔"

"یعنی اب ہمارے بچے بھی تعلیم پا کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جائیں گے۔ اور اب ہمیں گیند کی طرح اُنچھالا نہیں جائے گا۔" کوئی آدمی درمیان ہی میں بول پڑا۔

"یقیناً اب ہمارے اچھے دن آجائیں گے۔ لیکن کچھ سالوں کے لئے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

دیوا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بابا امبیڈکر کو پرنام کیا۔

دیوا سے نہ رہا گیا اس نے پھر کہا "یعنی اب تو ہمارا بھی کوئی رکھوالا ہے؟"

"ہاں دیوا! وہ دن دور نہیں جب ہم میں اور برہمنوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ کوئی فرق نہیں سمجھا جائے گا۔" ماروتی نے جواب دیا۔

رندھے ہوئے گلے سے دیوا نے کہا "ماروتی تمہارے منہ میں گھی شکر۔"

اس کے بعد بحث کا موضوع بدل گیا۔ دیوا دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ اس کی آنکھوں پر نیند کے سائے اترنے لگے۔ اس نے اپنی لکڑی تھامی اور گھر کا راستہ لیا۔ امبیڈکر بابا، گاندھی اور نہرو کے بہت قریب بیٹھتے ہیں یہ سن کر اس کا پورا انگ خوشی کے مارے ڈول رہا تھا اور اسے اپنے بیٹوں ایشورا اور پرہلاد کا مستقبل شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

دیا بجھا کر رانی اور بچے سو گئے تھے اندھیرے ہی میں دیوا گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے ہلکے سروں میں رانی اور ایشورا کو آواز دی اور پوچھا "کیوں سو گئے؟"

رانی نے کروٹ بدلی اور کہا "قدم سنبھال کر رکھنا بچے درمیانی حصے ہی میں ہیں۔ ورنہ ان پر پاؤں پڑ جائے گا۔" دیوا ایک ایک قدم رکھتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اپنی پگڑی نکالی اور سر کے نیچے رکھ لی۔ رانی نے ایک پرانی پھٹی ہوئی چادر اس کے جسم پر ڈال دی۔ جمائی لیتے ہوئے دیوا نے کہا "علی الصبح جگا دینا چاوڑی پر ڈاکٹر آنے والا ہے لوگوں کو جمع کرنا ضروری ہے۔"

رانی نے علی الصبح اسے جگا دیا۔ اس نے اپنی پگڑی سنبھالی اور چاوڑی کے ارد گرد صفائی شروع کردی۔ صفائی کے بعد دھول سے اٹے

ہوئے ہاتھ اس نے پانی سے دھو ڈالے اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں سے نہانے کے لئے نہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

پو پھٹ گئی اور دھیرے دھیرے ایک ایک کونا روشنی سے منور ہوتا گیا۔ سورج نکلا۔ ایک بیل گاڑی ہریجن واڑی کے قریب آ کر رک گئی۔ کلکرنی اور پاٹل نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر کو پرنام کیا۔ مگر ڈاکٹر نے قدرے لاپروائی سے ہی سلام کا جواب دینا مناسب سمجھا۔ وہ بیل گاڑی سے اترا نہیں۔ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا اور گاڑی دھیرے دھیرے چاوڑی کی طرف روانہ ہو گئی۔ کچھ بچے اور کچھ بیکار لوگ گاڑی کے آگے پیچھے چلتے رہے اور تماشہ دیکھتے رہے۔ سفید شرٹ اور آدھی پتلون پہنے ہوئے ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور لوگوں کا سلام قبول کر لیا۔

پھوگلے نے چاوڑی میں جاجم بچھا دی تھی جس پر جگہ جگہ سیاہی کے دھبے تھے۔ اس کے پاس ہی ایک بیٹھک جما دی تھی۔ اور دوات کالی سیاہی کے ساتھ ساتھ ایک قلم کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔ سوختہ نہیں تھا اس لئے بانکائی کالی ریت لائی گئی تھی۔ فرش کے ساتھ ساتھ دو چار چوپڑیاں بھی جمع کر دی گئی تھیں۔

ڈاکٹر چاوڑی میں براجمان ہو گئے اور پاٹل سے مخاطب ہوئے "دوپہر کے اندر اندر سارا کام ختم ہو جانا چاہئے۔" پاٹل دوڑتے دوڑتے باہر آئے اور انھوں نے دیوا کو آواز دی

سچ کہا جائے تو دیوا ہر وقت چاوڑی کی سیڑھیوں سے لگا بیٹھا رہتا تھا۔ مگر اس وقت آکارام نے تمباکو کے لئے اپنی جیب [illegible] کھینچ لیا تھا اس نے اپنی چھوٹی سی ڈبیہ کھولی اور اپنے [illegible] آکارام کو پیش کیا۔

اسی وقت پاٹل چلّا اٹھا۔ آکارام نے دیوا سے کہا "سالے اسی وقت چلے جاؤ۔ دیکھو پاٹل چلّا رہا ہے۔" دیوا پاٹل کے قریب جا کر کھڑا ہوا "کہاں گیا تھا مرنے کو؟ جا اسی وقت اور لوگوں کو [illegible] بچے چاوڑی پر لے آنے کے لئے گاؤں میں آواز دیدے۔" جب سے بیل گاڑی گاؤں میں داخل ہو گئی تھی۔ گاؤں کی عورتوں میں کھلبلی مچ گئی تھی، ہر ایک کے چہرے پر مایوسی کے آثار تھے۔ ان کا ٹیکہ لگوانے پر کوئی وشواس نہیں تھا۔ اور وہ ہمیشہ ہی یہ سمجھا کرتی تھیں کہ ٹیکہ لگوانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہر عورت گھبرائی ہوئی تھی اور دوسری سے اپنا حال پوچھ رہی تھی۔ سمجھ کے مطابق ٹیکہ لگوانے سے فائدہ کی بجائے نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ آٹھ دس روز بخار آتا ہے اور کبھی کبھار تو بچہ ہاتھ سے بھی کھونا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ ہر ممکن کوشش کرتی رہیں کہ کس طرح یہ موقع ٹل جائے۔ بیچارہ آوازیں لگانے والا دو چار پھیرے بھی لگا جاتا تب بھی کوئی عورت اپنا گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوتی۔ آج بھی یہی ہوا۔ بار بار تاکید کرنے کے باوجود بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی میں پانچ چھ عورتیں ہی آ کر اپنے بچوں کو ٹیکہ لگوا کر چلی گئیں۔ ڈاکٹر نے جب یہ حال دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا، قدرے مزاج کا چڑچڑا بھی تھا۔

"پاٹل لگتا ہے تمھارے گاؤں پر تمھارا کوئی رعب نہیں۔ سالے لوگ سبھی حرامی ہیں۔"

پاٹل باہر آ گئے اور ڈھنڈورچی دیوا کو آواز دی۔ اور آواز کے ساتھ چار پانچ گالیاں۔ اور گالیوں کے بعد پھر سے اسے ایک بار گاؤں میں جانے کی صلاح دی۔

"سبھی لوگوں سے کہہ آ [illegible]"

"کتھا سنانے کی کوئی ضرورت نہیں یہ سرکاری کام ہے سمجھے۔

اٹھ اور چلتا پھرتا نظر آ۔"

دیوا نے پھر سے اپنی لکڑی سنبھالی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اس درمیان میں دو تین لوگوں نے دیوا سے [illegible] پھر ایک بار گاؤں کا چکر کاٹ کر دیوا چاوڑی پر واپس آ گیا۔

ڈاکٹر پاٹل کے گھر سے مرغی کھا کر اس وقت سفید بیڑی پھونک رہا تھا اور آرام کرنے کے لئے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دی تھیں۔

دیوا کا پیٹ خالی تھا اور اس پر کڑی دھوپ میں گھومتے رہنے کی وجہ سے اس کا کالا رنگ اور بھی کالا ہو گیا تھا اور اس کی پھٹی پرانی قمیص پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

پاٹیل پھر ایک بار چلاتے ہوئے باہر آگیا ۔ "اب ذرا ان اوپری راستوں پر بھی آؤ ۔ دیہی ٹکا رام اور رانا کے گھروں کی طرف سے ۔ کچھ کسانوں نے اپنے گھر کھیتوں سے قریب ہی بنا لئے تھے تاکہ گاؤں سے آنے جانے میں دقت ہو اور نہ ہی وقت برباد ہو ۔ اب دیوا کو ان کھیتوں کی طرف بھی جانا لازمی تھا ۔ چونکہ سرکاری نوکری میں کوئی حکم ٹالا نہیں جاسکتا ۔ دیوا نے ڈنڈا سا سنبھالا اور کھیتوں کی طرف روانہ ہوگیا ۔ راستے میں نہر پڑتی تھی ۔ نہر پر اس نے پیاس بجھائی تب کہیں اس کی جان میں جان آئی کسانوں کی اس بستی میں پہنچتے ہی ایک نے کہا "جاؤ اور ان سے کہو بستی میں کوئی نہیں سبھی پنڈھر پور چلے گئے ہیں" وہاں سے جب وہ باہر کے باغ میں پہنچ گیا تو بارے کی بیوی نے جھڑک کر کہا "ڈاکٹر سے کہہ دو ٹیکہ لگوانے کے لئے وقت نہیں ہے ۔ ٹیکہ لگوانے آجاؤں گی تو یہاں مرچیاں کون توڑے گا ڈاکٹر یا پاٹیل کی بیوی ؟ ـــــ"

وہاں سے جب وہ ٹکا رام کے گھر کی طرف گیا تو ٹکا رام لکڑیاں چیر رہا تھا اس نے دیوا کو دیکھتے ہی کلہاڑی اس کے ہاتھوں میں تھمادی ۔ دیوا نے کہا ۔ "وہاں پر بہت کام ہے ۔ عملدار میری جان لے لیگا ۔"

"کون سا عملدار ؟ کاہے کا عملدار ؟" بیس پچیس منٹ کے بعد دیوا کو جانے کی اجازت مل گئی ۔

جب دیوا گاؤں واپس ہو ۔ تو تیسرا پہر بیت رہا تھا ۔ اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں صرف شعلے ہی شعلے ہیں ۔

چاوڑی پر آتے ہی دیوا نے ڈاکٹر سے کہا ۔ "ساری جگہ گھوم آیا ہوں ایک بھی گھر نہیں بچا ۔" ڈاکٹر کا پارہ چڑھا ہوا تھا ۔ کتے کی طرح بھونک پڑا ۔

"ہریجن کی ذات ہے نا ! حرامزادے تو کہیں گیا ہی نہیں ہوگا کسی کے ساتھ گپ ہانک رہا ہوگا اب آیا ہے اور اپنی صفائی پیش کر رہا ہے ، تعجب کی بات ہے صبح سے اب تک صرف دس بارہ عورتیں ہی اپنے بچوں کو یہاں لے آئی ہیں ۔ کیا باقی سبھی ایشور کو پیاری ہوگئیں ہیں"

"سرکار میں جھوٹ نہیں بولتا ۔ میں سبھوں کے پاس ہو آیا ہوں ۔"

"حرام خور اس پر زبان چلاتا ہے ۔ تم لوگوں کو تو صبح سے شام تک اٹھتے بیٹھتے پیٹنا چاہئے جب کہیں جا کے دھاگے کی طرح سیدھے ہو جاؤ گے ۔" ڈاکٹر کا لہجہ ترش سے ترش تر ہوتا گیا ۔ آخر اس نے زور زور سے گالیاں دینا شروع کر دیں ۔ ہریجنوں کو برا بھلا کہا ۔ جوں جوں اس کی آواز بڑھتی گئی گاؤں کے لوگ جمع ہوتے گئے اور پاٹیل اور کلکرنی چاوڑی کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے ۔

لکڑی اپنے ہاتھ میں تھامے دیوا صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا ، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں پھرنے لگیں اور لال ہوتی گئیں ۔ ناک کا احاطہ چوڑا ہونے لگا اور دانت سے دانت بھنچنے لگے ۔ اور ہاتھوں پر رعشہ طاری ہونے لگا ۔

اسی وقت پھر ایک بار ڈاکٹر چلا اٹھا ۔ "اب کیا سن رہے ہو نہیں ..... ؟"

دیوا فوراً چاوڑی کی سیڑھیوں سے نیچے آنگن میں اتر آیا اپنا پھٹا ہوا جوتا ہاتھوں میں لے لیا اور کہا "اب اتر آؤ تاکہ گالیاں دینے والے اس منھ کی پھر لور مرمت کرسکوں ۔ کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو ؟ ڈاکٹر جبڑے اکھاڑ کر رکھ دوں گا ۔"

دوسری شام کو جب ہریجن معمول کے مطابق چاوڑی پر جمع ہوگئے تو لوگ کل کی واردات پر بحث کر رہے تھے ۔ دیوا ہی ان کی گفتگو کا موضوع تھا ، ہر ایک کو تعجب ہو رہا تھا کہ دیوا اتنا غریب خاموش طبع ہونے کے باوجود بھی آخر اس میں اتنی ہمت کہاں سے پیدا ہوئی ۔ اس نے اتنی جرأت کیسے کی ؟" دیوا ایک کونے میں بیٹھا بغور سن رہا تھا ۔ ایک نے کہا ۔ "دیوا کیا تم بھنگ کھا کر آئے تھے یا شراب پی کر جو تم نے سبھی لوگوں کے سامنے اپنا جوتا نکال کر صاحب کو للکار رہے تھے ۔ اب وہ جا کر بڑی سرکار سے تمہاری شکایت کرے گا اور تم یوں ہی دو سال کے لئے جیل میں ٹھونس دیئے جاؤ گے ۔"

"کوئی پرواہ نہیں وہ پاک دلی تک چلا جائے میں ، صاف صاف پوچھوں گا ۔ اپنی سرکار سے ، کیا اسی لئے ڈاکٹر کو ہم ہریجنوں کی ماں ، بیوی اور بہن کی عزت لینے کے لئے یہاں بھیجا تھا ۔ ہمیں گیند کی طرح اچھالنے کے لئے یہاں روانہ کیا تھا ؟"

"اور جب پاٹیل تم کو گالیاں دے رہا تھا اس وقت کیوں تم خاموش کھڑے ہوئے سن رہے تھے ؟"

" پاٹیل جہاں دو جوتے مارتے ہیں پھر اپنے سینے سے بھی لگا لیتے ہیں یہ کم بخت کہاں سے آیا تھا ؟ کہاں جائے گا ؟ کوئی نہیں جانتا ۔

یہاں آیا اور آتے ہی لگا ہم غریبوں کو اچھالنے۔ جانے دو سرکار دیوال پر ہمارا بھی تو کوئی رکھوالا ہے، دیکھ بھال کرنے والا ہے ہماری عزت کا خیال کرنے والا ہے۔"

اس طرف بہت دن بیت گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے دیوا پر مقدمہ چلوا کر اُسے سزا دلوا دی ہے ——— ——— ——— رانی مزدوری کر کے اور برتن صاف کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ گاؤں اپنے پرانے ڈھرّے پر واپس آ گیا ہے۔ ڈھنڈورچی کا کام دیوا کی جگہ دوسرے ہریجن کے ذمّے کر دیا گیا ہے۔

اور اس نو سو آدمیوں کے اس چھوٹے سے دیہات کے اس دیوا نامی خاموش طبیع محنتی اور ایماندار ہریجن کا کیا ہوا، اس سے کیسا سلوک کیا گیا۔ اسے جیل میں کیوں ٹھونس دیا گیا؟ یا یا اسے ڈاکٹر! آج تک ان باتوں کا پتہ نہیں اور دیوا سے متعلق کوئی خبر اُن تک پہنچنے کی امید نہیں ——— پتہ نہیں ایسا کیوں ہے؟

وجے تینڈولکر

پیراسٹم

آج میں بہت ہلکا پھلکا پن محسوس کر رہا ہوں۔ پچھلے کئی سالوں سے مجھ پر ایک بوجھ سا تھا اور اس لئے برسوں اس ہلکے پن سے میں دور تھا۔ معمول کا ایک بھاری بھرکم بوجھ، دل اور دماغ میں اٹھتے ہوئے شعلے جیسے یکایک مدھم پڑ گئے ہوں۔ زندگی کی بیماری جیسے دفعتاً ختم ہو گئی ہو یا ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی بالکل الگ کوئی بات ہو گئی ہو یا جیسے آج سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ اس کا اظہار میرے لئے بہت مشکل ہے اور زندگی آج اس وقت!

آج میں بالکل آزاد ہوں۔ اور یہ دونوں کی آشنا سا گاڑی میں بیٹھا اس وقت میں اس نرسنگ ہوم کو دیکھ رہا ہوں جس میں تم اس وقت موجود ہو۔ تم اس وقت جس کمرے میں پڑی سوئی ہو اس کمرے کی کھڑکیوں کو میں بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ اور سچ کہا جائے تو تمہارے کمرے کی کھڑکی سے میں ناواقف ہوں البتہ یہاں سے میں سڑک کی ساری کھڑکیاں دیکھ سکتا ہوں۔ اور اسی میں ایک کھڑکی ہے تمہارے کمرے کی۔ ہر کھڑکی کے لئے ایک سفید پردہ اور اس کے اندر سفید کمرہ، کمرے کے اندر ایک نئی کھاٹ، کھاٹ پر بالکل سفید نئی چادر اور اس چادر پر لیٹی ہوئی تم۔ بالکل سفید!

ویسے جب تک مجھے تمہارے کمرے کی کھڑکی کا پتہ نہ چلتا مجھے پھر کو چین نصیب نہ ہوتا۔ اور میں تمہارے قریب ہی دھڑکتے دل کو سنبھالے بیٹھا رہتا، ایک سے ایک اور بڑے بڑے ڈاکٹر کو بلواتا۔ اور ہر قسم کی دوائیں مہیا کرتا۔ اور تمہارے لئے ہر قسم کا آرام مہیا کرنے کے باوجود کبھی دل میں یہی سوچا کرتا کہ ابھی تک میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا ——— میں ہمیشہ ہی تمہارے لئے سب سے اونچی چیزیں خرید کر لایا ہوں۔ ہر چیز معیاری اور اونچی اور اس سے کم قیمت پر کوئی بھی چیز میں نے تمہارے لئے نہیں خریدی۔ دی بیسٹ (The beat) اور وہ سب کچھ اس لئے چونکہ تم سے بے حد پیار تھا۔ — تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ محبت کی آگ سینے میں بھڑک اٹھی تھی۔ محبت کا ایک جاری جنون بوجھ مجھ پر آ پڑا تھا۔ ہر روز اس جاگتی محبت کا صرف ایک ہی کام رہتا تھا۔ دن بھر کے چوبیس گھنٹے، مہینے کے تیس دن اور سال کے بارہ مہینے جس کے لئے کافی نہیں ہوتے تھے (Oh God! how the year passed) تو کسی مشین کے پہیے کی طرح یہ آٹھ سال بہہ گئے۔ ٹو بی ایگزیکٹ (To be exact) آٹھ سال پانچ مہینے اور تیسرا دن! گیارہ جولائی کو صبح گیارہ بجکر چار منٹ پر ہمارا بیاہ ہو گیا۔ اس وقت گیارہ چونتیس ہو رہے ہیں سات سیکنڈ، آٹھ، نو، دس ——— ٹن! آٹھ ختم ہو گیا پھر بھی وقت کا حساب کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑھتا ہی جاتا ہے ——— تمہیں نرسنگ ہوم میں لا کر رکھے ہوئے دو گھنٹے ستر منٹ اور تینتیس سیکنڈ ہو رہے ہیں۔ اور تم سے آخری بار ملے ہوئے پورے تین منٹ ——— جس وقت میں اپنے فلیٹ سے باہر گیا اس وقت According to my watch سات بجکر پچاس ہو رہے تھے۔ میں نے وقت کی گھڑی دیکھی اور اس کے بعد لفٹ سے نیچے اتر آیا۔ پھر سے کبھی نہ لوٹنے کے لئے!

سبھی کچھ عجیب ہے اس کے باوجود بھی اپنی سوچ کے مطابق ہے اور جس وقت تمہیں بیدار کیا جاتا تھا اور ہر زخم سہہ کر چپ ہو لیتا وہی خاموشی یہاں بھی قائم ہے! (I am perfect) جو کچھ مجھے

پسند ہے اس میں کسی قسم کا کوئی نقص برداشت نہیں کرسکتا۔ غرور مجھے نہیں بھاتا
غلطی مجھے پسند نہیں اور میں اپنی ہتک کبھی نہیں برداشت کرسکتا۔
I was always the victor, the first in the line, only one who was chosen
مجھے بہت ہی کم چیزیں پسند آتی ہیں، اور جو پسند آجاتی ہیں انھیں کسی بھی
قیمت پر میں حاصل کرلیتا ہوں۔ اور جب انھیں چھوڑنے اور کھونے کی نوبت
آجاتی ہے تو اس میں بھی میں پیچھے نہیں ہٹتا۔ جیسے اب میں نے تمھیں
چھوڑ دیا ہے۔ چونکہ مجھے مقابلہ پسند نہیں۔ جو کچھ ہوں میں ہوں، صرف میں
بالکل اسی طرح میں اب تک زندہ رہا ہوں اسی لئے میں نے تمھیں چھوڑ
دیا ہے۔ تمھیں چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ بالکل ناممکن تھا میرے لئے۔ شاید
اس سے چند دنوں قبل مجھ سے کوئی کہتا تو بہت ہی مشکل ہو جاتا یہ۔۔۔
"It is the only real thing in the world" لئے
میں تم سے اور تم مجھ سے آزاد ہو چکی ہو۔۔۔ اور اس وقت میں اس گھر میں
بیٹھے ہوئے اس ڈرائنگ روم کو دیکھ رہا ہوں جس میں تم ہوتی تھیں ساتھ
رہی ہو۔۔۔ تمھارے ساتھ بھی اس وقت کوئی اور ہی ہے۔ سب کچھ عجیب
سا لگ رہا ہے۔ سبھی کچھ نرالا اور حیرت انگیز اور اس کے باوجود بھی یہ سب
کچھ صحیح ہے Truth is stranger than fiction. It's
all right! خلش یہی کہ ہم دونوں پورے
آٹھ سال ایک دوسرے میں کھوئے، دیوانہ وار پیار کرتے رہے۔ کم از کم
میں تو ویسے ہی زندہ رہا۔۔۔ لگتا تھا جیسے تم بھی اسی طرح زندہ ہو،
لیکن آج اس بات پر میرا کوئی بھروسہ نہیں۔۔۔ البتہ میں صرف تمھارے
لئے زندہ رہا اور ان آٹھ سالوں کے عرصے میں تمھارے اردگرد رہا۔۔۔
تمھارے سوائے میری کوئی اور دنیا ہی نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو وہ تمھاری
وجہ سے ہی۔۔۔ میرے لئے سب کچھ تمھیں تھیں صرف تم ہی! میں
خدا بنا نہیں تھا۔ اور جو کچھ تھا تمھارے لئے تھا لیکن یہ سب کچھ یک طرفہ
تھا۔ اور آخری ایام تو جرم سے کم نہیں تھے۔
میں یہ تو کبھی نہیں کہوں گا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا، وشواس گھات
کیا۔ ایسا کہنا ہی میرے لئے ایک جرم سے کم نہیں ہے۔ سچ کہا جائے تو یہ
انصاف کی بات بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ سچ ضرور ہے کہ دھوکا میں نے

اپنے آپ کو دیا۔ میں نے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔ میں نے ہی تمھیں
وشواس گھات کرنے پر مجبور کیا۔ تم پہلے بھی بے گناہ تھیں اور آخر میں بھی
غلطی میری ہی تھی Just an error of judgement, but how
devastating, still Rome burning.
آخری شعلے اب بھی آسمان چاٹ رہے ہیں۔۔۔ ابھی بھی۔۔۔۔ !
It's eleven forty three, thirteen seconds
fourteen, fifteen, sixteen, seventeen
سچ کہا جائے، تو اس وقت شہر کی گہما گہمی کے درمیان بنے ہوئے
ایئرکنڈیشن دفتر کی چھٹی منزل سے تمھیں فون کیا کرتا۔ اور نیچے کی دنیا میں
بہتے ہوئے لوگ اور بھیتی ہوئی کاریں دیکھا کرتا۔
"ہیلو ڈارلنگ" یہی پیار سمویا ہوا لہجہ، ہاتھ میں سگار، اور اس کی
راکھ، ایش ٹرے میں جھٹکارتے ہوئے۔ "ایک بار پھر یہی" تمھارا معمول
کا جواب۔ آج وہی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ اور اس کے بعد
ہماری نہ ختم ہونے والی باتیں جو راستے پر کے لوگوں سے شروع ہو جاتی تھیں
اور ملابیلا کے ہوٹل پر آکر رُک جاتی تھیں۔ نئے مہاراج کو گالیاں ملابیلا
کی تندوری روٹیوں پر کتہ چینی۔ پھر ایک آدھ جملہ۔ کل رات کا کیا ہوا۔
ایک آدھ پرانی یاد اور پھر جلد گھر لوٹنے کی تمھاری تاکید۔ "میں منتظر ہوں"!
آج کہانی "That is all, generally."
کو چھٹی، فون کو چھٹی، دفتر کو چھٹی۔ نئے مہاراج کو تو کل ہی سے
چھٹی دے دی ہے۔۔۔ The poor chap will
turn up tomorrow and.... یہ بھی ممکن ہے کہ اسے
کسی اخبار کے ذریعہ اس واردات کا پتہ چل جائے۔ اور اس کا چہرہ یکایک
نوکرانی کا چہرہ۔ پھر اسٹونو، ہوٹل والے کا چہرہ، انسان کا تعجب، شوفر کی حیرانی
حتیٰ کہ لفٹ مین کی بھی! تعجب مجھے بھی ہو رہا ہے اور میں بھی۔۔۔
Reality must be recognised and it should be recognised as early as possible. It saves the cost of unnecessary
trouble and pain. اب سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔
بہت ہی کم بچا ہوا ہے۔ اور جو کچھ بچا ہوا ہے وہ بھی اب قریب الختم ہے۔

تم ابھی تک بے ہوش ہی ہو نا ؟ یا ابھی تک تم آرام سے لیٹی ہو گی ؟ دیکھو علاج میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔ سب سے بڑا ڈاکٹر بلوایا جائے۔ اور دوائیں سب سے مہنگی ہوں جو بھی ممکن ہو کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کا اثر نہیں کے برابر ..... بہت ہی ناممکن ؛ you is doomed

صرف ایک بار ہی میں تمہیں فون نہیں کر سکا تھا۔ دفتر کے سارے فون آؤٹ آف آرڈر تھے۔ پبلک فون سے تمہیں فون کرنا مناسب نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی پرائیوٹ فون دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے بہت سارے فون تلاش کر لئے، مگر ناکام ہو کر وہیں سے میں نے گھر کا رخ کیا، مگر تم گھر پر موجود نہیں تھیں۔ اور نہ ہی باہر جاتے وقت تم نے مہاراج سے کہہ رکھا تھا۔ میں ویسے ہی آفس کی طرف روانہ ہو گیا اور تعجب کی بات، تم وہیں پر میری منتظر تھیں۔ صرف ایک فون کے لئے میری یہ حالت دیکھ کر تم اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکیں۔ نہ جانے اس وقت تم نے کون سا جملہ کہا تھا، مذاق سے پیار سے۔ آج بھی وہی جملہ برابر کانوں میں گونج رہا ہے۔ ایک کانٹا سا رگِ جاں میں چبھا جا رہا ہے۔ آج کا یہ پہلا موقع ہے جب تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ میرے پاس نہیں ہو۔

——— لیکن آج کوئی دکھ نہیں ہے مجھے۔ صرف اتنا ہی جیسے مشین کا کوئی ایک پرزہ نکل کر کہیں جا گرا ہو۔

لیکن ایسا کیوں ہوا؟ زلزلہ تو آ ہی گیا۔ مگر اس کا اثر صرف درخت کی ایک ہی شاخ پر کیوں؟ قیامت کے وقت لمحے بھر میں ہی سبھی کچھ کیوں ختم ہو جائے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ میں نے آج تک تمہیں کوئی دکھ نہیں دیا۔ کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ آخری لمحے تک میں احتیاط برتتا رہا۔ تمہیں کسی بھی چیز کی کمی کا احساس تک ہونے نہیں دیا حتیٰ کہ تمہاری آزادی، اور تمہاری پسند کو بھی سراہتا رہا۔ میں نے ہمیشہ ہی تمہیں خوش رکھا۔ تمہارے لئے میں نے اپنی پسند کو برباد کیا، تمہارے لئے ہی اپنی آزادی کو ختم کر کے تمہارا غلام بنا رہا۔ اپنے آپ کو برباد کرتا رہا۔ میں نے اپنی ساری امیدیں، پسند ناپسند کی ساری چیزیں، اور ذاتی آزادی کا اپنے ہی اندر ایک گڑھا کھود کر اس میں سے ساری چیزیں دفن کر دیں اور اس پر تمہاری آشاؤں اور خوشیوں کے درخت لگائے، پھول اُگائے سرِ ہما نغوں سنگیت سے لگاؤ، آرٹ سے تعلق، کویلوں سے بے جا لگاؤ یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے برداشت کیا۔ حالانکہ ان میں سے مجھے ایک سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر بھی ان تمام چیزوں کو میں نے اپنی روز مرہ کی گھریلو زندگی تک میں برداشت کیا۔ یہ سارے میرے دشمن تھے لیکن وہ سبھی تمہارے دوست تھے۔ اسی لئے مجبوراً تمہارے لئے ان سے مجھے نباہ کرنی پڑی۔ تاکہ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ میں صرف تمہارے ایک دوست کی حیثیت ہی سے زندگی گزارنے میں خوشی حاصل کرتا رہا۔ خوشی محسوس کرتا رہا۔

تمہیں میں نے بے حد آزادی دے رکھی تھی، اس میں کسی قسم کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور تمہاری آزادی کو ذرہ برابر بھی تکلیف پہنچاتے ہوئے میں اپنے آپ کو سنبھالتا رہا۔ تمہیں چاہتے ہوئے بھی ہر بار میں نے خود غرضی کے اصول اپنائے اور تمہاری ہر باریک سے باریک بات کا جائزہ لیتا رہا۔ اور ہمیشہ ہی میں نے یہ کوشش کی کہ تمہاری ہر بات کا سب سے پہلے مجھے ہی پتہ ہو۔ تمہیں اس بات کا کبھی پتہ تک نہ چل سکا کہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جانے کے باوجود بھی میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہا۔ تمہارے نام آئے ہوئے خطوط سب سے پہلے میں ہی چاک کیا کرتا اور پھر انھیں پڑھ کر احتیاط سے بند کر دیتا۔ نوکروں کے ذریعہ تمہارے آئے ہوئے فون کا پتہ چلتا۔ ساتھ ساتھ اس بات کا پتہ بھی وہی دیتے تھے کہ آج گھر پر کون کون لوگ آئے تھے، حتیٰ کہ ہر آدمی کا حلیہ تک مجھے معلوم تھا۔ تم جہاں کہیں بھی جاتی تھیں، میں ٹیکسی لے کر پیچھے پیچھے گھوما کرتا اور گھنٹوں کسی ریستوران سے باہر آنے تک تمہارا انتظار کیا کرتا۔ یہ سب کچھ میں نے کیا۔ چھپ چھپ کر ہر بات کی خبر لیتا رہا۔ آج تم سے کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔

ان تمام باتوں کا مجھے اعتراف ہے۔ میں انکار بھی کرنا نہیں چاہتا۔ بس میں سب کچھ ایک سی آئی ڈی پولیس کی طرح معلوم کرتا رہا۔ اور تمہیں اس میں سے کسی ایک بات تک کا پتہ نہ چل سکا۔ میں نے اس کے پیچھے اپنا بہت سارا روپیہ گنوایا۔ وقت برباد کیا۔ راتوں میں جب تم نیند کی آغوش میں رہا کرتیں میں تمہیں دیکھ کر پہروں سوچا کرتا کہ آج کس ظالم نے تمہارے جسم کو چھوا ہے۔ ایک بار تو اپنے پرانے نوکر کو اس لئے گھر سے نکال دیا چونکہ مجھے اس پر اپنے خطوط چاک کرنے کا شبہ تھا۔ بارہا تم نے اس بات کی شکایت بھی مجھ سے کر دی تھی کہ کچھ اور نرالے آوازوں میں ان دنوں فون آیا کرتے ہیں۔

ایک بار تو اس تمہارے پسندیدہ ریستوران میں اچانک تم سے ملاقات ہونے کی وجہ سے تم نے یوں ہی جھوٹی باتیں اپنی صفائی میں پیش کر دی تھیں۔ اس سے تو میری تسکین کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے تم نے بہانے تراش کر اپنے آپ کو سنبھالا دیا ہو۔ اپنی غلطی کو چھپانے کا ذریعہ تلاش کر لیا ہو۔ تمہارا مجھ پر بے حد بھروسہ تھا اور اس بھروسے کو میں نے کبھی نہ اٹھنے دیا۔ "I am proud of it" اور ایسے نازک قدموں میں بھی ذرہ برابر ٹھیس نہیں پہنچائی۔ بہرحال میں نے تمہیں خوش رکھا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی پچھلے دنوں جو کچھ تم نے کیا وہ کیوں کیا؟ تم نے ایسا قدم کیوں اٹھایا؟ یہ کوئی شکایت نہیں، کوئی تکرار نہیں، اس سوال کے پیچھے کوئی مقصد نہیں کوئی منصوبہ نہیں۔ یہ صرف ایک سوال ہے صرف سوال! ہو سکتا ہے ایک ہی آدمی کے ساتھ رہتے ہوئے تمہارا جی اوب گیا ہو چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو شاید تمہارے لئے میرے سارے گن بیکار ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کی قدر و قیمت گھٹ گئی ہو۔ اگر میں قدرے سخت ہوتا، یا برا ہوتا۔ تو غالباً تم نے ایسا قدم اٹھایا ہی نہ ہوتا۔ میں کچھ نہیں جانتا اس لئے جاننا چاہتا ہوں۔ "I would like to know" کچھ نہ کچھ تو ہوا ضرور۔ البتہ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ What

I object to your kissing, a more looking fellow, or writing a love-letter to some-body who was frustrated.

یہ سب کچھ میں نے برداشت کر لیا۔ ان تمام باتوں کا پتہ مجھے لگ جاتا تھا البتہ تمہیں اس بات کا کبھی پتہ نہ چل سکا کہ میں ان باتوں سے واقف ہوں۔ میں نے کبھی اعتراض بھی نہیں کیا۔ ڈھلتی عمر میں بھی تم بے حد جوان تھیں، دل سے بھی اور جسم سے بھی؛ تمہاری پیاس ابھی بجھی نہیں تھی اور تمہیں اپنی خوبصورتی کا صد درجہ احساس تھا۔ فن سے تمہیں بے حد لگاؤ تھا۔ اس لئے فنکاروں کو اپنے نزدیک کر لینے میں ایک قسم کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ "I would understand it, I would" لیکن اس کے بعد تم بہت آگے بڑھ گئیں، بہت ہی۔ اور پھر میرے اندر چھپے ہوئے سپاہی نے کمر کس تمہارے پیچھے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

۔ بولڈ ڈارلنگ وہ تمہارا افیئر! غالباً اگر میں ایسا کرتا تو تم زندہ بھی نہ رہتیں۔ اس کے باوجود بھی میں دن اور رات ہر لمحہ اس افیئر میں زندہ رہا۔ میں الگ سے جی نہیں رہا تھا۔ ہر بات کی تفتیش کیا کرنا اور جاننے کے لئے ہر لمحہ تمہارے پیچھے بھاگتے رہنا، مسلسل پھر تڑپ تڑپ کر رہ جانا۔ میرا جسم جلنے لگتا۔ ایک قسم کا زہر پی رہا تھا۔ پھر بھی تمہیں اس بات کا پتہ نہ چل سکا۔ خود خوش رہنے کی کوشش کرتا اور تمہیں خوش رکھا کرتا۔ تمہاری آزادی پر کوئی بندش نہ لاتا۔ تم پر کوئی حرف نہیں آیا میں نے کبھی ایک حرف تک ایسا اپنی زبان سے نہیں نکالا جس سے تمہیں تکلیف پہنچتی۔ I wanted to remain perfectly happy, happy as a lark and free یہ سبھی کچھ اس طرح قائم رکھ کر مجھے دکھ برداشت کرنے تھے۔ ممکن ہو سکا تو انہیں ختم کرنا تھا چونکہ وہ میری امید و قوت برداشت سے بہت زیادہ تھے، ٹیسے تھے۔ اس لئے میں نے انہیں ختم کر دیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

ڈارلنگ ہوم کے کیا وَنڈ میں اس وقت پولیس کی ایک جیپ اور تین کاریں کھڑی ہیں تمہارے کمرے کے باہر فضا بے حد بوجھل اور تنگ ہے۔ اور ان باتوں کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ تمہارے کمرے میں اس وقت بے انتہا خاموشی ہے اتنی خاموشی کہ اس وقت تمہاری اکھڑی ہوئی سانس کو بھی ہر کوئی سن سکتا ہے۔ تمہیں آکسیجن پہنچایا جا رہا ہے۔ اس کی ربڑ کی نلیاں تمہاری ناک میں ڈال دی گئی ہیں۔ آج تمہارا اترا ہوا چہرہ۔۔۔۔۔ ! ایسا چہرہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ تمہارے اردگرد سفید پوش کسی ڈاکٹر تیلون کی مانند کھڑے ہیں۔ دو چڑیاں تمہاری کھڑکی پر بیٹھی ہوئی چوں چوں کر رہی ہیں ——— ان کی آواز بھی میں بخوبی سن سکتا ہوں۔ اور وہ رہا ڈارلنگ میری جگہ لینے والا جو تمہارے پاس ہی ہے A frustrated artist خاموشی سے کرسی پر بیٹھے ہوئے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تمہاری موت کے سائے اس کے چہرے پر بھی ناچ رہے ہیں poor fellow. بار بار مر رہا ہے Or is it correct to pay. موت کے لئے جی رہا ہے، میرا بوجھ آج اس کے سر ہے۔ تمہارے سارے دکھ، سکھ

آج اس کے سر پر، سالوں تمہارے ساتھ رہا ہوا پیار آج اس کے ساتھ ہے اور اس کے لئے بھاری ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ ایک بار اپنی گاڑی سے ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا میں نے بار بار تمہیں تاکید کر دی تھی کہ گاڑی آہستہ سے ڈرائیو کیا کرو" مگر اس روز تم اپنے ہی خیالات میں غلطاں تھیں صرف چھوٹ گیا تھا۔ جگہ جگہ پر زخم آئے تھے۔ تم کئی گھنٹے بیہوش تھیں۔ اس وقت میں بھی اسی طرح مر مر کر جی رہا تھا۔ But not willingly میں نے بڑے بڑے ڈاکٹر بلوائے تھے۔ مہنگی دوائیں منگوائیں تھیں۔ نرسنگ ہوم کے زیادہ اخراجات برداشت کر کے زیادہ سہولتیں مہیا کی تھیں۔ تمہارے اتنا ہی بے ہوش رہ کر موت سے لڑ رہا تھا۔ اور پھر تم نے اپنی آنکھیں کھولیں Oh God! اوگاڈ!

what a moment it was

میں اس کے پھر سے زندہ ہو گیا ______________

میں جانتا ہوں وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ بالکل نہیں But anyway, how does it matter now

پولیس افسروں کی سرسراہٹ کو میں بخوبی سن سکتا ہوں۔ انہیں تمہارے اسٹیٹمنٹ کی ضرورت ہے مگر مجھے یقین ہے وہ انہیں مل سکے گا۔

اور میں صرف تماشائیوں میں سے ہوں گویا اس میں میرا کوئی ذاتی حصہ نہیں ہے Also strange, so funny!

سب کچھ دل کے آس پاس خاموش ہے کسی طرح کی کوئی آہٹ نہیں لگتا ہے ساری چیزیں ایک قبر میں دفن کر دی تھیں۔ اور خاموشی صرف اپنی ہی آہٹ سننے کے لئے شانت ہو گئی ہے۔ آدمیوں کے اس بڑبڑاتے ریلے میں اور دوڑتی ہوئی کاروں کی چیخ و پکار میں جیسے سب کچھ شانت ہو گیا ہے The time is quarter-to-wed twelve, nineteen seconds, twenty, twenty-one

کوئی پرواہ نہیں۔ مجھے اپنے آپ سے کہیں دور کرنا ہی تھا جو کہ مجھے مقابلہ نہیں چاہئے تھا nearly one who was always the victor, the first one, the only one who was chosen

میں اپنے آپ کو کسی دوسرے نمبر پر نہیں کھڑا کر سکتا۔ یا پھر جس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ یا پھر ہے، اس لئے اسے قبول کیا جائے۔ یہ بھی میرے لئے بھیانک تھا یا بہت بڑا المیہ تھا۔ تمہیں اپنے آپ سے جدا کرنا بہت مشکل تھا۔ ان آٹھ سالوں کے اٹوٹ بندھن اور بے انتہا پیار الگ کس طرح کیا جائے۔ ؟ کس طرح جنسیت کے دائرے میں اپنے آپ کو داخل کیا جائے، ؟ کس طرح تمہیں مجھ میں سے نفی کیا جائے؟ کس طرح مجھے اپنے آپ میں سے کم کیا جائے، ؟ لیکن اس کے بعد میرے اندر سویا ہوا "میں" جاگ گیا the internal victor

یکایک جیسے میری ساری کمزوریاں دور ہو گئیں اور جو کچھ ہونا تھا وہ صاف صاف دکھائی دیا۔ زندگی کا پورا حساب میرے ہاتھ آ گیا تھا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ بندھی ہوئی گرہ کھل گئی تھی yes, That was The solution, The way-out

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، گیارہ بج رہے تھے، تم میرے قریب ہی گہری نیند سو رہی تھیں۔ تمہاری سانسیں گہری ہوتی جا رہی تھیں تمہارا بایاں کان گلاب کے پھولوں کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ تم نے اپنا ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھ لیا تھا اور دوسرا جسم پر پھیل گیا تھا۔ تمہاری سانس کے ساتھ ساتھ تمہارا جسم اوپر نیچے ہو رہا تھا اور بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس ہاتھ پر پلے سے اپنی انگلیاں پھیر لیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار ایسا کر رہا تھا It was so Thrilling اس کے بعد میں نے تمہاری گردن کے قریب ہی آہستہ سے پھونکا۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

غالباً میں نے ہی بیڈ لیمپ بجھا دیا۔ کپڑے پہن لئے۔ جوتے چڑھا لئے ٹائی کو ٹھیک گلے میں پھنسا دیا۔ لیڈی کلون کا عطر چھڑکا اور پھر فلیٹ کے باہر آ کھڑا ہوا۔ معمول کے مطابق چابیاں اپنے ہی ساتھ لی تھیں۔ مگر اسی لمحے خیال آیا ان کا ساتھ لینا ٹھیک نہیں، مگر ان کا گھر میں رکھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر ہمیشہ کی جگہ پر چابیاں رکھ دیں۔ واپسی پر پھر تمہیں ایک نظر دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھی اور میں نے اسی وقت دیکھا، بیڈ لیمپ جل رہا تھا میں نے اسے بجھا دیا میں نے ہی سب کچھ ختم کر دیا اور

باہر آگیا۔ اس وقت سات بجاس ہو رہے تھے! Of course!
لفٹ نیچے کی طرف according to my watch
جا رہی تھی۔ rather early today

بڑے ڈاکٹر ابھی ابھی نیچے گئے ہیں ان کے ساتھ پولیس انسپکٹر بھی ہے۔ ڈاکٹر آپس میں ایک دوسرے کی اجازت لے رہے ہیں تعجب کی بات ہے مریض زندگی اور موت سے لڑ رہے ہوتے ہیں پھر بھی یہ اتنا لوگ، ایسے نازک وقتوں میں تکلفات برتتے نظر آتے ہیں strange very strange ۔ ڈاکٹر ابھی اپنی کاروں میں جا بیٹھے ہیں اور اب ایک کے پیچھے ایک کاریں رینگتی نظر آ رہی ہیں دو نرسیں ہیں — کمپاؤنڈ بالکل ہی خالی ہو گیا ہے۔ اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی ہے۔ صرف پولیس کی جیپ ابھی تک وہیں کھڑی ہے تمہاری کھڑکی کے باہر چڑیاں شاید خوف کے مارے ہی چونچیں سینے میں چھپائے چپ ہو گئی ہیں ———

Sweet heart sleep in peace گڈ بائی ڈارلنگ

یہ بھی میں نے ہی تمہیں عطا کیا ہے آٹھ سال تک خوبصورت سا جیون عطا کیا، جیسے کوئی انسان گہری نیند سے صبح جاگ جاتا ہے بالکل اسی طرح تم اس زندگی میں سو کر دوسری زندگی میں جاگ جاؤ گی۔ سورگ میں تمہارے چہرے کے جو نقوش ہوں گے وہ میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں I have given you a surprise of your lifetime, but my lifetime too!

تم سے جدا ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ خوشی صرف اس بات کی ہے کہ یہ بھی تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچاتے ہوئے کر سکا۔ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچاتے ہوئے یہ کام بخوبی انجام تک پہنچانا بہت ہی مشکل تھا۔ البتہ اس میں بھی میں کامیاب ہوں۔ اس لئے یہی میری تسکین کا باعث ہے!!!

جی۔ اے۔ کلکرنی

سزا

سچ کہا جائے تو اس وقت شوبھا کو اپنے گھر واپس چلا جانا چاہئے تھا۔ اس کا کام ختم ہو چکا تھا لیکن اسکول چھوٹنے میں ایک گھنٹہ ابھی اور باقی تھا اور قاعدے کے مطابق اس کا وہاں رکنا نہایت ضروری تھا۔ چھتری اور پرس اس نے اپنے قریب کر لیا اور اس ایک گھنٹہ کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو گئی۔

آفس یعنی تین چار الماریوں اور دو تین ٹیبلوں سے بھرا ہوا گنجلک سا کمرہ تھا۔ ان کے قریب ہی بیٹھا کلرک پورا دن نہ جانے کیا کیا لکھا کرتا تھا۔ جو دن بھر مکڑی کی طرح کوئی جالا بن رہا ہو۔ کھڑکی کے باہر گھنی گھاس اُگ آئی تھی۔ شوبھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ میں نے آج تک اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پچھلے چھ مہینوں سے وہ اس اسکول میں کام کر رہا تھا، مگر کوئی بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ ہر شخص آتا اور اس کے سامنے آنکھیں بند کر چلا جاتا۔ کسی کو ایک آنکھ بھر کر دیکھنے تک کی فرصت نہ تھی۔ پچھلی گیدرنگ میں وہ اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی لے آیا تھا دُبلا پتلا قد، موٹی ساڑی میں ملبوس، مگر ہیڈ ماسٹر نے اس کے سامنے ہی چائے کا انتظام گڑبڑ ہونے کی وجہ سے اسے کھری کھری سنائیں بھی تھیں اس بے چاری کو تو بیٹھنے تک کو کرسی نہ دی گئی۔ پھر بھی حرفِ شکایت اس کی زبان پر نہ آیا۔ پتہ نہیں آخر یہ کون شخص ہے؟ پتہ نہیں گھر میں کبھی گرہ کی مانند کھل بھی جاتا ہے یا نہیں؟ کبھی جی کھول کر ہنس بھی لیتا ہے یا نہیں؟ شوبھا کے یہ خیالات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے۔ کلرک نے ایک دو بار اس کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ایک بار اسے محسوس ہوا وہ ہنس رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر سامنے لٹکے ہوئے نقشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور نقشے پر بڑے بڑے حروف میں ٹائپ کئے ہوئے شہروں کے نام پڑھنے لگی۔ پھر اس کا ذہنی سفر شروع ہوا۔ اور وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں سفر کرنے لگی۔ پونا آتے ہی اس نے کہا "نہیں نہیں، اب پونا کبھی نہیں۔ یہ تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھوٹ چکا ہے۔ پونا میں اب ایلا زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ کالج میں ہم نے چار سال تک ایک ساتھ ہی گذارے تھے۔ اسے مراٹھی پر پورا عبور حاصل تھا البتہ وہ ٹ اور ت ہمیشہ ایک ہی طرح لکھا کرتی تھی۔ اس کے نزدیک ان دو حرفوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ مگر جب سے اس کا بیاہ ارون سے ہو گیا تھا وہ مجھے بھول ہی چکی تھی۔ اس نے ایک بھی خط میرے نام نہیں لکھا۔ میں نے کتنی ہی باتیں اس کے سامنے رکھیں۔ دادا کو جب جرمانہ ہوا تب ایک گھنٹہ اس کے قریب بیٹھی روتی رہی ---- پونا اب ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھوٹ چکا ہے وہ اس وقت اگر میرے سامنے آجائے تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاؤں گی ------" اس کے بعد شوبھا بمبئی کو دیکھتی رہی ---- اس کے آس پاس بھٹکتی رہی ---- دنیا کتنی بدل چکی ہے اور میں صرف ایک اندھیری کوٹھری میں اور اس چھوٹے سے گاؤں میں خود کو ختم کر رہی ہوں۔ سزا بھگت رہی ہوں --- سزا بھگت رہی ہوں -- اور اب اس جیل سے باہر نکلنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔

اسی وقت کلرک نے اپنی گردن اٹھائی اور پوچھا۔ "کیا آج بھی تم بس ہی سے گھر جاؤ گی؟"

شوبھا کو یکایک غصہ آگیا اور اس نے اپنا منہ پھُلا کر پوچھا۔ "کیا میں روز ہی بس سے سفر کیا کرتی ہوں؟"

کلرک بے چارا سہم سا گیا۔ اس نے پھر سے اپنا قلم سنبھالا اور فائلوں پہ

جھک گیا۔

اسکول میں آنے والا اخبار شام کو ہیڈ ماسٹر اپنے گھر لے جایا کرتے تھے۔ وہ اخبار لینے کے لئے اندر آئے۔ کلرک انھیں دیکھتے ہی سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ شوبھا نے بس یوں ہی اپنی ساری سنبھالی اور پرس ہاتھ میں لے لیا۔ ہیڈ ماسٹر شوبھا سے مخاطب ہوئے ''مسز نائیک کیا سَنساودے نے فیس ادا کی؟ اور اگر نہیں تو کل اسے کلاس میں بیٹھنے نہیں دیا جائے۔''

''ساودے۔؟ ہاں وہی نیا لڑکا۔ گھنگھریالے بال، دھاری دار بشرٹ'' اس کا خیال آتے ہی اس نے سوچا اس سے فیس کبھی بھی نہ لی جائے اور اسے اسکول سے ہمیشہ کے لئے چھٹی دے دی جائے اور وہ پھر سے اس کی نظروں کے سامنے کبھی دکھائی نہ دے۔

اسی وقت کلرک نے کہا ''وہ ساودے نہیں اس کا نام سانبے ہے۔''

سانبے کا نام سنتے ہی شوبھا اچانک سنبھل سی گئی۔ قدرے اس کا چہرہ بھی اتر گیا۔ اس نے کہا ''نہیں نہیں، وہ سانبے نہیں ساودے ہی ہوگا۔''

کلرک نے ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ رہا اس کا سرٹیفکیٹ۔''

شوبھا کا دم گھٹنے لگا اس نے سوچا کیوں نہ اس کے سر پر چھتری ٹیک دی جائے مگر اس نے ایسا نہ کیا صرف اپنی گردن نیچی کرلی۔ اسی وقت اسے اس بات کا خیال آگیا کہ ابھی تک اس نے ہیڈ ماسٹر کو ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ بڑی مشکل سے پھر اس نے اپنے حواس جمع کرلئے۔ پھر ٹائپ کی مانند ایک ایک لفظ جمع کرلیا۔ اور جوں ہی اس نے اپنی گردن اٹھائی ہیڈ ماسٹر صاحب کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ اور کلرک ہمیشہ کے سوالیہ نشان کی طرح جھک گیا تھا۔ سامنے کی گھڑی ٹِک ٹِک بج رہی تھی۔

''جی ہاں۔ سانبے، اس کا باپ سب جج ہے اور حال ہی میں اس کا تبادلہ یہاں ہو گیا ہے۔''

شوبھا کے لئے وہاں رکنا اب مشکل سا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی چھتری سنبھالی اور پرس لئے سڑک پر آگئی۔ طرح طرح کے چہرے اس کی نظروں کے سامنے آئے۔ اسکول سے قریب ہی وہ بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی اور اسے محسوس ہوا جیسے سارے لوگ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور وہ موٹا سا آدمی تو خاص کر اسی کی طرف دیکھ رہا ہے جیسے اسے ساری باتوں کا پورا پورا پتہ ہو۔ پاس ہی میں کھڑی وہ بوڑھی عورت بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''یہ بس کتنے نمبر کی ہے؟''

شوبھا کا جی چاہا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں نہ رکے، سیدھی دوڑتی ہوئی گھر چلی جائے یا کوئی سواری مل جائے۔ ورنہ یہ عورت پوچھ بیٹھے گی ''تم ہی شوبھا نائیک ہو نا؟''

''میں خود نہیں جانتی میں کون ہوں!'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور آہستہ آہستہ راستے پر چل پڑی۔

آج اسے کئی دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل ہی اتر گئی ہے اور اپنی ساری قوت کھو چکی ہے۔ اسے لگا کہ بس اسی وقت گھر سامنے آجائے اور وہ گھر پہنچ جائے۔ صرف دنوں سے ناپے ہوئے بے شمار گھنٹے اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ تاریخ جغرافیہ کسی کو بھی ان باتوں کا پتہ نہیں کہ کسی کو کیا دکھ ہیں۔ اس نقشے میں کتنے بے شمار گاؤں ہیں۔ بڑے بڑے گاؤں ہیں لیکن پونا نہیں، بالکل نہیں!!

بائیں جانب کی سودا (ڈرفینسری) کے سامنے ہی آج نیا پوسٹر آویزاں تھا۔ ایک عورت گلابی ساری پہنے مسکراتی ہوئی دمشو پی رہی تھی۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''تو ہی زندگی میں خوشحال ہے ماضی نہیں مستقبل نہیں، حال نہیں، ہر سال میں خوش اور کسی وقت بھی دمشو پیتے ہوئے۔ گلابی ساری پہنے ہوئے۔ تجھے ریل کا سفر کرنا ہے نہ بمبئی کا اور نہ پونا کے نام پر ڈرنے کی کوئی وجہ ہے۔''

نہ جانے سامنے کی جانب کون آنکلا۔ البتہ وہ مسکرا رہی تھی۔ شوبھا کا فرض بھی تھا کہ وہ ہنسی کا جواب ہنسی سے دے۔ مسکراتے ہی اس کا دھیان اس کے چہرے کی طرف چلا گیا۔ وہ مالتی تھی اور شادی کے بعد آج پہلی بار اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ پہلے کی بہ نسبت قدرے اس کا رنگ کھل گیا تھا۔ بیاہ کے بعد جو سکھ ملتا ہے، اس کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔

''شوبھا آج کتنے دنوں کے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔'' مالتی نے کہا۔

''ہاں ابھی ہوں'' پھر اس کے بعد مالتی کے ہاتھ میں جو نئی ساڑی

تھی اس کی قیمت دریافت کی۔ اس کے خیالات پھر سے جاگ رہے تھے۔ مالتی کے پاس ہی اس کا چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ اسے لگا وہ اسی وقت نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

"ملنے نہیں، سادرے ہی ہوگا، شوبھا اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ مالتی نہ جانے کیا کیا کہتی رہی" تین سو روپے تنخواہ، کام کے لیے نوکر، بچے کا نام راجو رکھا ہے میں نے ...... مگر شوبھا اپنے ہی خیالوں میں گم رہی۔ اور مسکراتی رہی

آخر میں مالتی نے کہا" اچھا اب میں چلتی ہوں دیر ہو رہی ہے اور وہ بھی انتظار کرتے رہتے ہیں، گھر آجانا میں ہفتے بھر کے لیے یہیں ہوں۔"

"آجاؤں گی اسی اتوار کو۔"

مالتی کے جاتے ہی شوبھا کو قدرے تسکین ہوئی، مالتی ویسے بری نہیں تھی ہر پانچ منٹ کے بعد خبر لینے خبر دینے آجاتی۔ اُسے یکایک محسوس ہوا جیسے اس نے اس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ کم سے کم اس بچے کو ہی کچھ لے دیتی۔ یا پھر اس کے گھر کا پتہ پوچھ کر اس اتوار کو اس سے ملنے جاتی مگر نہ اس نے پوچھا تھا اور نہ اُس نے بتایا تھا۔ کیا نام بتلایا اس نے اپنے لڑکے کا؟ 'سنجو'۔ نہیں! نہیں راجو'۔ ٹھیک سا بنے نہیں۔ سادرے۔ یقیناً سادرے۔ وہ کلرک ہی کچھ غلط کہہ گیا تھا۔

اسے یکایک اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ آج بہت ہی تھک گئی ہے۔ کاش وہ بس سے آج گھر لوٹتی۔

اس وقت وہ فریم میکر کی دوکان کے قریب سے گذر رہی تھی وہاں اس نے اپنی ایک تصویر کے لئے فریم بنانے دیا تھا۔ فریم دو روز قبل ہی تیار ہو چکا تھا۔ مگر وہ لینے میں نہ جانے کیوں ٹال مٹول کر رہی تھی مگر اس بار وہ انکار ہی نہ کر سکی کیونکہ دوکاندار اسے آواز دے چکا تھا۔

"دو چار روز میں کچھ مصروف رہی اس لئے آ ہی نہ سکی" اس نے کہا۔

پھر وہی مخصوص مسکراہٹ چہرہ پر پھیل گئی۔

"ہمارے گھر پر بھی بالکل ایسی ہی ایک تصویر ہے۔ شاید ہماری چندرا بھی آپ ہی کے ساتھ پڑھا کرتی ہوگی۔ بیاہ کے ایک ہفتہ بعد ہی وہ بے بلک بھد حادی — آپ تو اس سے واقف ہوں گی ہی؟" دوکاندار نے کہا۔

"ہاں۔ چندرا جادھو۔ وہی جو ٹیبل ٹینس بہت اچھا کھیلا کرتی تھی۔" پرانی چیزوں میں سے یہی ایک تصویر بچی ہوئی تھی۔ سچ کہا جائے تو وہ اسے فریم کرانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی مگر ماں کے اصرار کے سامنے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس تصویر میں لیلا کی تصویر بھی ہے۔ اور اب لیلا کا بیاہ اروند سے ہو چکا ہے مگر یہ باتیں اسے کون کہہ سکے گا؟ چونکہ اسے بھی ایک دھکا سا لگا تھا۔

درخت صاحب سے یوں کمزور ہو جاتا ہے تو اس کے پتوں کا جو حال ہو جاتا ہے، یہی حال اس کا ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی کم ہو رہے تھے اور پھر اس نے اپنے دانت بھی نکلوا لئے تھے۔ وہ میں، ماں اور دادا تینوں ہی اس کال کوٹھری میں بیٹھے زندگی کی سزا پا رہے ہیں۔ سزا بھگت رہے ہیں کبھی کبھار ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر صرف ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں۔ شام کو اکثر وہ اپنے پاؤں لمبے کرکے پرانی باتیں دہراتی رہتی۔ اور ہر بار اس کی آنکھوں میں نمی پائی جاتی۔ اس پرانی تصویر کو دیکھتے ہی اس نے اسے فریم کروانے کا ارادہ ظاہر کیا اور اصرار بھی۔ اس لئے شوبھا انکار نہ کر سکی۔ شوبھا نے تصویر اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کے چاروں طرف لگے شیشے اسے حیرت سے دیکھ رہے۔ اس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا بالکل اتر گیا تھا۔ رنگ اُڑ گیا تھا اور گالوں کی ہڈیاں دھیرے دھیرے اُبھر رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ کہاں وہ پہلی شوبھا، کہاں یہ آج کی شوبھا؟ —

اس نے دوکاندار کو پیسے دیدیے اور پھر اسی طرح ہنستے ہوئے دکان سے باہر آگئی — اس وقت کی شوبھا اور آج کی شوبھا میں کتنا فرق ہو گیا ہے جاں اشوک چلا گیا اس کے ساتھ ہی ساری خوبصورتی بھی چلی گئی — شوبھا کا نام اخباروں میں آنا شروع ہو گیا مگر نتیجہ نکلنے سے قبل ہی سارا معاملہ ختم ہو گیا۔ ایک روز جب وہ اس سے ملنے گئی اس نے کام کا بہانہ بنا کر باہر کا رخ کیا۔ اور اس کے دوسرے روز سارے خطوط بذریعہ رجسٹری روانہ کر دیے۔ ڈاک کی رسید تک سنبھال رکھی تھی۔ لیکن شوبھا کو تو یہ رویہ بھی ناپسند تھا۔ کم از کم وہ اس سے اپنے خطوط ہی طلب کر لیتا۔ مگر اس ضمن میں بھی ... خاموشی مناسب سمجھی تھی — کچھ تو کہنا تھا ...

آ بہرے ہو جاتے۔ ہو سکتا تھا اسی ایک گھاؤ پر وہ زندہ رہنے کی کوشش کرتی۔ مگر اس نے تو پل بھر میں ہی سارا قصہ ختم کر کے لیلا سے بیاہ کر لیا۔ لیلا سے ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مگر اب یہ تصویر ہر وقت نظروں کے سامنے لٹکتی رہے گی اور لیلا تصویر میں ہنستی ہوئی نظر آئے گی ——

یہ ساری باتیں ماں کو بتانا کتنا مشکل ہے؟"

شو بھا نے جن دنوں اسکول میں کام کرنا شروع کیا تھا انہیں دنوں سابٹے نے پان کی نئی دکان اسکول کے سامنے کھولی تھی۔ پان کے علاوہ کورے لفافے، اور فلمی گیتوں کی کتابیں بھی ہر وقت لٹکتی نظر آتی تھیں۔ تریب قریب اسکول کے سبھی استاد وہیں سے پان منگوا کر کھایا کرتے تھے اور انٹرول میں اسکول کے طلبا وہیں گھومتے نظر آتے۔ سامنے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے، منہ میں پان کا بیڑا دبائے ہر وقت سڑک کی جانب نجانے کیا تکا کرتا تھا۔ کئی دنوں تک شو بھا اس کے بارے میں نہ سوچ سکی۔ البتہ ایک روز جب وہ اسکول جا رہی تھی کسی نے اُسے آواز دی —— اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی بتیسی پھیلائے ہنس رہا تھا۔ وہ پورا دن عجیب سی کشمکش میں گذرا۔ شام کو واپس لوٹتے وقت جیسے اس کا پورا جسم ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس نے دوڑتے ہوئے دکان کے سامنے کا راستہ پار کیا۔ پھر بھی سامنے، گاہکوں کو پان دینے کے بجائے اسے دیکھ کر اتنی زور سے ہنس پڑا کہ اس کا دم نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا

اسکول جانا اب اس کے لئے دوبھر ہو گیا —— ہر وقت وہ ہنستا ... لئے سامنے آ جاتا تھا۔ کم از کم ایک بار تو وہ آواز دے ہی دیتا ... دن بھر شو بھا اس گندگی کا بوجھ لئے کلاس میں بے چینی سے گھوما کرتی ... وہاں سے نکلتے وقت وہ کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ گھر جانے لگی۔ مگر اس کے ... دسویں کلاس کی کمودنی کے ساتھ گھر جا رہی تھی اسامنے ... پھر آیک بار آواز دی اور اس کے سامنے اسے شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ... وہ تانگے سے گھر گئی اور اسے اس فضول خرچی پر دادا کی ...

... خطوط آنے شروع ہوئے۔ رجسٹری، ایکسپریس، ہینڈ ... ایک دو خطوط پڑھے اور اس کے بعد تحریر دیکھتے

ہی لفافہ پھاڑ کر پھینک دیتی۔ ایک بار تو سابٹے نے حد ہی کر دی۔ شو بھا کے پیچھے پیچھے بس اسٹاپ تک ہو لیا۔ اور پھر آہستہ سے پوچھ بیٹھا: کیا محسوس ہوتا ہے میرے خط پڑھ کر؟ تمہارے جسم سے کتنی اچھی خوشبو آتی ہے شو بھا!" شو بھا اس رات بالکل سو نہ پائی پورا بدن جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ دادا کے واپس آنے تک نو بج جاتے۔ گو کہ دوکان ان دنوں کم چل رہی تھی۔ لیکن عادت سے مجبور ہونے کی وجہ سے وہ جلدی کبھی نہ لوٹتے۔ واپس آتے ہی انھوں نے شو بھا کو آواز دی۔ رات میں وہ کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ پیٹ میں ان کے اکثر درد رہا کرتا تھا۔ انھوں نے شو بھا سے کھانا نہ کھانے کی وجہ پوچھی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑا سا وقت گذر جانے کے بعد شو بھا نے دادا سے پوچھا "کیا میں کسی اور گاؤں میں نوکری کر سکتی ہوں۔؟" یہاں میرا جی نہیں لگتا"

"ہاں شاید ہماری وجہ سے تمہاری آزادی میں رکاوٹ پڑتی ہو۔ مگر تم دوسرے کس گاؤں جاؤ گی۔؟"

شو بھا نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی خاموشی سے شو بھا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماں جب بھی ایسی نظروں سے اسے دیکھا کرتی تو اُسے بڑی تکلیف پہنچا کرتی۔ پچھلے ہفتے ہی کی بات ہے شو بھا نے ایک پھولدار درخت لگایا تھا اور بڑی مشکلوں کے بعد اس میں ایک خوبصورت سا پھول اُگ آیا تھا۔ ماں نے بھی بڑی خوشی سے لمحے بھر کو اس پھول کی طرف دیکھا تھا۔ مگر جب شو بھا نے اس پودے کے گنڈی کو الگ اٹھا کر رکھنا چاہا تو اس کا ایک بازو اس کے ہاتھوں ہی میں آ گیا البتہ اس پودے کو کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں پہنچا تھا۔ پھر بھی ماں نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ پورا دن شو بھا بے چین سی رہی تھی پہلے ایک بھی کپڑا گھر پر نہیں دھویا جاتا تھا مگر اب سارے ہی کپڑے گھر پر ہی دُھلا کرتے۔ پہلی بار جب ماں نے اپنے ہاتھوں سے چھاچھ بنایا تھا تو اس کے ہاتھوں پر سوجن سی آ گئی تھی، مگر اب ——؟

"لیکن دادا میں اکیلی ہی جانا نہیں چاہتی۔ ہم سبھی جائیں گے آپ بھی نئی دوکان کھول سکیں گے اور میں بھی ... کر سکوں گی"

"لیکن میں تو یہاں سے نہیں ہلوں گا، مرتے دم تک، پھر ..."

بھی تو یہیں پر ہے۔"

"دھندا — ہاں دھندا۔ بھنڈی بازار میں بڑی دکان کے ایک کونے میں کھادی کے تین چار تھان لئے اب بھی وہ بیٹھا کرتے تھے اور ہر آدمی کی طرف امید بھری نظروں سے تکا کرتے تھے۔ انھوں نے اس سے پہلے کبھی بھی کپڑے کا تھان تک ہاتھوں میں نہیں لیا تھا۔ بڑی دکان تھی اُن کی اور اب۔۔ ۔۔! پہلے لکشمی پوجن کے لئے ہزاروں روپے رکھے جاتے تھے۔ پورا گاؤں پوجا کے لئے اُمڈ آتا تھا۔ اور اب لکشمی پوجن کے موقع پر اکیلے دادا صرف ایک شمع جلا دیا کرتے رہتے ہیں اور اس رات ماں سے بات تک نہیں کرتے۔

جنگ کے دوران میں بہت سارے چیزیں بازار سے غائب ہو جاتی ہیں کپڑا بھی نایاب ہو گیا تھا۔ دادا کے پاس چند دھوتیاں تھیں جو وہ صرف پہنچے والے لوگوں کو ہی دیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے کسی انجانے گاہک کو دکان سے یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ دھوتیاں ہمارے یہاں نہیں ہیں۔ مگر اس کے فوراً بعد ان کے نوکر نے آٹھ روپے زیادہ لیکر ایک جوڑی دھوتی دوسرے گاہک کو بیچ دی۔ دکان کی قرقی ہو گئی۔ اور ان آٹھ روپیوں کے بدلے میں دادا کو ڈیڑھ ہزار روپے جرمانے کے ادا کرنے پڑے۔ دادا دکان میں بیٹھنا بھی اپنی ہتک سمجھنے لگے۔ پندرہ کمروں کی دکان صرف پانچ کمروں کی رہ گئی پھر وقت پر کرایہ ادا کرنے کی وجہ سے وہ پانچ کمرے بھی جاتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے چائے بیچنے کا دھندا کیا۔ ماں کے سارے زیورات اس میں لگا دیئے پھر بکری کھولی۔ مگر ایک رات تھک ہار کر گھر واپس آ گئے۔ اور شوبھا کے سامنے کھڑے ہو کر کہہ اُٹھے۔

"نہیں شوبھا مجھ سے اب یہ دھندا ہے کہ سوا کوئی اور دھندا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے سوا میرے لئے کوئی اور چارہ نہیں اس سے کوئی چھٹکارا نہیں۔"

شوبھا نے پھر ایک بار پہل کی اور پوچھا "میں جاؤں بس سال بھر کے لئے"۔ اس کے بعد اس نے ماں اور دادا کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا اُسے ایسا سوال پوچھنا نہیں چاہیے تھا۔ دادا کے لئے صرف ایک دھندا ہے ہم سبھوں کے لئے یہی ایک گاؤں ہے، میرے لئے وہی ایک اسکول ہے، اور اس اسکول سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔

پھر وہ ماں کے قریب چلی گئی اور اس نے ساری واردات اُسے کہہ سنائی۔

"کتنے دنوں سے یہ معاملہ چل رہا ہے؟" دادا نے غصہ سے پوچھا ایسے وقت میں ان کے پیٹ کا درد اکثر زیادہ بڑھ جاتا تھا۔

"سال بھر سے!"

"اور تم آج مجھ سے کہہ رہی ہو؟ کل صبح ہی میں پولیس میں رپورٹ درج کراتا ہوں۔ کوئی پرواہ نہیں ہے، کہ میں ختم ہو گیا ہوں اس کے باوجود بھی ابھی کچھ لوگوں پر میری اچھی خاصی پوزیشن ہے۔"

شوبھا کا گلا رندھ گیا صرف اُسے اس بات سے نفرت تھی وہ صرف دوسرے گاؤں جانا چاہتی تھی، اس لئے مجبوراً اسے سب کچھ کہنا پڑا البتہ دادا غصے کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے رات بھر میں انھوں نے دس بارہ خطوط جمع کر لئے اور دیوار سے ٹیک لگائے صبح کا انتظار کرتے رہے۔ دکان میں نوکر کی غلطی کی وجہ سے مجھے زندگی بھر اب بھگتنا پڑ رہا ہے البتہ میری لڑکی! اور یہ پان بیچنے والا۔ اس کی یہ مجال! شوبھا نے انھیں بہت سمجھایا کہ پولیس میں رپورٹ لکھانا اچھی بات نہیں ہے مگر ان پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ نوکروں کے گناہ کا خمیازہ میرے لئے ہے کم بخت اب لوگ یہ سب کچھ کریں اور میں خاموش رہوں۔ دوسروں کے لئے میں اپنا گاؤں چھوڑ کر چلا جاؤں؟ تمھیں اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

پندرہ دن تک مقدمہ چلتا رہا — اس کا نام جس روز اخبار میں آگیا اس کے بعد وہ پانچ چھ روز تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اور ان سے ملنے کی ہمت نہیں کر سکی البتہ اس کی طرف سے خطوط آئے۔ دادا اکیلے ہی کورٹ میں جاتے اور آتے ہی ساری باتیں بتا دیتے۔ سامنے نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی موقع ملنے پر پھر ایک بار ایسے ہی خطوط لکھنے کا وہ متمنی تھا۔

شوبھا کو بھی ایک بار کورٹ میں جانا پڑا اس نے حلف اٹھایا اور ہاں اور ناں میں جواب دیا۔ اس کے سامنے ہی کھڑے ہوئے وکیل نے ایک خط اٹھایا اس کی عبارت پڑھی "تم جس وقت امرائیوں میں ملنے آئیں تب میں نے تمھیں سفید پھول دار ساری دی تھی۔" اور ہاں اس پلو

جب ملو گی تب صرف اس پودوں سے کام نہیں چلے گا۔۔۔۔۔؟

"کیا یہ سچ ہے کہ تم اس سے ملنے جایا کرتی تھیں؟"

"نہیں!"

"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟"

بہت سارے ہنستے ہوئے چہرے، اس کی نظروں کے سامنے آ گئے اس کے اور بھی خطوط پڑھے گئے۔ شوبھا کا پورا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ایک ایک کر کے اس کے جسم پر سے سارے کپڑے اتار دیے گئے ہوں۔ سامنے ہی بیٹھا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شوبھا شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ دادا کو اسی وقت آواز دی جائے اور کہا جائے کہ بس ہو گیا یہ فیصلہ۔ چلو ہم کہیں اور جا کر رہتے ہیں۔ لیکن اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔

اسی وقت کسی نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم اروند چٹنس سے واقف ہو؟ تمہاری اور اس کی جان پہچان ہے؟ کیا تم اسے خطوط لکھا کرتی تھیں؟"

دادا کا چہرہ غصے کے مارے لال ہو رہا تھا۔ "آخر اس بات کا ذکر یہاں کیوں؟ گناہ کس نے کیا؟ میں نے یا ساہنے نے؟" اروند کے خطوط کا یہاں ذکر کیوں؟

دادا اور شوبھا گھر واپس آ گئے۔ راستے بھر میں انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ گھر آتے ہی شوبھا سے پوچھا۔ "کیا تم اروند کو خطوط لکھا کرتی تھیں۔۔۔؟" دادا نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"دادا ہم دونوں بیاہ کرنے والے تھے مگر اب وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔"

دادا کورٹ میں جاتے اور کورٹ سے واپس۔ البتہ ان باتوں کا اب ذکر نہ کرتے۔ ساہنے اس سے قبل بھی ایسی ہی حرکتیں کر چکا تھا اور سزا پا چکا تھا۔ اسکول کے سامنے کی اس کی دوکان بند کر دی گئی اس بار بھی اسے سزا ہو گئی تھی لیکن کوئی مطمئن نہیں تھا۔ دادا نے روندھے ہوئے گلے سے کہا "میں ہی غلطی پر تھا مجھے کورٹ میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" اس جملے سے انھوں نے جیسے اپنی زندگی شوبھا کے سائے سے چھڑا لی۔

اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی ہیڈ ماسٹر نے ہندہ وہ لڑکی پڑھی کیوں نہ ہو، البتہ اسکول میں رکھ تو لیا تھا۔ شوبھا کی نظر جب بھی اس بند دوکان پر پڑتی تو اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی بار بار اسے طمانچے لگا رہا ہے۔ لڑکوں نے بھی مذاق اڑانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ایک نے تو "آمرائیوں کی ملاقاتیں" کے نام سے ایک نظم بھی لکھ دی تھی۔ راستے پر کتنی ہی نظریں اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ قدم قیدیوں کی مانند وہی راہ چلتے اور جب بھی موقع ملتا ریلوے کی آڑی ترچھی لائنوں پر دوڑتے ہوئے، مسافروں کے ہجوم میں کھو جانے کی کوشش کرتے۔

آج کے دن اسی کی دھول سے اٹا ہوا اسٹیشن آ گیا۔ مالتی سے ملاقات تصویر میں سیتا مسکراتی ہوئی گھر پر آ کر بیٹھ گئی۔ اروند نے خطوط واپس بھیج دیے۔ کورٹ میں ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیے گئے اس کا یہ سارا دوسرے۔ "اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! لیکن ویسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک بھی داغ کیسے صاف کیا جا سکتا ہے؟ دھوتی جوڑی بھی نہ کی ہوتی، میں اسکول گئی ہی نہ ہوتی۔ اروند سے ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی، ہر ایک کے لیے الگ الگ سزا مقرر کی گئی ہے ـــــ اس کے لیے کوئی اپیل نہیں۔ ان تمام لوگوں سے صرف دو ہی لوگ آزاد ہیں۔ ایک وہ شو بیچنے والی گلابی ساری پہنے ہوئے لڑکی اور دوسری پندرا جادھو ـــ ایک جو زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں اور دوسری جو زندگی سے آزاد ہو گئی۔

ابھی راستہ خاصا لمبا تھا۔ دیوالی کے قریب کا بازار ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ ہاتھ میں فریم کے بوجھ کی وجہ سے ہلکا سا درد شروع ہو گیا تھا۔ راستے کے دونوں طرف ادھیڑ گنوار عورتیں ترکاریوں کی ٹوکریاں سجائے بیٹھی تھیں۔ کریلے دیکھتے ہی اسے ماں یاد آ گئی۔ ماں کو یہ ترکاری بہت زیادہ پسند تھی۔ وہ جتنی میٹھی تھی اتنی ہی کڑوی ترکاری کھایا کرتی تھی اور اکثر ان کریلوں کی تعریف کر کے اوروں کو بھی کھانے پر مجبور کرتی تھی۔ اس نے چند کریلے چن لیے۔ اسی وقت اسے جانی پہچانی آواز سنائی پڑی۔ مالتی قریب ہی ترکاری خرید رہی تھی۔ اس لمحے اپنے لڑکے راجو کو دوسرے قریبی آدمی کے پاس دے رکھا تھا۔ وہ آدمی کیلے کے درخت کی مانند جھک گیا تھا۔ مالتی نے جلدی جلدی ترکاری

خریدلی۔ اور شوبھا اس سے کہیں کوئی بات نہ پوچھے اس ڈر سے فوراً ہی اس نے اپنا راستہ لیا۔ شوبھا نے مالتی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس لئے اس نے اس بات کا پتہ تک نہ لگنے دیا کہ وہ اُسے دیکھ چکی ہے۔ تین سو روپے تنخواہ، گھر میں فکر۔ اب شوبھا ساری باتیں سمجھ گئی تھی۔ مالتی وہ سب کچھ دیا سکی جس کے وہ خواب دیکھتی آرہی تھی، اس لئے اب وہ من گھڑت باتیں کہنے کی عادی ہو چکی تھی۔ دل کو تسکین دینے کا سامان مہیا کر رہی تھی، اپنے آپ کو سکون دلا رہی تھی۔ شوبھا نے سوچا چلو اچھا ہی ہوا یہ لمحہ بھی ٹل گیا۔ البتہ اس کی زندگی میں پھانس بن کر اٹک گئی۔

شوبھا نے کرچلنے لئے اپنی چھتری اور بیگ سنبھالا۔ اب شام ہو رہی تھی اور پورا جسم تھک چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا اب بس سے جانا ہی بہتر ہے۔ تاکہ گھر فوراً پہونچ جائے۔ گھر، صرف چار دیواروں سے بنا ہوا۔ رات بھر جسم ٹکٹکی لگائے رہتا ہے ——— اس نے اپنے قدم تیز کر لئے۔ مگر اس وقت اسے ایک بار تھکاوٹ نے آدبوچا اور مجبوراً وہ ایک دوکان کی سیڑھیوں کے قریب ہی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی ——— اس نے اپنا پورا بدن سمیٹ لیا تاکہ کوئی بھی اسے نہ دیکھ پائے۔ دوکان کے دوسرے کونے پر سامنے کھڑا تھا۔ اس نے قدرے داڑھی بڑھا رکھی تھی حوالات سے چھوٹ آنے کے بعد وہ موٹا بھی ہو گیا تھا۔ سامنے سے گذرنے والی ایک خوبصورت سی لڑکی کو اس نے اشارہ کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور پھر اپنی تیسی بھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لڑکی شرم کے مارے پانی پانی ہو گئی اور کسی گنہگار کی مانند تیز تیز قدموں سے آگے کی جانب چل پڑی۔

"کیوں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا۔؟ اور ہاں تم نے تو بس سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟" شوبھا نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ مگر وہ فوراً اسے پہچان نہ سکی ——— وہی اسکول کا کلرک تھا۔ اس نے پھر کہا ——— "میں یہیں پر رہتا ہوں، بس دو گھر اور آگے ——— آج میں تمہیں اپنے گھر مدعو کرنے والا تھا۔ میری لڑکی کو پیدا ہوئے آج تین دن ہو رہے ہیں ——— یہاں ہمارا کوئی جاننے سننے والا نہیں ہے!!"

وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کلرک نے تصویر اور چھتری سنبھال لی۔ اور گھر کی جانب چل پڑا۔ دو چار قدم چلتے ہی پھر اس نے شوبھا سے کہا ——— "ہاں ابھی ہی راستے میں وہ طالب علم سامنے ملا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے اگر وہ کل فیس نہیں لائے گا تو اسے سزا ہوگی"۔ شوبھا نے اپنی بے جان سی آنکھیں جھکائیں۔ اور پھر اپنے آپ سے کہا ——— "ساہنے کو سزا کیسے ہوگی؟ کون دے گا اسے سزا ——؟ سزا صرف مجھے اور اس خوبصورت سی لڑکی کو اور اس لڑکی کو جس کی پیدائش کا آج تیسرا دن ہے ——— !!!

شریمتی وجیا راجادھیکش

مرذ

گھر پرانا ہو گیا تھا۔ پھاٹک کا دروازہ ٹوٹنے کی وجہ سے بند بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آنگن میں آم کے درخت تھے البتہ پچھلے پانچ چھ سالوں سے ان پر بور بھی نہیں آئی تھی۔ بنا جوتے کے گھومتے وقت اکثر پاؤں میں کنکر چبھا کرتے تھے۔ گھر کا دروازہ سڑ گیا تھا۔ اور اس پر کسی نے چاک سے مالک مکان کا نام لکھ رکھا تھا۔ دیواروں سے پلاسٹر اکھڑ گیا تھا، جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں ایک دیوار پر مالک مکان کے دادا جان کی فریم کی ہوئی تصویر لٹک رہی تھی۔ سال میں ایک بار اس تصویر کو ایک ہار پہنایا جاتا اور دوسرا بدلنے تک وہ اسی طرح لٹکتا رہتا۔۔۔ سامنے کی دیوار پر نئے سال کا کیلنڈر دکھائی دے رہا تھا۔ غالباً وہ بنئے کی دوکان سے ہی آیا ہوگا، سال میں صرف دو تین بار ہی وہ دنیا کے برابر چلنے کی کوشش کیا کرتا۔ ایک اور پرانی دیوار پر ایک گھڑی لٹک رہی تھی، پرانے ڈائل والی۔ گھڑی کی سکنڈ کی سوئی نجانے کب کی ٹوٹ چکی تھی۔ سکنڈ کی سوئی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اکثر سست ہی رہا کرتی۔ پہلے ہر آدھ گھنٹہ کے بعد ٹن کی آواز بھی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب گھڑی نے گھنٹے بجانا بند کر دیا تھا۔ البتہ اس کا پنڈولم ہر وقت ہلا کرتا تھا۔ گھر کی چھت قدرے مضبوط تھی۔ مکڑیوں نے اپنے جال بنا رکھے تھے۔ بارش میں جب کبھی پانی رستا تھا تو مکڑی کے جالے ٹوٹ جاتے تھے۔ بارش سے قبل اکثر ایک آدھ بار آندھی چلتی تھی اور اپنے ساتھ گھر کے بہت سارے کھپریل اڑا لے جاتی تھی۔ آندھی رک جانے کے بعد پھر چاروں طرف خاموشی اور پھر اس خاموشی کے بعد پانی کا رسنا، سب ایک معمول ہو کر رہ گیا تھا۔ رات میں سر پھرے بھنورے گھر میں گھوں گھوں کرتے چکر لگایا کرتے۔ اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بتی بجھا دی جاتی اور سارے

لوگ اندھیرے میں خاموشی سے بیٹھا کرتے۔ نہ کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے اور نہ ہی باتیں کرتے۔ بارش کے بعد جاڑے، جاڑے کے بعد گرمی اور گرمی کے بعد پھر بارش ۔۔۔۔!

گھر بہت ہی بڑا تھا اور اتنا ہی سنسان! ٹین کا بنا یا ہوا ایک حوض بھی تھا۔ اس میں پہلے دھان رکھا جاتا تھا اب پرانے کپڑے ٹھونس دیے جاتے۔ حوض کے قریب ایک جھولا بھی تھا اور جھولے کے قریب ایک پرانا ٹرنک، ٹرنک میں زنگ آلود برتن رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پاس ہی بانس کے لمبے ٹکڑے اور ردی رکھی ہوئی تھی یہ ساری چیزیں دھول سے اٹی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چینی کے ٹوٹے ہوئے برتن اور پرانے ڈبے بھی نظر آتے تھے۔ دو چار رسیاں کپڑے سکھانے کے لئے تان دی گئی تھیں۔ باورچی خانے میں لوہے کی ایک الماری تھی۔ الماری کے پیچھے سنی کے گھر بن گئے تھے۔ لوہے کی اس الماری میں تین چائے کی پیالیاں، دو گلاس، سپاری رکھنے کا چھوٹا برتن اور کچھ پرانی چیزیں تھیں۔ باورچی خانے کا لپا ہوا حصہ بہت ہی خوبصورت لگتا تھا۔ اور بغیر لپا ہوا بہت ہی کھردرا۔ بتی کا شیشہ ہمیشہ ہی کالا رہا کرتا تھا۔ اس لئے اس کی روشنی کبھی کبھی صاف نہیں پڑتی تھی۔ باہر کے کمرے میں ایک جاجم بچھا تھا۔ جگہ جگہ سیاہی کے دھبے تھے، اس کے ایک کونے میں بڑا سا سوراخ پڑ گیا تھا۔ البتہ اس پر رضائی ڈال دی گئی تھی، اس لئے وہ سوراخ ہمیشہ ہی چھپا رہتا تھا۔ دو تین کرسیاں ایک ٹیبل اور اس کے پاس ہی جوتے رکھنے کا اسٹینڈ رکھا ہوا تھا۔ جاجم روز ہی صاف کی جاتی۔ اس لئے اکثر دھول جاجم کی نچلی تہہ میں جم جاتی تھی۔ دوسرے کمرے میں ایک پلنگ، پلنگ کے نیچے تین چار ٹرنک اور ان میں سے ایک ٹرنک

ہری نئے کپڑوں کے لئے۔ دوسروں پر بچھانے کی چادریں گٹھری بنا کر رکھ دی گئی تھیں۔ دو شرٹ، ایک کوٹ اور ایک ٹوپی آئینہ ہی لٹکتی دکھائی دیتی۔ پلنگ کے اطراف اور بھی کپڑے رہا کرتے۔ اس کا درمیانی ٹکڑا نکل جانے کی وجہ سے اکثر آواز پیدا ہوتی تھی۔ کھٹمل بھی بہت ہو گئے تھے اس کی اونچائی میں اضافہ کی ایک ہی وجہ تھی، اور وہ یہ کہ اس پر بہت ساری رضائیاں ایک ساتھ بچھا دی گئی تھیں۔ تکیہ پر تیل کے دھبے تھے اور چادر میلی ہو گئی جس سے ایک طرح کی بُو سے ہر وقت کمرہ بھرا رہتا۔ دیواروں پر بانس کے ٹکڑے لگا کر ان پر کتابیں رکھ دی گئی تھیں۔ اس کمرے سے ملحق ہی ایک کمرہ تھا، قدرے کھلا ہوا۔ ہوا کا گذر اس میں بخوبی ہوتا تھا، اس کمرے سے کھلا آسمان اور پہاڑ دکھائی دیتے، البتہ یہ کمرہ ہمیشہ ہی بند رہا کرتا۔ جب کوئی مہمان آ جاتا، اس وقت ہی وہ کھولا جاتا۔ سجایا جاتا۔ ویسے وہ اکثر بند ہی رہا کرتا...... !!

بھور ہو گئی اور سورج کی ایک کرن اندر داخل ہو گئی۔ سیتا بائی کب کی جاگ گئی تھیں، البتہ اس وقت ان کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کیا کرنا ہے۔ اتنی جلدی نئے دن کی ابتدا کر کے۔ آج تک وہی کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی یہی کرنا ہے۔ بس زندگی کے دن دھکیلنا ہیں۔ سال کے آخر میں لگان کے کچھ روپے وصول ہو جاتے ہیں، دو وقت کی روٹی میسر آتی ہے۔ لیکن اوروں کو اس کا خیال ہی کہاں ہے؟ ایک روز اگر ترکاری نہیں رہتی تو وہ چلّا اٹھتے ہیں۔ کمل اسکول جاتی ہے، روز ہی بس کے لئے پیسے لگتے ہیں۔ بڑی نے کب کی تعلیم ختم کر دی ہے۔ کوئی کورس ہی کر لیتی تو چھوٹی موٹی نوکری ہی مل جاتی اتنی ہی مدد ہو جاتی۔ البتہ وہ تو بس ہمیشہ اس لئے مری جا رہی ہے کہ اس کا بیاہ ہی نہیں ہوگا۔ اور کمل کو بیاہ کی جلدی پڑی ہے لیکن اس کے لئے بھی کوشش ضروری ہے۔ اگر میں خود ہی اس کے لئے باہر قدم رکھوں تو کوئی بات ہے! اس پر تو ماما یوں ہی پڑے ہیں۔ ایک پیٹ اور زیادہ، ان دنوں سیتا بائی کو نیند بہت ہی کم آیا کرتی تھی، مگر جلد اٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ اکثر ان کی کمر میں درد رہا کرتا تھا۔ گوپال راؤ چائے بنا کر پی چکے ہوں گے۔ وہ یہ کام بنا کسی تردد کے کیا کرتے تھے۔ روز رات کو دن کی چائے کے لئے دودھ نکال لینا پڑتا۔ اگر کبھی اس میں کوئی غلطی ہو جائے تو شدید ہی ضرور۔

اب وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہے ہوں گے۔ سیتا بائی نے ان کے کمرے میں سونا کب کا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں سویا کرتی تھیں۔ انھیں گئی رات کو بیڑی پینا پسند نہیں آتا تھا۔ اور گوپال راؤ اس عادت کے ہاتھوں مجبور تھے۔

سورج کی کرن کمرے میں رینگ رہی تھی ویل اور کمل سکھ کی نیند سو رہی تھیں۔ نیند میں کمل کی ساری قدرے سرک گئی تھی۔ وہ سیدھی کرتے ہوئے سیتا بائی نے غصّے سے اسے ہلایا " اٹھ دیکھ سورج سر پر آ گیا ہے "

دودھ آ گیا، چائے تیار ہو گئی، منڈلی نے چائے پی لی۔ اور پیالیاں وہیں رکھ چھوڑیں۔ مکھیاں بھنبھنانے لگیں لیکن منڈلی وہیں بیٹھی رہی۔ دکھی (نوکرانی) آ گئی۔ اس نے پیالیاں سمیٹیں۔ برتن سمیٹے اور نل کے نیچے لا کر رکھ دیئے اور گھر میں جھاڑو لگانے لگی۔ سیتا بائی نے کہا۔ " رات کے برتن ابھی تک صاف نہیں ہوئے ہیں "

کمل نے کہا۔ " جانم یہ دھول ابھی باقی ہے "

ویل نے کہا " میری ساری پر ہلدی کا دھبہ تھا۔ کیا کل تو نے اسے اچھی طرح صابن مل کر دھویا تھا؟"

سیتا بائی فوراً کہہ اٹھیں " ساریاں خود ہی دھونی چاہئیں "

ویل۔ " کل ساریاں تین "

کمل۔ " اور ہاں اسے باہر کہاں جانا ہوتا ہے؟"

سیتا بائی۔ " کسی روز گھر کی صفائی کی جائے یہ کبھی نہیں ہوتا "

ویل۔ ہم صفائی کریں، اور دوسرے آ کر اس کا ستیاناس ماریں بیڑی کے ٹکڑے، ماچس کی ادھ جلی تیلیاں، پان کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا۔ دوسروں کے گھر دیکھئے ہماری قسمت میں تو یہی لکھا ہے اور اس سے چھٹکارا ناممکن ہے۔

کمل۔ " کل ہمارے پتی آئیں گے اور رہیں گے اسی گھر میں، اس حالت میں! کیسی کی جائے گی آبرو؟"

گھڑی کا پنڈولم ہل رہا تھا، معمول کے مطابق! دوسرے کمرے میں ایک کرسی پر گوپال راؤ براجمان تھے اور دوسری پر دتّو ماما۔ دتّو ماما کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا اور وہ ابھی تک پہلے صفحہ پر ہی تھے۔

کمل کو سنیما کے اشتہار دیکھنے کے لئے اخبار کی ضرورت تھی اس لئے وہ میں یہ وہ ڈٹ کر کھڑی تھی۔ ایک بار اس نے تو کہہ دیا کہ کیا صرف ایک ہی صفحہ پڑھنے کے لئے اتنا وقت درکار ہے؟ لیکن دتو ماما نے اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے کہہ ہی دیا کہ "اخبار کی ضرورت ہے مجھے۔" دتو ماما نے اسے ایک سرے سے موڑ دیا اور کمل کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ کمل نے اخبار پڑھنا شروع کیا۔ دیپا "ماکینز میں" سانگتے ایکا" سنا نے بہت اچھے ہیں کاش دیکھنے کو مل جائے۔ "کوپرگاؤں میں ایک عورت کے جڑواں بچے" کیسے ہوتے ہوں گے بھلا یہ جڑواں بچے؟ نجانے کیسا محسوس ہوتا ہوگا اس عورت کو! اگر ایسے ہی اپنے کو ہو جائیں تو!۔

"ایک تعلیم یافتہ لڑکے کو ایک میٹرک تک پڑھی ہوئی لڑکی کی ضرورت ہے۔ تنخواہ دو سو پچاس اور لڑکی کی شکل صورت بالکل اپنی ہی طرح! کیوں نہ قسمت آزمائی جائے۔ ہمارے یہاں تو کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتا۔ درمیان میں دل ہے تعلیم نہیں اور روپ نہیں، اور جب تک اس کا بیاہ نہیں ہوگا میرے لئے۔۔۔؟

دتو ماما ہر وقت چھت پر اپنی نظریں اٹھائے نہ جانے کیا دیکھا کرتے۔ انھیں اس میں ایک قسم کی خوشی محسوس ہوتی وقت گذارنے کا یہی تو ایک سامان تھا۔ سیتا بائی نے آکر کہا "پانی گرم کب کا ہو چکا ہے نہانا نہیں ہے کیا؟"

"ہوں"

"ترکاری بھی لے آنی ہے۔ کمل کے اسکول کا بھی وقت ہو رہا ہے۔"

"ہوں"

"ہر وقت ہوں، ہوں کی رٹ لگائے رہتے ہو۔ پتہ نہیں دن بھر یوں ہی بیٹھنا کیسے اچھا لگتا ہے؟"

دتو ماما کبھی کسی بھی وقت غصہ نہ کرتے۔ اس وقت بھی انھیں برا نہ لگا۔ بس بیٹھے رہے، پھر کچھ دیر کے بعد اٹھے اب نہانا ہے، پھر پوجا! ساڑھے دس تو بجے ہی ہوں گے لیکن روز میں ہی کیوں پوجا کروں؟ ایک روز اگر گوپال راؤ پوجا کر لیں تو کون سی افتاد آپڑے؟ انھیں اور کوئی دوسرا کام بھی تو نہیں ہے!" دتو ماما گوپال راؤ سے مخاطب ہوئے "آج آپ پوجا کیجئے۔"

"میں کس لئے"

"مجھے بازار سے ترکاری لانا ہے۔"

"ہوں"

گفتگو زیادہ نہیں، البتہ نفی میں جواب صاف صاف!۔

گوپال راؤ کے ہاتھ میں ایک ناول تھا۔ اور وہ اب قریب ختم تھا۔ اب اگر یہ ناول ختم کیا جائے تو پھر دوپہر میں پڑھنے کے لئے اپنے پاس کیا رہ جائے گا؟ تو انھوں نے مجبور ہو کر دتو ماما سے کہا۔ "تم بازار کی طرف جا ہی رہے ہو۔ یہ کتاب دے کر نئی کتاب لے آنا۔"

"ہوں"

"اور ہاں آج کوئی نئی بھاجی لیتے آنا۔ یہ روز روز کدو اور گوار اب کھائی نہیں جاتی۔"

دتو ماما نے اپنے ہاتھ کی تھیلی ان کی طرف اچھالتے ہوئے کہا "تو پھر تم ہی جاؤ اور جو چاہے لیتے آؤ۔"

گوپال راؤ نے تھیلی سمیٹی اور دتو ماما کے ہاتھوں میں تھما دی۔ دتو ماما بھاجی لانے کے لئے بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔

گوپال راؤ نے سیتا بائی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا پکایا جائے گا آج؟" پھر من ہی من خوش ہو اٹھے چونکہ کھانا کھانے کی گھڑی قریب آرہی تھی۔

"وہی جو روز پکایا جاتا ہے۔"

"آج کے لئے بھجئے بنائے جائیں۔"

"آج تو ممکن بھی نہیں، تیل بھی ختم ہو رہا ہے۔" سیتا بائی نے جواب دیا۔

"تم تو روز ہی روتی نظر آتی ہو۔"

"میں کیوں یوں ہی روتی پھروں۔ سنسار کی تمھیں ذرہ برابر بھی خبر نہیں کہ کاروبار کس طرح چل رہا ہے۔ بس دو وقت بیٹھے بٹھائے کھا لیتے ہیں۔ کم از کم اس میں ہی خوش ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن تمھاری تو روز ایک نئی شکایت رہتی ہے۔ آج کہا تو بھاجی ہی اچھی نہیں۔ کل چپل ٹوٹ گیا ہے۔ پرسوں کچھ اور! میں تو اکتا چکی ہوں اس زندگی سے!"

گوپال راؤ خاموش ہو گئے۔ ان کا خاموش ہو جانا ہی ٹھیک تھا۔ اب وہ ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے۔

کھانا کھاتے وقت کمل نے کہا "بابا آج گھر قدرے دیر سے

ڈونگی :

سیتا بائی نے "ہوں" میں جواب دیا۔

گوپال راؤ نے اپنی گردن اُٹھائی اور پوچھا "دیر کیوں ؟"

"اسکول سے چھوٹتے ہی آج بگھرتا ہے" کمل نے جواب دیا

"یہ اچھی بات نہیں "۔

کمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گوپال راؤ نے کہا "ان تمام باتوں کے لئے گھر میں پیسہ ہے!"

"پیسہ اگر نہ بھی ہو تو کیا جوان لڑکیوں کو اپنی خواہشات دبا دینا چاہیے ؟" سیتا بائی نے فوراً جواب دیا۔

کمل نے کہا "آپ جو ہر ماہ لائبریری کے تین روپے بھرا کرتے ہیں !"

گھر میں آنے والے اخبار اور لائبریری کے ان تین روپوں کو لیکر ان پر ہمیشہ ہی طنز کیا جاتا تھا۔ گوپال راؤ اس بات کے بھی عادی ہو چکے تھے۔ گوپال نے خاموشی مناسب نہیں سمجھی اور بات کو دوسرا رخ دیتے ہوئے کہا "وِمل بھی تو ان دنوں گھر دیر سے ہی آیا کرتی ہے "

وِمل کی تاخیر کی وجہ صرف سیتا بائی کو معلوم تھی۔ وہ پڑوس کے مدھو کے گھر جایا کرتی تھی۔ البتہ اسے بھی جب کبھی آنے میں زیادہ دیر ہو جاتی تو سیتا بائی بے حد بے چین ہو جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھار تو وہ سوچا کرتیں کہیں نہ اس کا مدھو کے گھر ہی جانا بند کر دیا جائے۔ لیکن روکنے کی کبھی ہمت نہ ہو سکی۔ چونکہ وِمل تنک مزاج تھی۔ گھر میں سیدھے منہ وہ کسی سے بات تک نہ کرتی تھی۔ اگر سیتا بائی روک بھی دیتیں۔ تب بھی وہ ضرور مدھو کے گھر جاتی۔ اس لئے وہ کبھی اس کی راہ میں حائل نہ ہوئیں۔

جس وقت کمل اسکول کے لئے روانہ ہوگئی گیارہ بج رہے تھے۔

اس کے بعد گوپال راؤ، وِمل اور دتو ماما اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔ اور آرام کرنے لگے۔ سیتا بائی نے البتہ آج کا اخبار دیکھا اور شام کے لئے چاول صاف کر کے رکھ دیئے۔

ایک بج گیا — منڈلی سوئی ہوئی تھی۔

دو بج گئے — منڈلی سوئی ہوئی تھی۔

تین بج اُٹھے — منڈلی سوئی ہوئی تھی

ساڑھے تین بجے گوپال راؤ جاگ گئے اور وہ بستر چھوڑ کر کرسی پر براجمان ہو گئے ان کے فوراً بعد دتو ماما اُٹھ بیٹھے اور کرسی پر براجمان ہو گئے۔ اور دونوں ہی چائے کا انتظار کرنے لگے۔ وِمل بھی جاگ رہی تھی، البتہ اس نے اٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ چائے تیار ہونے سے قبل وہ کبھی بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتی تھی۔

چائے تیار ہو گئی۔ پڑوس کے کاکا آ گئے۔

"آئیے کاکا" گوپال راؤ نے ان کا سواگت کیا۔ تیسرا ایک آدمی تینوں تاش کھیلا کرتے۔ کھیلتے وقت اکثر جھگڑا کیا کرتے۔ پھر بھی روزانہ کاکا ٹھیک چار بجے حاضر ہو جاتے۔

"چائے تیار ہے نا ؟"

دتو ماما نے صرف اپنی گردن ہلائی۔

گھڑی کا پنڈولم ہل رہا تھا اور وقت آگے کی جانب دوڑ رہا تھا۔ پانچ، چھ، پھر بھی رمی جاری تھی۔ وِمل ساڑھے پانچ بجے ہی نکل گئی تھی۔ کمل آج تاخیر سے گھر لوٹنے والی تھی۔ سیتا بائی بے حد اداس ہو گئیں روز وہی چہرے، وہی کام، وہی گھر، وہی لوگ! اتنے میں دنیش پانڈے نے آواز دی "کیوں تائی کیا ہو رہا ہے ؟" سیتا بائی نے آواز پہچان لی۔ انھیں قدرے خوشی ہوتی۔ چونکہ اب ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی فرصت ہی تھی۔ اور دنیش پانڈے بے حد باتونی تھا۔ دنیش پانڈے آ گئے، کھیل تب بھی جاری رہا جیسے کوئی آیا ہی نہ ہو۔ سیتا بائی اُن کے ساتھ باتوں میں جُٹ گئیں جب سیتا بائی نے اُن کے لئے چائے بنانے باورچی خانے کا رخ کیا تو گوپال راؤ نے کہا "ہمارے لئے بھی!"

شام ہو گئی اندھیرے نے اپنے جال پھیلائے سیتا بائی نے دیا جلایا۔ ایسے وقت میں آدمی تھک ہار کر گھر لوٹتے ہیں، مگر ہمارے گھر کے مرد تو ہر وقت گھر ہی میں رہا کرتے ہیں — لڑکیاں واپس آ گئیں، قدرے گھر میں جان آ گئی۔ باہر کی کھلی فضا اور باہر کی باتیں۔ اپنے رشتے دار تو مدد کرنے سے رہے۔ لڑکیوں کے بیاہ کرنے میں، لیکن اس کے لئے بھی تو کوشش درکار ہے۔ میرا تو اب جی اوب چکا ہے "

کمل نے کہا "اگر میں تمھاری جگہ پر ہوتی تو یقیناً اب تک بھاگ چکی ہوتی "

"میں تو اب بھی بھاگنے کی سوچ رہی ہوں۔" ویمل نے کہا۔

"میں کہاں سکھ کی زندگی گزار رہی ہوں" سیتا بائی نے فوراً اپنا بازو صاف کیا۔

دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ گوپال راؤ اکثر ہی رات میں سونے سے قبل گھر میں اندر سے تالا لگا لیتے تھے۔

ایک روز ٹروس کے گھر میں ڈاکیہ جاتا دکھائی دیا۔ کمل جب آکر دروازے ہی میں کھڑی ہو گئی۔ خطوط کبھی کبھار ہی آیا کرتے تھے۔ اور جب بھی آتے سبھی اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے، آج ڈاکیے نے ایک لفافہ لاکر دے دیا تھا۔ کمل نے لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کیا۔ ویمل نے بھی جھانکنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔

"کس کے نام ہے؟" سیتا بائی نے پوچھا

"تمہارے ہی نام"

"میرا چشمہ لے آؤ۔"

دونوں نے ہی ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور جب وہ مکمل خط پڑھ چکیں تو سیتا بائی کے حوالے کر دیا۔

"کس نے لکھا ہے؟"

"پنڈت نے!"

"کیا لکھا ہے خط میں؟"

"اس کا تبادلہ ہو گیا ہے اپنے گاؤں میں۔"

"کب آ رہا ہے؟ کہاں اترے گا؟ کہاں رہے گا؟"

"اپنے ہی گھر، آئندہ ہفتے آ رہا ہے۔"

گوپال راؤ اور دتو ماما خاموشی سے سن رہے تھے۔ دونوں کو اس کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کے لئے بس ایک آدمی اور بڑھ جائیگا۔ پھر بھی گوپال راؤ نے کہا۔ "جگہ ملنے تک یہاں رہے گا نا؟ یا سرے سے یہیں کا ارادہ ہے؟"

"مفت میں نہیں رہے گا وہ" سیتا بائی نے کہا۔

کمل نے اپنی ماں سے کہا۔ "ماں اس بارے میں اسے پہلے ہی صاف صاف بتا دینا۔"

"آخر تم لوگوں کو اس قدر بے چینی نے کیوں آ گھیرا ہے؟ سارا کام تو میں ہی کروں گی۔ مجھے ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد کے دن بہت جلد ختم ہو گئے۔ خالی کمرہ صاف کر دیا گیا اور ہوا کے جھونکے آنا شروع ہو گئے۔ کمرے میں ایک پلنگ لاکر رکھ دیا گیا۔ ایک ٹیبل اور ایک کرسی جو کچھ بہتر حالت میں تھی۔ پلنگ پر ایک صاف چادر بچھا دی گئی۔ ویمل اور کمل تو بار بار اس کمرے میں آکر بیٹھ جاتیں اور کہتیں "کتنا اچھا لگ رہا ہے اب اس کمرے میں۔"

پنڈت آ گیا اور گھل مل گیا۔ بہت ندر سے پہنا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ آیا ہوا سامان بھی اسی کی طرح خوبصورت تھا۔ ایک چمڑے کا بیگ جو چاروں طرف سے بند تھا۔ ایک اٹیچی اور اس کے ساتھ ہی میں ایک اور چھوٹا بیگ۔ جوتے بہت ہی چمکدار، پالش کئے ہوئے، اور ایک جوڑ سلیپر۔ کپڑے بہت ہی صاف! وہ اپنے ساتھ ہینگرس بھی لے آیا تھا جس پر اس کے کپڑے لٹکتے رہتے۔ کپڑوں کا بیگ کھولتے ہی اس میں سے عطر کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ عطر اسے بہت پسند تھا۔ ٹیبل پر گھڑی، شیو کرنے کا سامان، پین، سگار کیس رکھتا تھا۔ داڑھی آدھے گھنٹے تک ہوتی رہتی تھی۔ بالکل ہلکے ہاتھوں سے۔ داڑھی کے بعد کوئی کریم استعمال کیا کرتا۔ پھر دانت صاف کئے جانے کے بعد کندھے پر تولیا سنبھالے اور ہاتھ میں صابن دانی لئے نہانے کئے باتھ روم کی طرف چلا جاتا۔ اس کے باہر آنے کے بعد بھی حمام خوشگوار صابن کی خوشبو سے بھرا رہتا۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے کھانے کے باورچی خانے کا رخ کرتا اور سیتا بائی گرم گرم روٹیاں پروستی جاتیں۔ ان سے باتیں کرتا ہوا وہ کھانا کھایا کرتا کھانے کے بعد اور دفتر سے واپس آتے وقت اکثر اس کے ساتھ اس کے دوست رہا کرتے۔ گھر پر بھی ایک سا چائے پی لیتے۔ پھر سگریٹ، اس کے بعد باہر چلے جاتے۔ ہر اتوار کو پکچر دیکھنا ضروری تھا۔ اتوار کی شام کو وہ گھر پر کبھی کھانا نہیں کھاتا، باہر ہی سے کچھ نہ کچھ کھا کر آ جاتا۔ رات میں جلد سونا اسے پسند نہیں تھا۔ اکیلے ہی کمرے میں سگار پھونکا کرتا۔ قدرے تنک مزاج تھا۔ نوکرانی کو اکثر ڈانٹتا رہتا۔ دھوبی کی بھی شامت آ جاتی۔ مردوں کا یہ بھلا اوتار تھا۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور اونچی آواز سن کر سیتا بائی بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔

پنڈت کے آنے کی وجہ سے گھر میں روشنی آ گئی۔ اس نے ٹیبل پر

نیا کپڑا لاکر بچھا دیا۔ نئی چادر خرید لایا۔ نئی چائے کی پیالیاں آ گئیں، البتہ وہ اس وقت باہر آتی تھیں جب اس کے دوست آجایا کرتے تھے۔ وہ اپنے لئے چائے بھی خرید لایا تھا۔ یہ چائے صرف اس کے لئے ہی بنائی جاتی کیونکہ اُسے گھر کے لئے خریدی ہوئی چائے پسند نہیں تھی۔ دوستوں کے آنے پر دتو ماما اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے جاتے۔ مگر گوپال راؤ وہیں ڈٹے رہتے اور پھر مجبوراً انھیں ان کے ساتھ چائے پینی ہی پڑتی۔ چائے لاتے وقت کمل بار بار آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ اب وہ ہر وقت بنی ٹھنی نظر آتی تھی۔ پنڈت کے سارے دوستوں سے وہ واقف ہو چکی تھی کبھی کبھار پنڈت کے دوست اس سے مذاق بھی کیا کرتے۔ گوپال راؤ جانے کے بعد بھی وہیں بیٹھا کرتے، اور ان کے ساتھ سگار پیا کرتے۔ پہلے پنڈت اپنے دوستوں سے گوپال راؤ کا تعارف کراتا، مگر بعد میں اس نے یہ بھی چھوڑ دیا۔ پہلے وہ انھیں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا، مگر اس نے وہ بھی چھوڑ دیا، دل میں کچھ نہ کچھ باتیں بھی ہو جاتیں مگر اس نے ان سے بات تک کرنا چھوڑ دیا۔

ایک دوپہر پنڈت اپنے دفتر سے جلد لوٹ آیا۔ گوپال راؤ اس کے کمرے میں ہر چیز کو بغور دیکھ رہے تھے۔ پنڈت نے ان سے پوچھا "کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" گوپال راؤ نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہنے لگے۔ گوپال راؤ من ہی من میں اسے کوسا کرتے، "کم بخت میرے ہی گھر میں رہتا ہے اور اس پر رعب جماتا ہے، کبھی گوپال راؤ خود کھانے کے لئے بیٹھ جاتے اور باہر نکلنے کا نام نہ لیتے۔ پنڈت کو اداس دیکھ کر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ ایک بار پنڈت دتو ماما کو اپنے ساتھ پکچر لے گیا۔ اس کے بعد اکثر دتو ماما کو طنز کیا کرتے "بھئی تمھارے تو اب مزے ہی مزے ہیں!"

ایک روز سیتا بائی نے پنڈت سے پوچھا "آج کل تم بدلے بدلے سے کیوں نظر آتے ہو؟ نہ روز کھانا کھاتے ہو، نہ کسی سے بات کرتے ہو!"

"کس کے ساتھ بات کی جائے؟ کھانا کیسے کھایا جائے۔ ایک تو بھی ترکاری اچھی نہیں رہتی۔ کوئی مجھ سے ملنے آئے تو گھر کے لوگ وہیں ڈٹے رہتے ہیں۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ دوسری جگہ دیکھ لی جائے۔"

سیتا بائی کو قدرے غصہ آگیا مگر کیسا بھی ہو کام آدمی ہے۔ جب اپنے من کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ ناراض ہو ہی جاتا ہے۔

"تمھیں جو ناپسند ہو بخوبی کہہ سکتے ہو۔"

"دو وقت کھانا مل جاتا ہے، بس غنیمت ہے۔ احسان ہے تمھارا۔"

سیتا بائی کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"رونے کی کوئی ضرورت نہیں، مہربانی کر کے آنسو نہ بہاؤ۔" کہہ کر پنڈت اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اب اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ سیتا بائی کو بہت دکھ ہوا کرتا تھا، بچپن ہی سے اچھے حالات میں زندگی گذارنے اور پھر اب جوانی — ایسے لڑکوں میں تھوڑی مستی رہا ہی کرتی ہے۔ پہلے تو اپنا گھر پرانا ہو گیا پھر گھر کے لوگ گھر میں نہ رہنے کے برابر ہیں۔ اس پر وہ چار لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں۔ آدابِ محفل سے واقف نہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے وہاں جا کر بیٹھنے کی، خود اسے بھی تو سمجھنا چاہئے۔ دوسروں کے گھر میں رہتا ہے اس طرح سے کوئی کس کا رعب سہہ سکتا ہے؟ گوپال راؤ کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے تیار نہیں۔ کمل کے ساتھ نہ بیٹھے بھیجا کرتا ہے۔ کمل بھی ان دنوں اور کچھ کام کرتی ہی نہیں بس دن رات پنڈت کے کمرے میں رہا کرتی ہے۔ اس سے صاف صاف کہہ دینا چاہئے، مگر وہ اپنا کہا مانے گی جب نا! دتو ماما بھی عجیب ہیں، اس روز پنڈت کا رومال لئے نہانے چلے گئے۔ سیتا بائی کو پنڈت پر غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ اسے اپنے گھر میں رکھنا بھی چاہتی تھیں۔ اس کی وجہ سے گھر میں جھگڑے کم ہوا کرتے اور گھر بھرا بھرا لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے کل ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کرے۔ کم از کم اتنا ہی بھار کم ہو جائے گا۔

ایک رات، وہ اس کے کمرے میں چلی گئیں۔ پنڈت سگار پی رہا تھا اور نجانے کیا سوچ رہا تھا۔

"تمھیں کوئی تکلیف ہے کیا۔؟" سیتا بائی نے پوچھا۔

"کوئی تکلیف نہیں۔"

"تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔ اس طرح ناراض

کیوں رہا کرتے ہو۔؟

"وہ قدرے مسکرایا۔ اور کہہ اٹھا۔ آپ چھوٹی ہیں ابھی!"

سیتا بائی نے تعجب خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس دنیا میں جو نرمی سے رہتا ہے وہ ہر وقت دبایا جاتا ہے۔ اس لئے سخت رہنا ہی بہتر ہے، آپ نے دنیا کہاں دیکھی ہے ابھی!"

"میں نے بچپن میں سادگی سے رہنے کی کوشش کی تو یہ سادگی کام نہیں آئی"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں" سیتا بائی نے کہا

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ ابھی بہت چھوٹی ہیں۔ دنیا نہیں دیکھی ہے آپ نے اس چھوٹی سی عمر میں میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے"

"کتنے ہی لوگ تو تم پر جان چھڑکتے ہیں۔ پھر یہ حال کیوں؟"

"اور ہاں کل جب بیوی آجائے گی تو ایک اور آدمی پیار جتانے والا کہلائے گا"

"واہ کیوں نہیں"

"بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"بیاہ ــ" پنڈت نے بہت دور اپنی نظریں دوڑائیں۔

"لڑکی کہیں طے ہو چکی ہے کیا؟"

"اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بیاہ تو کرنا ہی لیکن مناسب لڑکی ملتی ہی نہیں"

"یعنی ــ؟"

"وہ لڑکی مجھ سے پیار کرے گی اس کا کیا ثبوت ہے؟"

"کیا کمی ہے تم میں؟ خوبصورت بھی ہو اور اچھی نوکری بھی ہے!"

"کیا عورتیں صرف اسی لئے پیار جتاتی ہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں"

"میں سب جانتا ہوں۔ بہت ساری لڑکیاں دیکھ لی ہیں میں نے!"

"کب دیکھ لیں؟"

"میری اب تک کی زندگی میں کل چھ لڑکیاں آ چکی ہیں"

سیتا بائی پر اوس پڑ گئی۔ مگر انہیں اس بات کی خوشی ضرور ہوئی کہ پنڈت نے ان پر دوستی کر کے اس مسئلہ پر کھل کر بات چھیڑی تھی۔

ان چھ لڑکیوں میں سے صرف ایک ہی مجھے سب سے زیادہ چاہتی تھی۔ اس کے خطوط آج بھی آتے ہیں، دیکھنے ہیں آپ کو؟" پنڈت نے فوراً ان کی طرف دو چار خطوط پھینک دیئے۔ سیتا بائی نے ڈرتے ڈرتے ایک خط اٹھا لیا۔ کاغذ پر دستخط نہیں تھے۔ خط پڑھنے کا ان کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔

"کیوں بیاہ نہیں کرتے اس کے ساتھ؟"

"وہ تو ودھوا ہے۔ دو لڑکے ہیں اس کے۔ ان کو پسند نہیں آئے گی۔ ان میں سے ایک بہت ہی چنچل تھی۔

یعنی ــ؟" اس کا مطلب وہ سمجھ نہیں پائیں۔ البتہ ان میں پوچھنے کی ہمت بھی پیدا نہیں ہوئی۔

"ان دنوں میں قدرے چھوٹا تھا۔ ہمارے یہاں کسی کا بیاہ تھا اس نے مجھے بلایا اور اندھیرے کی طرف لے گئی اور پھر ....!

سیتا بائی سن نہ سکیں ــ وہ اندھیروں سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اندھیرے میں قریب آنے والے مرد اور عورت! لمحے بھر کو وہ سب کچھ بھول گئیں۔

"میں جانتا ہوں یہ سب کچھ سننے کے بعد آپ کا وشواس مجھ پر سے اٹھ جائے گا۔ ہو سکتا ہے آپ اپنی لڑکیوں کے بارے میں احتیاط برتنا شروع کر دیں۔ گوپال راؤ یوں بھی تو پہرہ لگائے ہی رہتے ہیں۔ آپ بھی وہی راہ اختیار نہ کیجئے اور مجھ پر بھروسہ رکھئے۔

پنڈت کے جیسا آدمی اس قدر صفائی سے ان سے باتیں کر رہا تھا اس لئے انہیں ایک گونہ سکون ہو رہا تھا۔ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کمل پر نظر رکھنی چاہئے۔ دل چالاک ہے وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ لیکن پنڈت تو کم از کم اپنی لڑکیوں سے متعلق ایسا نہیں کرے گا۔

کمل دن رات پنڈت کے کمرے میں رہا کرتی صبح اسے شیو کا سامان پہنچاتی۔ نہانے کے لئے کپڑے لے جا کر دیتی۔ اسی وقت جب وہ کھانے کے لئے بیٹھا کرتا وہ وہیں رہا کرتی۔ کبھی کبھار وہ کمل سے کہتا "کمل آج کھانا تم پروسو" کمل بے حد خوش ہو جاتی۔ ہر وقت اس کے آس پاس رہتی جب وہ دفتر چلا جاتا اپنے آپ کو تیار کرلیتی اور اسکول کا راستہ لیتی۔ سیتا بائی اسے ٹوکا کرتیں، مگر وہ ان کی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا کرتی۔ شام کو واپس آتے ہی پھر وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر

کی باتیں کیا کرتی۔ پنڈت کبھی باتیں کیا کرتا، کبھی اس کی طرف دیکھا کرتا کمل اس کے نزدیک رہنے میں خوشی محسوس کیا کرتی تھی۔

"میرے دفتر کی کلرک اسی روز کہہ رہی تھی۔ تمہارے بال کتنے نرم ہیں۔ البتہ کچھ لوگوں کو تو ہماری کوئی چیز پسند نہیں آتی۔" پنڈت کمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کرتا۔ کمل ان باتوں کا مطلب تو سمجھ جاتی مگر جواب اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی وہ پوچھا کرتی۔ "کیسی لگتی ہوں میں۔؟"

"بہت ہی خوبصورت۔"

"کون کون سی چیزیں خوبصورت لگتی ہیں؟"

"تمہارے بال، آنکھیں، لیکن صرف ان کی تعریف کرنے سے کیا ہوتا ہے:

"میرا بیاہ ہوگا نا؟"

"کیوں نہیں۔ بیاہ ہوگا۔ ضرور ہوگا۔"

وہ اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر ہمت نہ ہو سکی۔

ایک بار پنڈت تین چار روز کے لئے گھر چلا گیا۔ اور واپس آتے وقت کمل کے لئے بلاؤز کا کپڑا لے آیا۔ جب اس نے بیگ کھولا تو کمل کی طرف دیکھ کر کہہ اُٹھا "آج تم بہت خوش نظر آ رہی ہو؟" پھر اس نے کپڑا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا کبھی ہماری یاد بھی آئی؟"

کمل نے وہ ریشمی کپڑا لیتے ہوئے کہا "کیوں نہیں"

"سچ"

پنڈت نے اپنی جگہ چھوڑی اور کمل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسی وقت وِمل دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور اس نے کہا "چلو کھانا تیار ہے۔"

"بس آ رہا ہوں۔"

وِمل کے جاتے ہی اس نے کمل کو پھر سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اس رات کمل سو نہیں پائی۔ رات بھر وہی پنڈت کے لمس یاد آتے رہے۔ اس کے گرم ہونٹ یاد آتے رہے۔ دوسرے روز کمل کا اسکول میں دل نہیں لگا اس لئے وہ دوپہر ہی کو واپس آ گئی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ پنڈت بھی دوپہر میں گھر واپس آ گیا تھا۔ سارے لوگ سو رہے تھے اور پنڈت کے کمرے میں صرف پنڈت اور کمل۔۔۔۔۔

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ صبح قریب نو بجے سیتا بائی نہانے چلی جاتیں۔ دتو ماما ترکاری لانے بازار چلے جاتے۔ کمل سیدھی پنڈت کے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی کبھار اگر وہ نہیں آتی تو پنڈت ناراض ہو جاتا اور دو دو روز تک بات نہیں کرتا۔

ایک شام کمل اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی۔ اس نے لال چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ آتے ہی وہ سیدھی پنڈت کے کمرے میں چلی گئی اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے لے جاتے ہوئے کہہ اٹھی۔ "دیکھو یہ لال چوڑیاں۔۔۔!"

لیکن پنڈت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمل نے پیچھے مڑ کر دیکھا گوپال راؤ کھڑے تھے۔ انھوں نے صرف اتنا کہا۔ یہ اچھی بات نہیں۔

کمل قدرے سہمی مگر اُسے غصہ بھی آ گیا۔ گھر کے باقی کاموں میں ان کا کوئی دھیان نہیں رہتا۔ یہاں برابر چلے آتے ہیں، میں نے صرف چوڑیاں ہی تو دکھائی ہیں۔ کیا اتنا بھی وشواس نہیں۔"

گوپال راؤ نے مجبوراً کہا "میرے سر میں آج سخت درد ہے اس لئے میں نے۔۔۔۔۔!" البتہ کمل سیتا بائی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔

انھوں نے فوراً کہا۔ "یہ اچھی بات نہیں۔ ان کو پسند بھی نہیں۔ کل وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ پھر تو کیا کرے گی؟ کس کو روتی پھرے گی؟"

"ماں چلو اسی وقت اور اس سے میرے بیاہ کے بارے میں پوچھو مجھے یقین ہے وہ مجھ سے بیاہ کریں گے۔"

اس کے بعد وہ جب بھی پنڈت کے کمرے میں جایا کرتی گوپال راؤ کچھ عجیب عجیب نظروں سے اُسے دیکھا کرتے۔ اور اسے پنڈت کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔

پشپا، پنڈت کے دفتر میں کلرک تھی۔ ایک شام وہ پنڈت کے ساتھ گھر چلی آئی۔ پنڈت نے سیتا بائی کا اس سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد وہ اکثر ہی آیا کرتی۔ خوبصورت تھی، خوب سیرت بھی تھی۔ سیتا بائی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ چائے پیتے وقت اکثر اپنی چائے میں سے گوپال راؤ کو دیا کرتی۔ وِمل کو کتابیں دیا کرتی۔ اور باقی اوقات میں وہ پنڈت کے کمرے میں بیٹھا کرتی۔ پنڈت اس سے بہت کم باتیں کیا کرتا۔ پشپا کمل سے

کمکرتی

"شاید کچھ لوگ ہم سے آج ناراض ہو گئے ہیں" کبھی کبھا وہ زچ آکر کہہ دیتی "آج کب سے یہاں بیٹھی ہوں لیکن کچھ لوگ تو۔۔۔۔!" کمل کو اس پر رحم آ جاتا اور اپنے متعلق سوچ کر من ہی من میں خوش ہو اٹھتی۔

ایک روز پشپا اتوار کو چلی آئی پنڈت بکچر کے لیے چلا گیا تھا پشپا اور کمل باہر جانے کے لئے نکلے۔ راستے میں دونوں ہی پنڈت سے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔

"آفس میں ان کا برتاؤ کیسا ہے؟" کمل نے پوچھا

"ہر وقت ہی غصہ میں رہا کرتے ہیں۔"

"تم سے بھی"

"ہاں اگر اس کے فوراً بعد مجھے کمرے میں بلا لیتے ہیں اور کہتے ہیں "ناراض مت ہونا" ان کے لئے تو ایک الگ کمرہ دے دیا گیا ہے۔"

"تم کیا کام کرتی ہو؟"

"ان کے ساتھ ہی کام کرتی ہوں۔ کمل تم سے ایک بات کہوں کسی سے کہو گی تو نہیں؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں!"

"وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے؟"

"اری وہ کمرے میں بلا کر مجھے اپنے قریب کر لیتے ہیں۔"

"سچ کہتی ہو پشپا؟"

کمل سہم گئی۔ اسے ایک دھکا سا لگا۔ مگر پشپا سچ کس طرح سے کہہ رہی ہوگی؟ اگر میں پنڈت سے پوچھ لوں اور وہ مجھ سے خفا ہو جائیں تو! بات ہی کرنا بند کر دیں تو؟"

ومل کو اب گھر کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ سارا دن اور رات اپنے ہی خیالوں میں مگن رہا کرتی، مدھو سے متعلق سوچا کرتی۔ وہ اگر پنڈت کے کمرے میں آجاتی تو وہ اسے روکانے کی کوشش کرتا۔ ایک بار اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا کرتے ہیں تمہارے وہ؟"

"لیکن تمہیں کیسے معلوم؟"

"سب معلوم ہے مجھے!"

"لیکن کیسے۔ کس نے کہا تم سے یہ سب؟"

"پرسوں تم دونوں گھومنے کے لئے جا رہے تھے نا!"

ومل کو محسوس ہوا کیوں نہ وہ اور بھی بہت کچھ مدھو سے متعلق پنڈت کو آگاہ کرے۔ پنڈت نے بھی وعدہ کیا کہ وہ ان دونوں کی ہر ممکن مدد کی کوشش کرے گا۔

اس کے بعد کمل کی ماں سے ومل کبھی پنڈت کے کمرے میں آنے لگی۔

"کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے مدھو نے!" پنڈت نے پوچھا۔

"انٹر تک"

"نوکری ۔۔۔؟"

"ہاں!"

"کیا تنخواہ پاتے ہیں؟"

"ہوگی یہی ڈیڑھ سو تک۔"

"کیا ان روپیوں میں تمہارا سنسار چل سکے گا؟ ٹھیک سے طرح سوچ لو۔ یہ پیار محبت سب جھوٹی باتیں ہیں۔"

"مجھے کسی کا سہارا نہیں سبھی اداس ہو جاتے ہیں کبھی کبھار وہ بھی۔۔۔ وہ تو کہہ دیتے ہیں صرف تمہاری پیار ہے مجھے۔"

"غلط نہیں کہتا وہ بھی!"

ومل رو پڑی۔ پنڈت اس کے قریب گیا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ اٹھا۔ "میں ہر وقت تمہاری مدد کروں گا۔"

I will be always on your side

گھر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کمرہ اکثر کھلا رہتا۔ اندر دھول آ جاتی گرم ہوا کے بھوارے اڑتے رہتے۔ دھول سے اٹی ہوئی کتابیں کونے کھدرے میں پرانا سامان، گیارہ بج چکے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"کیوں ومل آج کہاں گئی تھیں گھومنے کے لئے؟"

"کل دیکھا تھا میں نے تمہاری سہیلی کو۔ سائیکل پر جا رہی تھی۔"

"کیوں کمل کسی نے کہا کیا؟" بیتا بائی نے پوچھا

پنڈت نے کمل کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بس یونہی

چلّا اٹھی ہوگی!"

سیتا بائی کو اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا۔ بعد میں وہ بھی اندھیرے کی عادی ہو چکیں۔

گوپال راؤ نے اپنی جگہ چھوڑی اور بیڑی پیتے ہوئے کھڑکی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ چاروں طرف خاموشی اور گہرا اندھیرا۔ کہیں سے آواز آئی۔ "شاید کوئی جاگ رہا ہے"۔

'کہاں گئے سب لوگ؟ غالباً پکچر دیکھنے گئے ہوں گے'! اس سے قبل بھی ایسی ہی آوازیں آتی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے پنڈت کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ "کہیں ایسا نہ ہو میرے قدموں کی چاپ کوئی سُن لے۔ چونکہ پہلے ہی سے ہمیں گالیاں کھانی پڑ رہی ہیں"۔ وہ دھیرے دھیرے کمرے کے دروازے میں جا کھڑے ہوئے۔ چاروں طرف اندھیرا کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ پنڈت آرام کر رہا تھا اور اس کے قریب ہی وِمل اور کمل بیٹھی ہوئی تھیں۔ کرسی پر سیتا بائی۔ کیا یہ سب کچھ روز ہی چلتا ہے؟ روز ہی یہ لوگ اس اندھیرے میں آ کر یہاں بیٹھ جاتے ہیں؟ انھیں ایک دھکا سا لگا۔ انھوں نے ایک لمبی آہ بھری۔ مگر ڈر کے مارے زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا۔ اپنے کمرے کی طرف واپس جاتے وقت ان کے قدم بہت ہی آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے دھیرے دھیرے وہ اپنی ساری توانائی کھو چکے ہیں۔ اور اب آگے بڑھنے کی ان میں کوئی ہمت نہیں رہی۔۔۔۔!!!

بابوراؤ باگل

کوبتا کا جنم

"گیٹ آؤٹ یو بلڈی بگر ....!"

اب تک یہی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بھرتی کرنے والے صاحب کی مغرور آواز، اس کی آتما پر، اس کے جسم پر بار بار سر اٹھا رہی تھی۔ وہ اپنی گردن نیچی کئے آگے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور ہر قدم اٹھاتے ہوئے اسے صاحب کا تربوز جیسا چہرہ دکھائی دیتا اور اس کے اس تربوز جیسے چہرے کو چیرنے کے لئے وہ جلدی جلدی آگے بڑھ رہا تھا۔

"تم نے میرا اپمان کیا۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟ تم کبھی نہیں جان سکتے کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میں کون ہوں!"

یکایک جیسے اس کے جسم میں بجلی دوڑ پڑی ہو اس کا خون کھول اٹھا۔ آنکھیں اندر کی جانب دھنس گئیں اور جس طرح طوفانی ہوا کے جھونکے کے ساتھ پرندے یکے بعد دیگرے آسمان کی جانب اڑنے لگتے ہیں، اسی طرح اس کی آتما سے ایک ایک لفظ باہر آنے لگا "یہ میرے ہاتھ حواس کے گرد باندھ دیئے گئے ہیں" اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے اور اس وقت غنڈے کے چاقو کے تیز پھل کی طرح صاحب کی مغرور اور نفرت سے بھری ہوئی آواز اس کے سینے میں اترنے لگی۔ ایک کھلبلی سی ہونے لگی۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد اندر کی اس کھلبلی نے لفظوں کا روپ دھارن کر لیا۔ "یہ ہاتھ جو صرف پیار سے پروان چڑھائے گئے ہیں جن پر زندگی کی ساری تاریخ کا انحصار ہے آج پھر دکھ کے داتوں تلے دبائے گئے۔" اور اسی وقت اس کے ہاتھ اوپر کی جانب اٹھے جوں ہی اس نے اپنے کالے کلوٹے ہاتھ دیکھے اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا لیکن جو کچھ اس نے اس وقت ہاتھوں کے متعلق سوچا تھا، ذہن سے فراموش ہو گیا اور پھر وہی جملہ گونج اٹھا "گیٹ آؤٹ یو بلڈی بگر ...!"

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ گردن جھک گئی۔ اور اس میں ایک قسم کا درد محسوس ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ اور پاؤں دھیرے دھیرے اپنی قوت کھو رہے ہیں، شل ہو رہے ہیں۔ پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے من میں بھی درد کی لہریں جاگ اٹھیں۔ کیا کیا جائے؟ راستے کے درخت سے وہ ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ لمحہ بھر کو اسے تسکین ہوئی اور دوسرے ہی لمحہ ناک، منہ اور آنکھوں سے گرم بھاپ سی آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ ان خالی ہاتھوں سے گھر میں کس طرح قدم رکھا جائے؟ لیکن کیا کیا جائے؟ کس طرح روپیہ حاصل کیا جائے؟ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کچھ بھی نہیں کر سکتا،" ناامیدی سے بھری ہوئی اس کی آتما بولی۔ "پورا ملک ایک بہت بڑے جیل کے مانند ہے اور میں اس جیل کا ایک قیدی ہوں اور یہ زندگی ایک سزا ہی ہے۔ لیکن یہ سزا مجھے کیوں؟ میری روح صاف اور آئینہ کی مانند شفاف روح نے اگر یہ کالا کلوٹا اور چھوٹا سا جسم اختیار کیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ شاید اسے کبھی ہر جنم میں صرف جلتے رہنے کی سزا ملی ہے لیکن نہیں میری روح گنہ گار نہیں ہو سکتی۔ میں تو طلوع ہونے والے نئے جیون کا ادیب ہوں۔ نئی روح کا جاننے والا ہوں۔" اس خیال کے آتے ہی وہ خوش ہو اٹھا وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اسی لگن میں وہ اپنی بھوک اور تھکان بھول کر اپنی ہی دھن میں آگے کی جانب چل پڑا۔ بس اس خوشی میں ایسے ہی کئی لمحے اور بیت گئے۔ اور کہیں دور کسی پہاڑ پر جس طرح یکایک کہیں سے کوئی چیل اڑتی ہوئی آکر بیٹھ جاتی ہے بالکل اسی طرح کچھ نہ کچھ اس کے دھیان میں آتا گیا۔ اور اس نے لفظوں کا روپ دھارن کر لیا۔

"اس وقت تم آسمان کی بلندیوں پر تھے" اس خیال کے آتے ہی وہ بے حد خوش ہو گیا۔

"اس وقت تم آسمان کی بلندیوں پر تھے اور جس چیز کی بھی تمنا کرتے تمھے مل جاتی تھی۔ ایک روز تم اندر دربار میں براجمان تھے۔ مجھے اندر کو نمسکار کرنے کہا گیا۔ جنت چھوڑنے کے لئے قطعی راضی نہیں تھے۔ کیوں نکال رہے ہو مجھے جنت سے؟ اور کہاں مجھے لے جایا جائے گا؟ اندر نے انسان کو مٹی میں ملا دیا۔ اور کہا جاؤ۔ بھارت میں، گھر میں رہو، دل میں بسو۔ مٹی کے بنے ہوئے اس انسان کو کتنی بڑی سزا دی گئی۔ دو زخ صرف دوزخ۔ نرک، جنت کا نرک۔"

"تمہاری اس پُر اثر تقریر کو سن کر اندر کی اجازت سے سورج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ خوب"۔ ہوا نے کہا۔ "بہت خوب" پانی نے کہا "بہت خوب" لیکن چاند نے ہنس کر کہا۔ "اے انسان میں تجھے دکھ میں بھی سکھ پہنچاؤں گا۔ ہر وقت تیرے ساتھ رہوں گا۔ جنت کے اس آرام نے آدمی کو آج پتھر بنا دیا ہے۔ سخت بالکل لوہے کی طرح!" یہ جملہ اس کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں کی طرح گونج رہا تھا۔ آتما کے اندر بجھتے ہوئے دیوں کو یکے بعد دیگرے جلا رہا تھا۔ اور اس کو اپنے بڑے پن کا احساس دلا رہا تھا۔ سب کچھ اپنے پاس ہے لیکن کچھ بھی نہیں۔ ماں اور بیوی میری ان تمام خوبیوں سے ناواقف ہیں۔

اسے نوکری کی کال آگئی تھی۔ بیکار سے بےگار بھلی۔ یہ کمپنی بھی اچھی خاصی تھی، بدیسی، ہندوستانی نہیں —— اس کے لئے اس نے دو ایک افسروں سے سفارشی چٹھیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔ بھرتی کرنے والے صاحب کا انداز جان کر اس نے شستہ گجراتی میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ صاحب نے پوچھا۔ "تم گجراتی ہو؟"

"نہیں میں مراٹھی ہوں۔ مگر مجھے انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی سبھی زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔"

"تمھیں یہاں ملازم رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ معقول آدمی ہو اور ہوشیار بھی!"

"کہا ہے کہا ہوشیار صاحب زندگی سے لڑ رہا ہوں زندہ رہنے کے لئے سر پٹ بھاگ رہا ہوں۔ اس مجبوری کی وجہ سے ہم گھر والوں میں سے کوئی اپنی جان دے دے یا پھر کسی کی جان لے لے۔ یہ سب کچھ ہونے دیا جائے اس لئے آپ کے پاس آ دھمکا ہوں۔ روز ہی دس در دار سے کھٹکھٹاتا ہوں، درخواستیں بھیجتا ہوں۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج جاتا ہوں، پھر روز ہی بھوکا پیاسا لائبریری کا راستہ لے لیتا ہوں۔ بہت کچھ پڑھا ہے میں نے۔ حال ہی میں مارکس ختم کیا ہے مارکس دی گریٹ، مجھے ہر بار خلیل جبران کی یاد ستاتی تھی۔ پیغمبر کی!"

"کمیونسٹ؟" صاحب کا چہرہ یکایک تبدیل ہو گیا۔

"نہیں صاحب صرف پڑھنے کی حد تک۔"

"گیٹ آؤٹ یو بلیڈی بیگر۔"

"نہیں صاحب، یہ ساعت کیجئے۔ اگر میں نے اسے نہ پڑھا ہوتا تو آج شاید دیوانہ ہو چکا ہوتا۔ صرف مطالعہ نے مجھے بچائے رکھا ہے۔ مجھے کوئی بھی نوکری دیجئے پیون، بھنگی، یہاں تک کہ میں آپ کے جوتے بھی صاف کر سکتا ہوں۔"

اس نے صاحب کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ مگر اس مغرور صاحب نے دربان کو آواز دے کر اسے کمرے سے باہر نکلوا دیا۔ باہر آنے کے بعد وہ شرم کے مارے دب سا گیا۔ اس بات کے یاد آتے ہی وہ بے چین ہوا اٹھا چلنے کی رفتار کم ہو گئی۔ اور اسی وقت ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جے بھیم ماسٹر"

جھونپڑیوں کے سکریٹری نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ بھی پہلے پہل بیکار تھا، پر اب سکریٹری بن گیا تھا۔ اس کی حالت سُدھر گئی تھی۔

"کیا طبیعت اچھی نہیں ہے؟" اس کے اداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سکریٹری نے پوچھا۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس لئے خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

"ڈیپوٹیشن لے چلا گیا تھا بالکل تمہاری ہی زبان میں صاحب سے باتیں کیں، رہنے کے لئے گھر نہیں دیتے۔ شہروں سے بھگاتے ہیں، وہاں پر بھی ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں۔ دماغی اور جسمانی دونوں ترقیاں

نہیں ہوپاتیں جھونپڑیوں میں رہنا اور روز نئے گناہ کا دامن تھامنا جوان بھائی بہنوں، اور ماں باپ کے سامنے عورت اور مرد کے جسمانی تعلقات آتے ہیں۔ نئی پود جنم لیتی ہے گردہ بھی خون اور شراب کی بھٹیاں دیکھتے ہوئے۔ ایسی جگہوں پر اپنے سے بھلا آتما کے اندر چھپے ہوئے بھگوان کو کس طرح جگایا جا سکتا ہے! لیکن صاحب! یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔ انسان کی آتما جل رہی ہے اور یہ جلتی ہوئی آتما کس کو جلا کر راکھ کر دے گی کہہ نہیں سکتے۔

"انھوں نے سب کچھ دینے کا وعدہ کیا۔ پہلے نال اور پھر سنداس"

"بہت خوب" کہہ کر وہ آگے کی جانب بڑھ گیا۔ مگر پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے اب وہ اپنی ساری قوت کھو رہا تھا۔ کھڑے رہنے تک کی شکتی اس میں نہیں تھی طبیعت اداس ہونے کی وجہ سے سکریٹری کی رپوٹ جو ماروتی کی دم کی طرح لمبی تھی، برداشت کرنا کٹھن تھا۔ جوں جوں وہ جھونپڑیوں کی طرف بڑھنے لگا اسے احساس ہونے لگا کہ آج اس طرف بھیڑ جمع ہو رہی ہے لوگ شراب پی کر جھوم رہے ہیں — لڑکھڑا رہے ہیں۔ اس جگہ کو چھوڑنے کا خیال پھر اس کے دماغ میں جاگ اٹھا۔ مگر مالی حالات کی وجہ سے وہ اس جگہ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بس اس زبردستی سے لادے ہوئے بوجھ کو اٹھانا ہی ہے۔ وہ جھونپڑیوں کے اس علاقے میں داخل ہو گیا۔ لوگ پی رہے تھے، جھگڑ رہے تھے۔ کہیں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو من کو سکون دے سکتی ہو۔ مکھیاں اور مچھر بھنبھنا رہے تھے، لڑکوں نے جگہ جگہ پاخانہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنی جھونپڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ملاّ پا ہاتھ بھٹی والے سیٹھ نے آواز دی۔

"ارے اے ماسٹر! ادھر آؤ"

ملاّ پا کا لہجہ اسے بالکل پسند نہیں آیا۔ مگر وہ اس کی جھونپڑی کی جانب مڑ گیا۔ ملاّ پا ننگ دھڑنگ باہر اپنی بڑی سی توند کے آگے ٹرانسسٹر رکھے سن رہا تھا۔

"کتنے میں لیا؟"

"ساڑھے آٹھ سو میں!"

"کہاں گئے تھے —"

"کال آ گیا تھا نوکری کا"

"لگ گئی؟"

"نہیں!"

"سالے تم پڑھے لکھے لوگ۔ کیا ملے گی نوکری تمھیں! دھندا کرو دھندا، نہیں تو میرے یہاں نوکر ہو جاؤ۔ حساب کتاب کرو دو سو دوں گا۔ کھانا، پینا الگ، مرغی، مٹن سب کچھ!"

یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ مگر اسے برداشت کرنا پڑا۔ چونکہ وہ ملاّ پا کے لڑکے کو انگریزی پڑھاتا تھا، دس روپے مہینے! ملاّ پا کا دھندا زوروں پر تھا۔ مال پہنچانے کے لئے روز سو روپے ٹیکسی پر صرف ہوتے تھے۔ دس روپے روز کے حساب سے دو تین کاریگر ہاتھ بھٹی پر کام کرتے تھے۔

کہو قبول ہے؟"

"ملاّ پا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کون ہوں کیا ہوں، اس کا تمھیں کوئی خیال نہیں؟"

"لیکن تمھیں ڈر کس بات کا پولیس تو میرے ہی قبضہ میں ہے — دیکھ لو اسی وقت اندر جا کر۔ دو چار پولیس اور حولدار اندر کھا پی رہے ہیں"۔

"لیکن مجھے نہیں چاہئے ایسی نوکری!"

"تیری بوڑھی کو بھی آج نوکری سے چھٹی دے دی گئی۔ اس بد دماغ بڑھی نے تیری بیوی کو خوب پیٹا۔ خون بہنے لگا اور پبلک نے بوڑھی کو"

یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"تمہارے گھر روز ہی جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ سالی ہماری اولاد انگریزی سیکھنے سے پہلے گالیاں دینا سیکھ جاتی ہے۔

"مت بھیجو کل سے اپنے لڑکے کو انگریزی سیکھنے کے لئے"

"کھاؤ گے کیا؟ پتھر!"

"اس کی فکر آپ کو کیا؟ میں کچھ بھی کھاؤں، آج سے اسے مت بھیجو۔" کہہ کر وہ آگے کی جانب بڑھ گیا۔

"سالا یہ ماسٹر بھی ماں کی طرح بد دماغ ہے" مذاق بھی نہیں سمجھ پاتا"

ملاّ پا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ واقعی وہ اگر اپنے لڑکے کا ٹیوشن چھڑا دے تو حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے۔ اکرا…ہ

سوچا کیوں نہ واپس جا کر اس سے لڑکے کو سمجھنے کے لئے درخواست کی جائے لیکن ایک شرابی نے اس کا مذاق اُڑایا تھا یہ خیال آتے ہی وہ اور بھی تیز تیز قدموں سے آگے کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی جھونپڑی کے آگے لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ لوگ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی ماں گالیاں دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت واپس چلا جائے اور لائبریری میں کتابوں کے مطالعہ میں اپنے آپ کو بھول جائے لیکن اب لائبریری کے بند ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ اسی وقت جیسے کسی نے اس کے سر پر کلہاڑی دے ماری۔ سکھو اس کی ماں کو گالیاں دے رہی تھی۔ کوڑھی، بھکارن، چنال کہیں کی، ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگی ہے۔

"کیڑے پڑ جائیں گے تمہارے منہ میں، زبان گل جائے گی۔"

"دیکھو دیکھو یہ اس نے ... کہتی ہے ... میرا لڑکا بالکل گائے کی طرح ہے اس لئے سب کچھ چل رہا ہے۔ نہیں تو اب تک اس نے گھر سے باہر نکال دیا ہوتا ... سر پھوڑ دیا، گلا کاٹ دے گی"

"ہاں۔ ہاں"

اسی وقت وہ سامنے آ گیا اور اس نے کہا: "سکھو اب بس کرو۔ زبان کو لگام دو۔" اسے دیکھتے ہی سکھو چپ ہو گئی اور پھر زور زور سے رونے لگی اس کا یہ رونا دیکھ کر سارے لوگ بڑھی کو گالیاں دینے لگے۔ بڑھی نے بھی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ وہ گھر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا: "جاؤ بھئی۔ بس ہوا۔ اب تماشہ نہ کرو۔ پلیز۔"

اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ لوگ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کی ماں کو گالیاں دیتے ہوئے اور کوستے ہوئے ایک ایک کر کے اپنی جھونپڑیوں کی طرف جانے لگے۔ بڑھی اور بھی زور و شور سے گالیاں دینے میں مصروف ہو گئی۔

"بس کرو ماں اب کسی کا دماغ چل گیا تو وہ تمہیں ہی ختم کر دے گا اور مجھے بھی۔"

"یہی اچھا ہو گا۔ تم مر جاؤ گے تو یہ ساڑھے ساتی ختم ہو جائے گی۔"

"یعنی تم گالیاں بکے جاؤ گی، دوسروں کی گالیاں کھاؤ گی، اس کے ساتھ ساتھ میری آبرو بھی گنواؤ گی۔"

"ماں!" کہہ کر اس نے اپنے لڑکے کی طرف خونی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اپنی ماں کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس لئے اس نے بیوی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ وہ تو خون سے تر ہو گیا تھا۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور اسی وقت اس کی نظریں اس کی لڑکی کی طرف چلی گئیں جو روتے روتے اب چپ ہو گئی تھی۔ مگر اس کی شکایت سے بھری آنکھیں دیکھتے ہی وہ بے چین ہو اُٹھا۔ وہ جس جگہ بیٹھی تھی وہیں اس نے پاخانہ کر دیا تھا، وہ لڑکی کی جانب مڑ گیا۔ مڑتے ہی اس کی ماں پھر چلا اُٹھی: "اے زن مرید وہ ابھی زندہ ہے، تیرے آتے ہی کیسے نخرے کرنے لگی۔" اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "دیکھو بچی نے پاخانہ کر دیا ہے تم اُٹھا لو یا پھر مجھے اسے اُٹھانے دو۔"

"تم ہی دے دو پانی، ورنہ جھکنے دو مکھیاں۔"

"لیکن تم دیوانوں کی طرح کیوں چلا رہی ہو۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ کیوں اس طرح گالیاں بک رہی ہو۔ لگتا ہے جیسے تم نے بھنگ کھالی ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

"پوچھو اپنی اس بہتی چنال سے" کیسے کتے لگا رکھے ہیں اپنے پیچھے۔"

ماں! اب تک سنبھلی نہیں اس بات کا احساس ہوتے ہی وہ غصہ سے چلا اُٹھا۔ "سندر کو کیا پوچھا جائے۔ تم نے تو اس کا سر پھوڑ دیا ہے۔ خون ہو جاتا اب تمہارے ہاتھوں!"

"مر جاؤ گے بند کہیں کے۔ بند۔ وہ غریب گائے ہے اور پیٹ میں پاؤں ہیں اس کے! تم کہاں واقف ہو اس سے؟"

"بس بند کرو ماں! اب سنا نہیں جاتا۔"

"وہ بارہ نخروں کی چنال دوزخی اس کی یہ عادتیں دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا، تو گالیاں دینے لگی۔ جو کچھ دل میں آتا ہے کر بیٹھتی ہے نوکری سے نکال دیا۔ پیسے طلب کئے تو چوکی پر لے جا کر بٹھایا۔ تین چار گھنٹے کے بعد لوٹی تو میں نے گالیاں دینا شروع کر دیں اس کی بہن سکھو بیچ میں ٹپک پڑی۔ اور میری گالیوں کا جواب دینے لگی مجھے اس نے خوب پیٹا دیکھو یہ ......!"

بڑھی کی ساری جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی بال بکھر گئے تھے گلے میں

باندھی ہوئی پٹی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی" یہ سب کچھ تمہاری بیوی کی وجہ سے ہوا۔ اس لئے میں نے اسے پیٹا۔ چل اب جو جی چاہے کرلے۔ جیل میں بے چل یا کچہری میں مقدمہ دائر کردے۔ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی یہ باتیں مجھے برداشت نہیں ہوتیں اس کی کمائی پر جیا مجھے پسند نہیں ۔۔۔ تمہیں اس کی پرواہ نہیں۔ صرف بیوی چاہیئے تجھے پالا پوسا، تعلیم دلائی۔ بھائی اپنے ساتھ رکھ رہا تھا پھر بھی میں تیرے ساتھ چلی آئی۔ مگر تجھے کوئی شرم بھی ہے اس بات کی؟"

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا

" اب میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ لڑکی مرنے کے قریب ہے اور تم سارا دن لائبریری میں۔ رات کو آتے ہو، پیٹ میں بھوک کی آگ رکھ کر سوتے ہو۔ پھر بھی جسم کی آگ بجھانے کے لئے بیوی کے پاس جاتے ہو۔ مر جاؤ گے! دیکھنا۔ مر و گے تو وہ کسی اور کے ساتھ دفان ہو جائے گی "

"توبہ توبہ۔ یہ تمہارا منہ ہے یا گندے پانی کی نالی!"

" میرا منہ گندے پانی کی نالی ہے ؟ دشمن میرے"۔ غصے سے ماں نے ہاتھ میں تھاما ہوا ڈنڈا دے مارا جو اس کے پاؤں پر جا لگا اور خون بہنے لگا۔

وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیران نظروں سے، جس نے اپنی پوری زندگی میرے لئے دے دی آج میری جان لینے پر کیوں تلی ہوئی ہے ؟ شاید اس لئے کہ اس کے ساتھ صرف چند ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ دن بھر بیوی کے ساتھ باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس کو دل کھول کر بات کرنے کا موقعہ ہاتھ آتا نہیں۔ اسی لئے وہ حسد کی آگ میں جل رہی ہے۔ لیکن میرے لئے اور کون سا راستہ بچا ہے ؟ بس وہی ایک ہے جو میرے اپنے دکھوں کو بھولنے کا سہارا ہے۔

پھر بھی اس نے سب کچھ پی لیا اور کہا " ماں مجھے معاف کردو "

ماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور باہر آ گئی " بیٹے میں نے تجھے مارا، تجھ پر ظلم کیا" وہ رو پڑی ۔۔۔۔ اور پھر روتے روتے بولی " میں نے آج تجھے یوں ہی بدنام کیا۔ تجھے مارا بھی۔ بھگوان اب مجھے اٹھا لے مجھے ختم کردے۔ مجھے ملادے " وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نے ڈر کے مارے اپنی بچی کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے جسم سے اب کوئی بدبو نہیں آرہی تھی۔ صرف روح کی گہرائیوں سے خیالات کے بادل اٹھ رہے تھے۔

" ماں! تمہارے ہاتھ جنھوں نے میری پرورش کی ان ہاتھوں سے دکھوں کو دور کر۔ آنے وقت اپنے ساتھ میری موت لیتی آ "

' موت آ۔ لینن کی عبادت کو قبول کر اور اے میری خوبصورت موت تو میرے پاس چلی آ "

پاخانے سے بھری ہوئی اس کی لڑکی اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھے سو رہی تھی اور وہ اسے اپنے سینے سے لگائے اس میں جنم لینے والے گرشنا کا اوتار دیکھنے کے لئے بے چین ہوا اٹھا تھا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جھونپڑی کی چھت دیکھ رہی تھیں۔ اس کی ماں دروازے میں کھڑی کب سے اسے تک رہی تھی۔ بیوی کب سے اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی، ہمارے اس جھگڑے کی وجہ سے ان پر کتنا اثر ہو گیا ہے۔ ماں کب سے اپنے آنسو روکے خاموش کھڑی تھی لیکن اسے کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی صرف دماغ میں ایک کے بعد دوسرے جملے رینگ رہے تھے خیالات پرواز کر رہے تھے۔

" موت!
تم آؤ گی ضرور۔
پر! آج ہی کیوں نہیں آتی ۔۔!
آؤ آج کہ ختم ہو جائیں
سارے احساسات!
بھر جائیں صدیوں کے گھاؤ
میں پھر سے جنم لئے آجاؤں گا دھرتی پر
کبھی کبیر کبھی عمر خیام کا روپ لئے
یا بادلوں کی مانند گھوموں گا
آسمانوں کی بلندیوں پر
یا کبھی گاؤں گا کومل گیت
اس لئے اے میری خوبصورت مہان موت۔
تم آؤ ۔۔۔۔ ابھی، اسی وقت!

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

بہترین اور نادر

تحائف اور عجائبات

کے انتخاب کے لئے

یوپی گورنمنٹ ہینڈیکرافٹس

(کے)

نئی دہلی، آگرہ، لکھنؤ، الٰہ آباد، کلکتہ، ناگپور

بھوپال اور حیدرآباد کے

شوروم ملاحظہ فرمائیے

حمید دلوائی

چھپّر

قریب قریب چار سال کے بعد جب عباس خاں کا لڑکا کریم اپنی تعلیم مکمل کرکے گھر لوٹ آیا تو گھر کے چھپر سے قریب کھڑے ہوکر اس نے اپنے باپ سے کہا۔ "کتنا گھور اندھیرا ہے اپنے گھر میں! کچھ بھی تو سجھائی نہیں دیتا۔"

عباس خاں نے اپنے لڑکے کو سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ "بیس سال تک مسلسل اس گھر میں رہتا آیا ہے اور آج تجھے چلنے کے لئے راستہ سجھائی نہیں دیتا" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ممبئی کی خیرہ کردینے والی روشنی سے لوٹ رہے ہو نا، میں جس وقت پہلی بار بمبئی سے لوٹا تھا۔۔۔۔" اور اس نے معمول کے مطابق پرانی کہانیاں دہرانی شروع کردیں۔ البتہ کریم وہاں زیادہ دیر کے لئے نہ رکا وہ سیدھا اپنی بہن کے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا جو زچگی کے لئے اپنے گھر آئی تھی۔ اس گھنی تاریکی میں وہ گرتا پڑتا اپنی بہن کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ داخل ہوتے ہی اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "تم بالکل پیلی پڑگئی ہو" وہ مسکرائی اس کے قریب ہی اس کا ننھا گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اسے تھپتھپا رہی تھی۔۔۔۔

"آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

وہ خاموش رہی البتہ اس کی ماں جو اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی بولی "وہ تو بھلی چنگی ہے، کسی مرض کا شکار نہیں۔"

"بہرحال میں کل ہی ڈاکٹری معائنہ کراؤں گا۔"

"ضرور کروالینا، مگر اس وقت تو چل کر اپنے ہاتھ پیر دھولو اور ضروریات سے فراغت حاصل کرلو" اس کی ماں نے کہا۔

کریم گھر کے اندر چلا گیا۔ مگر اس کے دل میں شک و شبہات کی جڑیں مضبوط ہوچکی تھیں۔ دوسری صبح والدین کے منع کرنے پر بھی وہ ڈاکٹر کو لے آیا اور اس کا معائنہ کروایا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

گھر میں یکایک جیسے سناٹا چھا گیا وہ بہت دنوں سے علیل تھی البتہ ہر کوئی اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی معمولی سی بیماری ہوگی مگر ڈاکٹر کی رائے کے بعد گھر کا سارا ماحول ہی بدل گیا۔ سبھوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اندر کے کمرے میں داخل ہوکر مریض کا حال پوچھے۔ البتہ کریم سب سے مختلف تھا اور سب سے زیادہ ہوشیار۔ لیکن وہ بھی کانپ کانپ جاتا کیونکہ اس مرض سے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

دو چار دنوں کے بعد ڈاکٹر نے علاج شروع کردیا۔ البتہ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی مایوسی کا بھی اظہار کیا۔ قدرے گھر کا ماحول سنبھلنے لگا اور موقع کی نزاکت کو جانتے ہوئے کریم نے سبھوں کو تاکید کردی کہ ہر حالت میں مریضہ سے دور رہا جائے۔ مگر اس کی چھوٹی بہن نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ماں نے ایک دن کہا "ارے یہ تو اپنی قسمت ہی میں لکھا تھا۔ اپنی قسمت ہی بری ہے، آخر اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟"

"مگر ہمیں اپنی ہر چیز اس سے دور رکھنی چاہیئے، کپڑے، برتن وغیرہ۔ اس سے دور رکھے جائیں کیونکہ یہ متعدی بیماری ہے۔"

"میں ہمیشہ ہی سے مریض کا جوٹھا کھاتی آئی ہوں۔ اب تک تو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا؟" "یہ تو اپنی قسمت کی بات ہے۔"

"اگر اس کا جھوٹا نہ کھایا جائے تو کیا ہوگا؟ اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سبھی چیزیں الگ رکھی جائیں، اگر رکھ دی جائیں تو اس میں آپ کا کون سا نقصان ہوگا؟"

"ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو سبھی چیزیں الگ رکھی جائینگی۔"

کریم قدرے مطمئن ہو گیا۔ البتہ بہن کی طبیعت دن بدن بگڑتی ہی گئی اور وہ اپنے دبے دبے خوف کی وجہ سے کئی دن تک اس کے کمرے کا رُخ نہ کر سکا۔ وہ من ہی من میں اپنے آپ کو کوستا رہا۔ اور آخر کار یک دن جب اس کے ذہن پر بہن کی محبت غالب آ گئی تو وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس نے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کی چھوٹی بہن اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار اس سے کہا تھا کہ مریض کے پاس زیادہ دیر کے لئے رکنا مناسب نہیں ہے آج اس نے طے کر لیا تھا کہ ایک بار اسے تاکید کر دی جائے لیکن اس نے جوں ہی اندر کی جانب قدم بڑھایا اس کی نظر اس پیالے پر پڑ گئی جو اس کی بہن کے ہاتھوں میں تھا اور دھیرے دھیرے ایک ایک چمچہ اسے پلا رہی تھی۔

بڑی بہن نے کہا "اب تم ہی پی لو اسے۔ میں اور زیادہ نہیں پی سکوں گی۔"

چھوٹی بہن نے جوں ہی چمچہ اپنے منہ سے لگایا کریم دروازہ سے چلّا اُٹھا۔ "پھینک دو، پھینک دو، اسے بالکل مت پیو۔"

دونوں ہی کے چہرے یکایک فق ہو گئے اور ڈر کے مارے چھوٹی بہن کے ہاتھوں سے پیالہ زمین پر گر پڑا۔

کریم دروازے ہی سے واپس لوٹ آیا۔

اس روز اس نے اپنا پورا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ "ہم سب وحشی ہیں، بالکل جنگلی۔"

"ہاں جنگلی ہی ہیں چونکہ اب ہمارے دن لد گئے ہیں نا!" ماں نے کہا۔ وہ اور کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ لڑکی کی طویل بیماری اور موت کے خوف نے اُسے ہراساں کر دیا تھا۔

کریم خاموش نہ رہا "تمھارے دن لد گئے لیکن اس بچی کے اسے اور بہت دنوں جینا ہے۔"

"ہاں بابا اب بس بھی کرو۔ تمھیں اس قدر چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی باتیں تم مجھے اکیلے میں بھی بتا سکتے تھے۔ اس سے تو اس کی صحت پر اور بھی بُرا اثر پڑے گا۔"

ماں نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور جلد لڑکی کے کمرے کی جانب مر گئی۔

تقریباً ایک ماہ کے بعد اس کی بہن مر گئی۔ اس دوران میں کبھی اس نے اس کے کمرے کا رخ نہیں کیا۔ مہینے بھر میں پورا گھر سنسان ہو گیا۔ کریم کی ماں کھانے پکانے میں لگ جاتی اور چھوٹی بہن، بہن کے بچے کی دیکھ بھال میں۔ ایک بار کریم نے پورا گھر گوبر سے لیپنے کی صلاح دی، عباس خاں ان دنوں گھر کے معاملات میں بہت کم دلچسپی لے رہے تھے مگر جب کریم نے گوبر لیپنے کی صلاح دی تو انھوں نے اس سے کہا "تو کیوں ان معاملوں میں الجھا رہتا ہے، بہتر تو یہی ہے کہ کوئی کام کاج سنبھال لے۔ یا پھر کھیتوں پر جانا شروع کر دے۔"

کریم نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، البتہ وہ اپنے آپ ہی سے کہہ رہا تھا "اگر مجھے کھیتوں پر ہی بھیجنا تھا تو پڑھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب میں کھیتی باڑی تو کرنے سے رہا!"

عباس خاں نے پھر کہا "تمھیں گھر کے معاملوں میں اتنی دلچسپی نہیں لینی چاہیئے۔"

اس نے ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ البتہ پورا گھر گوبر سے لیپا گیا۔

ابھی چار چھ ماہ ہی گذرے ہوں گے کہ چھوٹی بہن نے ایک روز خون کی قے کی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ والدین کے ہوش و حواس اُڑ گئے آخر یکایک اسے ہو کیا گیا؟

کریم خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کی بڑی بہن آ کھڑی ہوئی۔ چھوٹی کے ہاتھ میں پیالہ اور...... !

پہلے کی طرح ڈاکٹر آیا اور نا اُمیدی ظاہر کی۔ خون کی قے کرتے کرتے چند ہی دنوں میں اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ اور اس میں بستر سے اُٹھنے تک کی قوت باقی نہیں رہی۔ اس پرانے کمرے میں اس کی چارپائی رکھ دی گئی ماں اس کی تیمار داری میں جُٹ گئی۔ اس لئے چھوٹے بچے کو اس کے باپ کے گھر بھیج دیا گیا۔

کریم اپنے باپ سے لڑنے لگا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بہرصورت والدین پر بھرپور چوٹ کرنی چاہیئے۔ ایک روز موقع کی نزاکت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے کہا "میں نے کئی بار کہا تھا کہ اس کی ساری

چیزیں الگ رکھ دی جائیں، ہر قسم کی احتیاط برتی جائے، لیکن آپ لوگوں نے میری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور آج اس لڑکی کو بھی ------ بیٹا اس نے اس کا جھوٹا کھایا۔ اب تم دونوں اس کا جھوٹا کھاؤ۔ ہو جانے دو ایک پورا گھر برباد ---- !

دونوں نے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔

"کم از کم اب تو اپنی آنکھیں کھول دو۔ دیکھو دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے؟ اور تم لوگ ان باتوں کو سچ سمجھنے تیار ہو۔"

"اب کون دیکھنا چاہتا ہے اس دنیا کو۔ لیکن کیا میری بچی اب بچ نہیں سکے گی؟" ماں نے روتے ہوئے پوچھا۔

"ناممکن! اب اس کا بچنا محال ہے۔ یہ اس بیماری کی آخری حد ہے ---- آنکھوں سے ..... !"

عباس خان بیچ میں بول اٹھا جیسے کسی گہری نیند سے جاگ کر کہہ رہا ہو: "کیا لکھا ہے مجھ غریب کی قسمت میں ... مرجھا رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے خدا اسے بچا لے۔ دنیا اس کی ذات سے مایوس نہیں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بیوی کو روتے دیکھ کر عباس خان سے رہا نہ گیا اس نے کہا "یہ آنسو کیسے؟ آخر رو کیوں رہی ہو؟ رونے کے بجائے اس کی تیمارداری کرو اور اس کی بارگاہ میں دعا۔"

جب سے بہن بیمار ہوگئی تھی کریم بے چین ہو کر سارے گھر پر نظر رکھ رہا تھا۔ کپڑے، لتے، اور کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط برتنے لگا۔ یہی نہیں باورچی خانہ پر بھی اس کی نگاہیں رہنے لگیں۔ جب بھی اس کی ماں بہن کے کمرے میں جاتی دروازے سے چھپ کر وہ دیکھا کرتا۔ گھر سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی حالانکہ دو ایک بار عباس خاں نے اسے کھیتوں پر جانے کی بھی صلاح دی تھی۔ مگر اس نے ان کی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔

بہن کی بیماری کا عرصہ طویل ہوتا گیا اور وہ اپنے ہی من کے وچاروں میں مگن رہا۔ اپنے آپ سے لڑتا رہا اور کڑھتا رہا۔ اور خوف کے مارے بہن کے کمرے کا رخ نہ کر سکا۔ بہن کی بیماری کے دوران صرف ایک بار وہ اس کے کمرہ میں گیا۔ آخر کار اس نے بھی اپنا رخت سفر باندھا اور وہاں چلی گئی جہاں سے پھر کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

ایک مہینہ ہوتے ہی پورا گھر پھر ایک بار گوبر سے لیپا گیا۔ اور صفائی کی گئی۔ اب کی بار عباس خاں نے کوئی مخالفت نہیں کی اور خاموشی سے پرے ہٹ کر ساری باتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ گھر کی پوری صفائی کرانے کے باوجود بھی عباس خاں کا دل شک و شبہات سے بھرا رہا۔ اور خوف کے مارے وہ اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ یکے بعد دیگرے دو چلے گئے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیسرا بھی اس راہ کو اپنا لے ..... ؟ اس کے شک نے صرف چند ہی مہینوں میں یقین کا روپ اختیار کر لیا۔ عباس خاں دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا اور آخر کار اس نے بھی ایک روز خون کی قے کر ہی دی، اور وہ بھی اس راہ کا مسافر ہو گیا۔

اب کی بار ... کے پاس اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے حالات پر غور کر سکتے۔ پندرہ ہی دنوں میں سارا کھیل ختم ہو گیا اور پورے گھر کا تمام ٹھنڈا پڑ گیا۔

عباس خاں کے چلے جانے کے بعد پھر ایک بار جیسے یکایک اس کے سوچنے کی قوت واپس آگئی۔ اس نے گھر میں سونا چھوڑ دیا اور چھپر کے نیچے اپنا بستر لگوا دیا اور گھر کا ... صاف کروایا دو ایک جگہوں سے کھپریل کو ہٹوا دیا تاکہ سورج کی روشنی کا گذر ہو سکے لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے دل میں شکوک کروٹیں لیتے رہے۔ ایک روز جب وہ اپنی آنکھیں بند کئے چھپر کے نیچے پڑا ہوا تھا یکایک کسی خیال کے آتے ہی وہ دوڑتے ہوئے اپنی ماں کے پاس چلا گیا جو اندھیرے میں بیٹھی کسی سوچ میں غلطاں تھی۔

"اس اندھیرے نے سب ہی کو نگل لیا ہے" کریم نے کہا۔

جب سے اس کے سر کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اب وہ سفید کپڑے ہی پہننے لگی تھی۔ اس کی مصروفیت رہ کے باورچی خانہ میں رہ گئی تھی کیونکہ اس کے علاوہ کوئی ایسا تھا ہی نہیں جو کھانا پکا سکتا۔ البتہ باتیں وہ پہلے کی نسبت بہت ہی کم کرتی تھی۔

"گھر کا چھپر توڑ دینا چاہئے! کیوں؟" اندھیرے سے اس کی آواز ابھری۔

"گھر میں اندھیرا جو رہتا ہے --- !"

"تمہارا دماغ تو ٹھکانے ہے نا؟ آباواجداد نے جسے تعمیر کر رکھا ہے اس کو تم توڑنا چاہتے ہو؟ ان کی رکھی ہوئی نیو کو کمزور بنانا چاہتے ہو؟"

"اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ان کا مطلب تو یہی ہوا کہ بچے ہوئے لوگ بھی اس اندھیرے کی نذر ہو جائیں۔"

"اب مرنے کے لئے بچا ہی کون ہے۔ سب چلے گئے۔ سبھی تو چلے گئے۔" وہ زور زور سے رونے لگی۔

"جو گئے ان کا ذکر اب بےکار ہے تمہیں اور مجھے زندہ رہنا ہے، اور زندہ رہنے کے لئے چھپر توڑنا ضروری ہے۔"

"میں کسی قیمت پر اجازت نہیں دے سکتی۔ جانتے ہو اس چھپر کی کہانی.....؟ تمہارے آباواجداد نے اس چھپر کی بنیاد رکھی اور جوں ہی چھپر تیار ہوا گھر آدمیوں سے بھر گیا، دھان سے بھر گیا، سکھوں سے بھر گیا اور زندگی سے بھر گیا۔

"لیکن تمہیں اور مجھے زندہ رہنا ہے نا۔"

"تم غلط مت سوچا کرو میری روح فنا ہو جاتی ہے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے اور ضرور زندہ رہنا ہے۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔"

"اسی چھپر تلے؟ ناممکن ہے۔ اس گھور اندھیرے میں اب میں بالکل نہیں رہنا چاہتا۔"

"اگر یہاں نہیں رہنا چاہتے ہو کہیں اور باہر چلے جاؤ۔ نوکری دھندا کرو۔"

اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "آخر وہ کیوں؟ نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" اور پھر ماں سے بولا۔

"یعنی تم اجازت نہیں دو گی؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"میں یہاں نہیں رہوں گا اس اندھیرے میں میرا دم گھٹا جاتا ہے۔"

"تم چھپر کے باہر ہی رہا کرو۔ یہاں گھر میں آنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں تمہاری ساری چیزیں وہاں پہنچا دیا کروں گی۔"

اس نے اپنا سامان اٹھایا اور چھپر کے نیچے ڈیرہ ڈال دیا۔

کئی دن گزر جانے کے بعد ایک صبح یکایک اسے بخار نے آ دبوچا۔ قدرے کھانسی نے بھی پیر نکالے اور اس کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ اس نے ماں کو آواز دی۔ اور آواز دیتے ہی رو پڑا۔

ماں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور دلاسہ دیتے ہوئے کہا اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں تمہیں زکام ہو گیا ہے۔ لیکن اسے تسلی نہیں ہوئی اپنی ماں سے چمٹ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا ڈاکٹر نے بھی یہی کہا کہ کوئی بیماری نہیں ہے صرف تمہارے من کا وہم بار بار ذہن رہا ہے، کچھ دنوں دوا پی لو۔ ہو سکے تو گھر سے باہر نکل کر کھیتوں پر جایا کرو۔ اس کا علاج شروع کر دیا۔ مگر ہر بار یہ ارادہ سر اٹھاتا کہ چھپر توڑ دینا چاہیئے۔ اس نے پھر ایک بار اپنی ماں سے کہا۔ مگر وہ اس ضمن میں اپنا فیصلہ سنا چکی تھی، اس لیئے اس نے مزید دھاوے کی ضرورت نہیں سمجھی ہفتے بھر میں کریم کی طبیعت بالکل سدھر گئی۔ اور وہ اپنے کھیتوں پر جانے لگا۔ چھپر توڑنے کا خیال دھیرے دھیرے اس نے اپنے دل سے نکال دیا۔

کٹائی کے دن تھے وہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتا تو شام آٹھ بجے گھر واپس آتا۔ صبح کے وقت کھیتوں کی مینڈھوں پر کھڑے رہنے میں اسے ایک قسم کی خوشی محسوس ہوتی۔ البتہ سورج جب سر پر آ جاتا تو کڑی دھوپ اس سے برداشت نہ ہوتی۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ آخر یہ مزدور اتنی سخت دھوپ میں بھی کس طرح کام کرتے ہیں؟ تعجب کی بات ہے انھیں نہ دھوپ لگاتی ہے اور نہ ہی بارش کا ان پر کوئی اثر ہوتا ہے طبیعت کے ناساز ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں کھیتوں پر جا نہ سکا۔ البتہ ڈر جو اس کے دل میں تھا، بالکل ناپید ہو چکا تھا۔

بہت دنوں بعد وہ اس چھپر تلے بیٹھ کر پھر اس اندھیرے سے گھبرانے لگا۔ کتنا گھور اندھیرا ہے، آدمی ٹھیک طریقے سے چل بھی نہیں سکتا۔ البتہ اس بار اس نے اپنی ماں سے کوئی شکایت نہیں کی اور اس گھور اندھیرے میں چھپر تلے پڑا رہا۔

عباس خاں کی طرح اسی چھپر تلے بیٹھے ہوئے ابھی دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک صبح اچانک زور کی ابکائی آئی ---- نے ...... خون کی قے ......!

▬▬

جی ترئیں کھانولکر

شہنائی

وہ گھر مجھے اب بھی یاد ہے پوری طرح یاد ہے۔ بخوبی یاد ہے یعنی مجھے دو گھر یاد ہیں۔ ایک تو وہ جو پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا ہوا ہے۔ اور دوسرا وہ جس میں میں رہا کرتا ہوں۔ پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہوگا۔ میں آج تک وہاں جا نہیں سکا ہوں لیکن پہاڑ کے دامن میں ایک گاؤں ہوگا میں آج تک وہاں جا نہیں سکا ہوں، لیکن پہاڑ کے دامن میں ایک گاؤں ضرور ہے۔ اور جب گاؤں ہے تو یقینًا وہاں پھر بھی ایک گھر ہوگا۔ ایسا میرا چھوٹا سا تصور ہے۔ آج تک اس گاؤں سے متعلق میں نے کوئی بات نہیں سنی ہمارے پرانے گھر میں ایک تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ بہت ہی پرانی تصویر تھی دھول سے ہمیشہ اٹی رہتی تھی۔ مکڑیوں کے جالے اس کے اطراف رہا کرتے تھے۔ اس کانچ کے فریم میں کس کی تصویر تھی میں نہیں جانتا۔ البتہ کبھی کبھار دادا جان اس فریم کا شیشہ صاف کیا کرتے تھے۔ اور صاف کرتے وقت ان کی سفید مونچھیں اندر اندر ہی پھڑ پھڑایا کرتی تھیں۔ فریم صاف کرنے کے بعد اندر ہرے رنگ کی ایک تصویر دکھائی دیتی۔ جیسے کنارے پر کھڑے ہوکر پانی میں جھانکنے کے بعد درخت پانی کی اتھاہ گہرائیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پہاڑ اور پہاڑ کی اوٹ میں لال چھپر والا ایک چھوٹا سا گھر لیکن بہت ہی دھندلا سا نظر آتا تھا اور سامنے جو بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی گذرتی تھی اس کی طرف مشکل ہی سے دھیان جا سکتا تھا۔ البتہ وہ نامعلوم سا گھر جو شیشہ کے فریم میں بند تھا مجھے پسند تھا بے حد پسند! کبھی میں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ شاید کسی فنکار نے ایک گھر کا چھوٹا سا خاکہ نکال کر اس میں بند کر دیا ہو۔ بارش کیسے یکا یک شروع ہو جاتی ہے اور بلبلے کیسے پانی کی سطح پر پھوٹ پڑتے ہیں، بس ایسے ہی اچانک یہ تصویر کسی نے لاکر ٹانگ دی ہو۔ اس گھر سے متعلق میں نے کئی بار دادا جان سے دریافت کیا کہ اس گھر میں کون رہا کرتا تھا؟ اب کون رہا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن انھوں نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا، صرف یہ کہہ دیا کرتے اس میں تمھاری بیوی رہا کرتی ہے، یہ جملہ کہتے ہی وہ ہنس پڑتے اور بہت دیر تک ہنستے بھی رہتے اور کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا کرتے۔ مجھے بھی ان کی اس ہنسی میں لطف آتا۔ خصوصًا ان کی ہلتی ہوئی مونچھوں پر ــــ کبھی تو جی چاہتا کہ ان کی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرا جائے یا پھر مور کے پنکھوں کی طرح دادا جان سے ان کی مونچھیں لے کر کتاب میں رکھ دی جائیں۔ وہ تصویر اب کہیں بھی نہیں ہے البتہ وہ گھر ضرور پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا ہوا ہے۔ اور جس کو دیکھ کر اب آنکھوں میں درد نہیں اٹھتا جس طرح اس کی تصویر کو دیکھتے وقت اکثر اٹھا کرتا تھا۔

ہمارے گھر کے قریب بنو ماسی کا گھر تھا۔ ہمارے اور بنو ماسی کے گھر کے درمیان ایک چھوٹا سا کیلوں کے درختوں کا باغ تھا۔ اس میں جامن، چیکو، اور امرود کے بھی درخت تھے۔ البتہ سب سے زیادہ کیلوں ہی کے درخت تھے درمیان میں ایک ٹیڑھا میڑھا راستہ تھا بالکل ہی ٹیڑھا میڑھا نہیں البتہ اتنا سیدھا بھی نہیں کہ ناک کی سیدھ میں چل سکیں۔ راستے کے آخر میں ایک کنواں تھا اور کنواں رہٹ سے گھرا ہوا تھا، اکثر رہٹ چلتا رہتا تھا کبھی بنو ماسی کے گھر کے آدمی چلایا کرتے تھے کبھی ہمارے گھر کے لوگ۔ البتہ وہ دن رات اوں اوں کرتا رہتا ــــ میں بنو ماسی کے گھر اس راستے سے جایا کرتا تھا۔

گونگی بھاگیرتی وہیں کہیں اطراف میں زور زور سے ہنستی ہوئی دکھائی دیتی۔ پانی بھرتے وقت بھاگیرتی اور اس کی ہنسی گویا باغ کا ایک مخصوص حصہ ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ ہاتھ کے اشاروں سے بات کا جواب دیتی۔ اور پھر پیلو دانتوں میں تمام ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی۔ اس کے بال بہت ہی گھنے تھے۔ وہ اپنے گھنے بالوں کا ناریل کے برابر گپھا بنا لیتی۔ اور اس میں

جو بھی بھول جاتا ہو۔ لیکن ایک بات میں نے ضرور محسوس کی بھاگیرتی جب بھی ہنستی اس کی آنکھیں سنجیدگی سے جب ہو جاتیں وہ اس کی ہنسی میں کبھی شامل نہیں ہوتی تھیں۔ بھاگیرتی بہت اچھی تھی اس کی آنکھیں ...! اس کی یہ خاموش آنکھیں دیکھ کر آج تک مجھے عجیب سی وحشت محسوس کیا کرتا تھا۔

بنو ماسی کے گھر مالو کے سب سے چھوٹے چچا کا حال ہی میں بیاہ ہو گیا تھا۔ ابھی تک بیاہ کا منڈپ بھی اپنی ہی جگہ پر تھا۔ میں مالو کے ساتھ اکثر وہاں کھیلا کرتا تھا۔ آج بھی جی چاہا کہ وہاں جا کر کچھ دیر کے لئے مالو کے ساتھ کھیل کر واپس چلا آؤں۔ راستے میں گونگی بھاگیرتی ملی تو دونوں میں ایک ایک پتھر ڈال رہی تھی اور اپنی انگلیاں گن رہی تھی انگلیوں پر پتھروں کا حساب چل رہا تھا۔ جب باری باری ساری انگلیاں گن کر ختم ہو گئیں اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ پل بھر کر اس نے پتھر درخت کے نزدیک رکھ دیا پھر دور جا کر کہیں سے ایک پھول لائی اور بالوں میں اٹکا دیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس سے پوچھا جائے کہ وہ بار بار انگلیاں کیوں گن رہی ہے مگر میں اشاروں سے ناواقف تھا۔ اس لئے صرف اس کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ سچ کہا جائے تو اس کی ہنسی ہی اس کی باتیں تھیں۔ ہنسی ہی اس کی زبان تھی مگر اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور اس کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا!

وہاں سے میں بنو ماسی کے گھر گیا۔ بنو ماسی اپنے سر پر سفید پٹی باندھے بیٹھی تھیں۔ میں نے ماسی کو آواز دی لیکن ماسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گنتی کو پانی میں چھوڑ دینے کے بعد جیسا پانی بے رنگ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح سے ان کا چہرہ ہو گیا تھا جب بھی ان کے گھر جاتا تھا کچھ نہ کچھ پوچھا کرتی تھیں پر نہ جانے آج کیا بات تھی کہ بار بار آواز دینے کے باوجود بھی انھوں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی میں نے پھر ایک بار جرأت کی "کیا ہوا ماسی ۔۔ ؟"

ماسی کی آنکھیں صرف زمین دیکھتی رہیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے ناک لال ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہیں گر پڑی ہوں یا سر میں درد ہو۔ میں بالکل ان کے سامنے ہی جا کھڑا ہوا پھر بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اور کہا "ماسی!" ماسی نے اپنی آنکھیں اٹھائیں آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور ان میں صرف پانی ہی پانی تھا۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھا یکایک میری آنکھیں دکھنے لگیں۔ میں نے وہاں سے بھاگ جانا ہی مناسب سمجھا۔ نہ جانے کیوں ہولے ہولے میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔

مالو کے گھر میں ہمیشہ کی طرح آج بھی اندھیرا تھا، اور اتنا اندھیرا ہونے کے باوجود مالو کے گھر کی ساری چیزیں صاف صاف دکھائی دیتیں مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ میں جس کمرے میں بھی جھانکتا صرف اندھیرا دکھائی دیا۔ میں نے ایک ادھ کھلے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ مالو کے چھوٹے چچا اور چچی قریب ہی بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ چچا تو اس انداز سے چچی کی اور دیکھ رہے تھے جیسے کہ شیشہ میں فریم کی ہوئی تصویر کی طرف دیکھا کرتا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دوسرے سے بالکل ہی قریب آ گئے دونوں ایک ہو گئے۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ چاندنی میں ہلتے ہوئے درختوں کے سائے جس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے بالکل اسی طرح ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ آج بنو ماسی کا سر دکھ رہا تھا اور ان دونوں کے جسم میں جس طرح کبھی بخار میں دادا جان کے پیر دبایا کرتا تھا بالکل اسی طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے جسم دبا رہے تھے۔ وہاں سے میں آخری کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ کمرہ بڑی بھیڑ سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے اطراف مالو اور مالو کے بڑے چچا اور چچی بیٹھی ہوئی تھی چچا نے دادی کی پیٹھ پر اپنا سر رکھا تھا درمیان میں وہ بھی دھوتی کے ایک سرے سے اپنی آنکھیں صاف کر رہے تھے دادی کی آنکھ سے اور ناک سے ایک دھار تھی جو بہتی جا رہی تھی مالو ایک کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

میں اندر جانے کی ہمت پیدا نہ کر سکا۔ میں نے سوچا کیوں نہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر کے دالان کا رخ کیا جائے جہاں مالو کے پتا اکثر کھاٹ پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ لیکن جب میں زینہ طے کر کے اوپر پہونچا تو وہاں کوئی نہیں تھا، اور مالو کے پتا جی کی چارپائی بالکل ہی خالی پڑی ہوئی تھی۔ صرف اوپر [illegible] لکڑی کی [illegible] کر دی تھی۔ کھاٹ کے قریب موسمی کے چھلکے اور ادرک کے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ گھر میں سبھی تھے صرف مالو کے پتا ہی نہیں تھے ـــ میں نے کھلی کھڑکی سے باہر کی جانب جھانک کر دیکھا، ـــ دھوبا کے مندر کا کلس دکھائی دے رہا تھا لیکن ساری کی ساری چیزیں جیسے بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ مالو کے پتا جی شاید کہیں باہر چلے گئے ہوں! لیکن یہ کیسے ممکن تھا وہ اکیلے تو سفر کر ہی نہ سکتے تھے۔ بیحد کمزور ہو گئے تھے۔

وہ تو زیادہ شور و غل تک برداشت نہیں کر سکتے تھے پھر وہ اکیلے سفر کیسے کر پاتے انھیں تو زور زور سے بولنا تک پسند نہیں تھا صرف گھڑی کی ٹک ٹک انھیں بھلی لگتی تھی۔ اسی ٹک ٹک کو سنتے سنتے وہ پہروں یوں ہی گذار دیتے، نہ جانے کیا بات تھی وہ مجھ سے جتنا ہو سکتا تھا اوِل لیتے تھے مجھے اب بھی یاد ہے انھوں نے ایک دن چاروں اور دیکھا اور مجھے اپنے پاس بلاکر پوچھا ــ "تمھاری ماسی کہاں ہے ؟"

"باورچی خانے میں ہے"

"کیا تمھارے گھر بھی جاتی ہے ؟"

"ہاں ــ جاتی ہے"

"وہاں کسی کسی کو پوچھا کرتی ہے ؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم"

انھوں نے مجھے بالکل ہی اپنے قریب کھینچ لیا۔ اور کہا "نیچے جاؤ اور ماسی سے کہو میں نے اسے اوپر بلایا ہے لیکن خیال رہے اس بات کا کسی کو پتہ نہ چلنے پائے"

میں ماسی کو اپنے ساتھ اوپر لے آیا اور جوں ہی اوپر آ گیا ماسی نے آنکھوں کے اشارہ سے ہی مجھے واپس جانے کو کہہ دیا۔ مجھے یہ بات بہت ہی ناگوار گذری ان دونوں پر بے حد غصہ بھی آیا۔

ماموں کے پتا جی یکایک کہاں چلے گئے کوئی نہیں جان سکا۔ البتہ ان کا بچھونا لپیٹ دیا گیا تھا گھڑی اپنی پرانی جگہ پر ٹک ٹک کر رہی تھی ماموں کے پتا جی میری نظروں کے سامنے آ کھڑے ہو جاتے اور ہمیشہ کی طرح چلتے ہوئے اپنا بستر کھولتے ہوئے، دکھائی دیتے۔ سارا پلنگ ہمیشہ ہی سست رہا کرتا تھی اب اس کا چھوٹا سا بچہ بار بار چھیڑا کرتا پر وہ اس کی طرف میاؤں میاؤں کر کے چپ ہو جاتی۔ میں اوپر سے نیچے اتر آیا۔ اور جب شادی کے لئے بنائے ہوئے اس منڈپ میں جا کر ایک کونے میں بیٹھے رہنے کے خیال نے دل میں انگڑائی لی تو یکایک مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اس لئے میں نے سیدھے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ دروازے پر ہی دادا جان سے ملاقات ہو گئی۔ کندھے پر ایک سفید رومال ڈالے ہوئے نجو ماسی کے گھر جا رہے تھے۔

"کہاں گئے تھے ؟"

میں نے نجو ماسی کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"کس نے کہا تھا تم سے وہاں جانے کے لیے ؟ کم بخت درخت کے پتوں کی طرح ہو گیا، باپ بمبئی میں آوارہ گردی کر رہا ہے اور تم یہاں"

دادا جان جب بھی غصے میں آ جاتے میں ان کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ اس وقت بھی خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انھوں نے اپنا رومال سنبھالا اور نجو ماسی کے گھر کا راستہ لیا۔

میں نے بستے میں سے تختی نکالی اور اس پر صرف پہاڑ کی تصویر بناتا رہا۔ یقیناً وہاں کسی نئی واردات نے جنم لیا تھا۔ اور تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اس سے متعلق کسی نے بھی کسی طرح کی خبر نہیں دی تھی۔ اس کے بعد میں نے تختی پر صرف آڑی ترچھی لکیریں بنانا شروع کر دیں یہاں تک پہاڑ کی تصویر بالکل ہی غائب ہو گئی اور پوری تختی دودھ کی طرح سفید دکھائی دینے لگی۔ میں نے تختی صاف کی جو بالکل نجو ماسی کے سر کی طرح دکھائی دے رہی تھی سامنے کی کھڑکی جو تصویر میں پہاڑ کو آ گھرا جا گیا تھا۔

اس کے بعد مجھے اس کی یاد آئی اور میں نے باورچی خانے کا رخ کیا ماں اکثر باورچی خانے میں مصروف رہا کرتی تھی اور زیادہ کام کی وجہ سے کبھی کبھی اس کی ناک یا گالوں کے آس پاس برتن کی کالک لگی ہوئی دکھائی دیتی تھی کہیں نہ کہیں کوئی کالا داغ دکھائی دیتا تھا میں فوراً اس سے پوچھ بیٹھتا۔ "آئینہ لاؤں ؟" کبھی کبھار تو وہ آئینہ لانے کے لئے کہہ دیتی اور کبھی کبھار سنی ان سنی کر دیتی۔ اس وقت وہ کھڑکی سے جھانک کر نجو ماسی کے گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ماں اُدھر کیا دیکھ رہی ہو ؟"

وہ فوراً چلا اٹھی ــ "تم ابھی ادھر ہی سے آ رہے ہو نا ؟"

"ہاں"

"اور ابھی تک یہی کپڑے پہنے گھر میں گھوم رہے ہو ؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتے ہوئے کنویں پر لے آئی۔ گونگی بھاگیرتی کو اس نے مجھ پر پانی ڈالنے کے لئے کہا اور خود نجو ماسی کے گھر کی طرف چلی گئی۔ میں نے اپنے کپڑے اتار لئے بھاگی رتی نے ڈول پانی میں چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پتہ نہیں وہ اتنا کیوں ہنسا کرتی تھی ــ؟ کون تھا جو اسے بار بار ہنسنے پر مجبور کرتا تھا۔ مگر اب صرف اس کی آنکھیں یاد آتی ہیں جو اس ہنسی کے باعث دور دمکا کرتی تھیں جیسے

ایک بھرپور روشنی والے کمرے میں کہیں دو اندھیرے کونے رہ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح اس کی آنکھیں تھیں اس نے پانی سر پر ڈال دیا پھر صابن ملنا شروع کر دیا۔ لگتا تھا جیسے جھاگ صابن سے اٹھ رہا ہے بلکہ بھاگیرتی کے لال ہاتھوں سے دھیرے دھیرے میرے جسم پر پھیل رہا ہے اس کے ہاتھ صابن کے جھاگ سے بھی زیادہ نازک تھے۔ پورے جسم کو اس نے جھاگ سے بھر دیا اور پھر زور زور سے ہنستی رہی لیکن جب جھاگ کی وجہ سے میری آنکھیں جلنے لگیں تو میں نے اپنے ہاتھ پیر ہلانے شروع کر دیئے بھاگی رتی اور زور زور سے ہنسنے لگی اور جسم پر لگاتار پانی ڈالنے لگی۔ پھر اس نے میرا جسم تولیے سے پونچھا میں نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا "کیا ہوا ہے اس گھر میں؟"

بھاگیرتی یکایک گمبھیر ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔ میں نے اس کے اشاروں کا اندازہ لگایا شاید کوئی بات ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکا۔

اس کے بعد میں سیدھے آنگن میں چلا آیا اور وہاں سے وٹھوبا کے مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ معمول کے مطابق میں نے پھیرے لگائے اور کود کود کر گھنٹی بجانے کی کوشش کی مگر میرے ہاتھ گھنٹی تک پہنچ نہ سکے تو میں مایوس ہو گیا میں نے وٹھوبا کو پرنام تک نہیں کیا اور اوپر کی جانب چلا گیا۔ پیپل کے سائے میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کی کالی پیٹھ بالکل ننگی نہیں تھی، کہیں کہیں پر کپڑوں کے ٹکڑے دکھائی دیتے تھے۔ کمر پر ایک رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کے بال بالکل ہی گتھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی میں قدرے ڈر گیا تھا البتہ آہستہ آہستہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ رات کے وقت میں اکثر اپنے ہی سائے سے ڈر جاتا تھا لیکن اپنا سایہ خیال میں آتے ہی فوراً ڈر دور ہو جاتا تھا اس طرح میں اس سے قریب ہوتا گیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، اور ایک ہاتھ اپنے کان پر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے قبل اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کا تھا ہی نہیں پھر کیسے دکھائی دیتا۔؟ البتہ ایسا آدمی دادا جان کی کہانیوں میں ضرور رہا کرتا تھا، گاؤں گاؤں گھومنے والا، مندروں میں رہنے والا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا جیسے وہ شیشہ کے اس فریم سے یکایک اٹھ کر یہاں چلا آیا ہو۔ آخر یوں کان پر ہاتھ دھرنے اور آنکھیں بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاؤں کا گویا گاتے وقت کان پر ہاتھ رکھا کرتا تھا، لیکن وہ تو گا بھی نہیں رہا تھا۔ بہت ہی خاموش تھا۔ بالکل شانت پرسکون جھیل کی طرح، پھر میں نے ٹہنی سے دو چار پتے توڑ دیئے اور نیچے کی جانب پھینک دیئے۔ اس وقت ہلکی سی آواز ہوئی۔ میں نے اپنے کان کھڑے کئے غور سے سننے کی کوشش کی تو ایسا لگا جیسے دو چار پرندے مل کر کسی لکڑی میں سوراخ بنا رہے ہوں۔ اس لئے پھر ایک بار میں نے پچھلی جانب دیکھا درخت پر گلہری اپنا سر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا یقیناً یہ آواز باوا کے جسم سے ہی نکلی ہے۔ اس لئے میں پھر ایک بار اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ سوچا کیوں نہ اس کی پیٹھ سے کان لگا کر اس کی نکلتی ہوئی آواز کو بخوبی سن لوں۔ البتہ ہمت نہیں ہو سکی۔ باوا اپنی آتما کے اندر گھوم رہا تھا۔ گھوں، گھوں۔ یکایک مجھے وہ تصویر یاد آئی۔ اور تصویر کے ساتھ پہاڑ اور پہاڑ کی اوٹ میں چھپا ہوا ایک گھر، بس سب کچھ دکھائی دینے لگا اور طرح طرح کی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ میں سیدھے گھر واپس آ گیا۔ البتہ باوا کی کالی ننگی پیٹھ میری نظروں کے سامنے آتی رہی۔

"آ گئے ہو کیا پورا گاؤں گھوم کر ...؟" دادا جان نے کہا۔

"آج میں نے ایک انوکھی چیز دیکھی ہے"

"بیوی دیکھ لی ہوگی شاید"

"وٹھوبا کے مندر میں ایک باوا آ گیا ہے"

"ہاں! کیسا ہے وہ؟"

"داڑھی والا ہے، نقار خانے میں براجمان ہے، کان پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے اور اس کا منہ بھی کھلا ہوا ہے۔" مجھے جس طرح بھی ممکن ہوا میں نے بیان کر دیا۔ البتہ اس آواز سے متعلق میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ صرف سامنے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھتا رہا۔ دادا جان نے اپنی لکڑی سنبھالی سر پر سفید صافہ رکھ لیا اور سیڑھیاں اترنے لگے۔

میں نے اُن سے پوچھا "کیا آ جاؤں میں آپ کے ساتھ؟"

"کہاں؟"

"مندر میں!"

"نہیں میں دیکھ آتا ہوں کون آیا ہوا ہے؟"

داداجان چلے بھی گئے اور میں یوں ہی سوچتا رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس غریب آدمی پر یوں ہی بگڑ بیٹھیں یا اسے نکل جانے کے لئے مجبور کریں۔ جان اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں میچ لیں جیسے جھولا جب بہت اونچائی پر چلا جاتا ہے تو آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں۔ پھر میں نے یکایک اپنی آنکھیں کھول دیں شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لئے میں باورچی خانے میں چلا گیا۔

"تم اب تک کہاں تھے ؟" ماں نے دریافت کیا۔

"مندر گیا تھا"

"کھانا نہیں کھانا ہے کیا ؟"

"بہت بھوک لگی ہے ماں"

میں کھانا کھا کر باہر چلا آیا۔ چونکہ مجھے داداجان کی واپسی کا انتظار تھا۔ باہر ہی میں نے چٹائی بچھا دی اور نہ جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا — مجھے داداجان نے آکر جگایا، اور ہنستے ہنستے کہا "دیکھ آئے ہیں ہم تمہارے باوا کو"

داداجان معمول کے مطابق قندیل کا شیشہ صاف کر رہے تھے، میں نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا "کیا وہ رات بھر وہیں رہے گا ؟"

"تو کیا اپنے ساتھ سونے کے لئے بلانے کا ارادہ ہے ؟"

داداجان نے ہمیشہ کی طرح عجیب سا سوال پوچھا تھا۔

جونہی قندیل کا شیشہ صاف ہوتے ہی بالکل ہلکا سا روشنی کا ہالہ چاروں طرف بکھر گیا — "کہاں سے آیا ہوگا ؟"

"کون ؟"

"وہی باوا"

"تمہاری بیوی کے گاؤں سے آیا ہے اور تمہارے لئے سندیسہ لایا ہے کہ تمہاری بیوی نے تمھیں جلد بلایا ہے۔ کیوں جانے کے ارادے ہیں نا ؟"

مجھے یکایک غصہ آگیا، یہ کیا، ہمیشہ مذاق،

داداجان زور زور سے ہنسنے لگے "ہاں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں تمہاری بیوی کے گاؤں سے آیا ہے —"

اسی وقت ماں دروازے پر آکھڑی ہوئی میں سمجھ گیا اب داداجان

ماں سے بھی کچھ نہ کچھ کہہ کر رہیں گے اور پھر میری کم بختی آجائے گی۔ مگر ماں کے کھڑے ہوتے ہی داداجان کی ہنسی یکایک کم ہوگئی۔

"کیوں کیا ہوگیا ؟" ماں نے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں" داداجان نے دھیرے دھیرے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر ہنسنے کی وجہ کیا ہے ؟"

"بس یونہی بچے کے ساتھ ہنسی مذاق"

"ہاں بچے کو سر پر بٹھا رکھا ہے اور آپ دونوں میں جو باتیں ہوتی رہتی ہیں، پڑوسی سنتے رہتے ہیں کیا کہیں گے وہ تمہارے بارے میں ؟"

"مجھے ہنسی آگئی تو آخر اسے روک کیسے سکتا ہوں ؟"

میں نے سوچا پڑوسی سن لیں گے، اس لئے داداجان کی ہنسی کو روک دیا گیا۔ لیکن پڑوس میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے مجھے کیوں محروم رکھا گیا ہے — ؟ مجھے یہ نہ بتلایا گیا کہ باوا کہاں سے آگیا ہے اور نہ ہی اس کی وضاحت کی گئی کہ پڑوس میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کے ایک راز میں مجھے شامل نہیں کیا گیا — ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی داداجان نے مجھ سے کہا "باپ کے آتے ہی کہہ دوں گا اس سے یہ ساری باتیں — میری بیوی وہ تمہاری دلدی نہیں کیا ؟"

"میں نے اسے دیکھا ہی نہیں"

"تم اسے کیسے دیکھ پاتے ؟ وہ تو بھگوان کے گھر چلی گئی۔ اس وقت تم صرف ۳ مہینے کے تھے"

"بھگوان کے گھر ؟"

"ہاں! بھگوان کے گھر"

"کیا بہت دور ہوتا ہے بھگوان کا گھر ؟"

"ہاں بہت دور ہوتا ہے اس کا گھر"

"کیسا ہوتا ہے ؟"

"ہوتا ہے بالکل شکر کی طرح، میٹھا سا"

"کیا سبھی لوگ وہاں جاتے ہیں ؟"

"ہاں سبھی جاتے ہیں"

"کیا میں بھی وہاں جاؤں گا ؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ تم بھی نہیں اور میں بھی نہیں۔ اُٹھو

"اپنا سبق یاد کرو۔"

انھوں نے پھر پانی سے میری آنکھیں صاف کیں اور سبق یاد کرنے لگ گئے۔ اس وقت وہ بہت ہی مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی ہنسی بالکل کافور ہو گئی تھی اور اس وقت وہ یوں لگ رہے تھے جیسے ہمارے آنگن میں بوڑھا درخت ہمیشہ خاموش دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان کا حلیہ ہو گیا تھا۔ دادا جان بہت ہی خاموش ہو گئے تھے۔ میں سبق یاد کر رہا تھا اور ماں گھر میں گونگی بھاگیرتی سے باتیں کر رہی تھی۔

"کم بخت کو نہ سنائی پڑتا ہے اور نہ یہ بول سکتی ہے اس اوں اوں سے تو میری جان نکل جائے گی۔"

"لیکن اسے یہ بھی کیا سنائی دے گا؟" دادا جان نے کہا۔

"میں نے دادا جان سے پوچھا، گونگی دن رات پتھر کیوں گنا کرتی ہے؟"

"پتھر گن کر شوہر کے گم جانے کے دنوں کا اندازہ لگا رہی ہے۔"

"لیکن پتھر گن کر وہ دن کیسے آئے گا؟"

"ضرور آئے گا۔ روز وہ ایک پتھر ڈول میں ڈالا کرتی ہے۔ سب پتھر گنتے گنتے آ جائے گا وہ دن۔"

لیکن میری تسلی نہ ہو سکی پھر میں نے اپنی بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا "کیا گونگے لوگ کبھی نہیں بولا کرتے؟"

"نہیں۔ اسی لیے تو انھیں گونگا کہا جاتا ہے۔"

"لیکن کبھی کبھار تو ہم بھی خاموش ہو جاتے ہیں کیا اس وقت ہم گونگے نہیں ہوتے؟"

"یقیناً تم بہت ہی ہوشیار ہو، چالاک ہو۔ ہم تمھارے دادا جان کیوں ہو گئے؟ سچ کہا جائے تو تم ہمارے دادا جان کچھ لگا ہو گئے۔ سچ کہا جائے تو تم ہمارے دادا ہو سکتے ہو۔"

اس وقت پھر یکایک خوف طاری ہو گیا۔ میں جانتا تھا اب دادا جان پھر سے ہنسنا شروع کر دیں گے اور بات باہر آ جائے گی۔ اور پھر میری شامت یقینی ہے۔ لیکن دادا جان بالکل نہیں ہنسے۔ میں نے خاموشی سے اپنی کتاب سنبھال لی، البتہ دل ہی دل میں نجانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ گونگے صرف خواب میں ہی باتیں کرتے ہوں لیکن بھاگیرتی تو رات کو اپنا کھانا پلو کے نیچے چھپا کر مندر کی طرف چلی جاتی، جس طرف اس کا گھر تھا۔ ناریل کے درختوں کے درمیان اس کا کھپریل کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں صرف اس کا بوڑھا باپ رہا کرتے تھے۔ بوڑھا باپ دھوبا کے مندر میں شہنائی بجایا کرتا تھا۔ اس کی کمر جھک گئی تھی۔ بھاگیرتی کے علاوہ اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ یا ہو سکتا ہے کوئی اور ہو؟ البتہ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ لڑکی کے سہارے چلا کرتا تھا۔ ماں سے یہاں کبھی کبھار آ جایا کرتا ۔۔ "بھاگیرتی کب جائے گی سسرال ۔ ؟" جواب ملتا "شوہر نے چھوڑ دیا ہے اسے۔"

میری سمجھ کے مطابق بھاگیرتی نیند میں باتیں کرتی ہو گی۔ اور وہ باتیں خود بھی سن پاتی ہو گی۔

اس سے متعلق میں نے دادا جان سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ سبق بھی ختم ہو چکا تھا صرف قندیل بولتے ہوئے روشنی کے تار بکھیر رہا تھا۔ نہ جانے اتنی روشنی اس نے کہاں سے سمیٹ رکھی تھی۔ ؟

رات دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ دادا جان نے ایک ہاتھ میری پیٹھ پر رکھ دیا تھا اور ممّوں کے مطابق قندیل کی روشنی کم کر دی گئی تھی۔ اس گھر میں غالباً سبھی سو چکے ہوں گے۔ مندر کا بابا دادا بھی سو چکا ہو گا۔ لیکن وہ کیسے سوتا؟ پتہ نہیں وہ کہاں سے آیا تھا؟ بچارے کے پاس بستر کہاں سے آئے گا۔ اس کا منہ بھی کھلا ہوا تھا اور پیٹھ ننگی شاید وہ ابھی تک اس حالت میں بیٹھا ہو۔ اندھیرا گھپ ہو چکا تھا۔ پر کم بخت نیند نہ جانے کہاں کھو گئی تھی صرف لمبی لمبی پرچھائیاں بابا کی پیٹھ پر سے اترتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑا سی نے کبھی سارا اس بابا کی پیٹھ سے کپڑا پھاڑ کر اپنے کمر پر باندھ لیا تھا۔ پھر گونگی بے فکری ہنسے جا رہی تھی اور اس کی آنکھیں ۔۔۔ ! شاید اب میں ان کی خاموشی کا راز جان گیا ہوں۔ البتہ بتانے سے قاصر ہوں۔ کے گال پر بھی ایسی ہی دھری ہوئی تھی۔ سامنے آم کا درخت دھیرے دھیرے ڈول رہا تھا۔ ہمارے گھر میں سبھی سو گئے تھے۔

البتہ مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

"سو جاؤ بیٹا ۔ کیا ڈر لگتا ہے تمھیں؟" دادا جان نے کہا۔

"نہیں" کہہ کر میں ان سے اور بھی چمٹ گیا

میں نے پوچھا ۔ "کیا بابا سو گیا ہو گا؟"

ہاں! انہ میرا چاچا جانے کے بعد کوئی نہیں جاگتا۔"

"کہاں سے آیا ہے وہ؟"

"بہت دُور سے"

"یعنی کتنی دُور سے؟"

"بہت بہت دُور سے لیکن اس وقت تم سو جاؤ۔ دیکھو کتنی رات ہو گئی ہے۔ کل دیکھا جائے گا اس کے متعلق۔"

"تم سے اس نے کوئی بات کی؟"

"نہیں، اور تم سے؟"

"نہیں تو۔ اس نے تو اپنے کانوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔"

"سادھو ہوگا"

"ہاں!"

"شاید یہ سارے سادھو سنت بھگوان کے گھر سے آتے ہیں؟"

"ہاں!"

"یعنی اپنے اس پہاڑی کے گھر سے۔"

"یہ کل ہی بتلا دوں گا۔ اس وقت تم سو جاؤ۔"

اس وقت ان کی آواز ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل رہی تھی۔ ایسی آواز کبھی کبھار ہی نکلا کرتی تھی۔ جب بھی ایسی آواز میں دادا جان مجھ سے مخاطب ہوتے، میرا من اور بھی باتیں کرنے کی سوچتا۔ مگر اس وقت نجانے وہ کیا سوچا کرتے تھے۔۔۔۔ ؟ دادا جان میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ اور نجانے کب نیند نے آدبوچا۔

ایسے ہی اور کتنے دن بیت گئے۔ جتو ماسی کی مالو ہمارے یہاں اب کھیلنے کے لئے آجایا کرتی۔ میں نے اس طرف جانا بند ہی کر دیا تھا، البتہ مالو ہمارے یہاں آجاتی۔ کھیلتی، مٹی کے گھر بناتی، کبھی آم کے پیڑ کے نیچے کھیلتی رہتی۔ میں اس کے ساتھ کھیلنے کبھی کبھار ہی جایا کرتا۔ وہ مجھے اکثر بلایا کرتی۔ البتہ جب کبھی میں اس کے ساتھ چلا جاتا وہ اکیلی ہی کھیلا کرتی۔ وہ اکثر اسی آم کے درخت کے نیچے دکھائی دیتی۔ اس کے کھیلوں کا کوئی نام ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی کھیلا کرتی۔ ادھر اُدھر سے پتھر جمع کر لیتی پھر چولہا تیار کر کے نہ جانے کیا کچھ پکانے میں جُٹ جاتی۔ پھر اسے اوروں کا بالکل خیال نہیں رہتا تھا، اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہتی، اس کی آنکھیں ہی کچھ اس انداز کی تھیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرف دیکھ رہی ہے۔ ایسی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں، جن کے دیکھنے کا کوئی انداز سمجھ ہی میں نہ آئے۔ میں اس کی انہیں آنکھوں کی وجہ سے دوسری طرف ہٹ جاتا۔ وہ اکیلی ہی گمن رہتی۔ درخت کے چکر لگاتی رہتی۔ اور پھر نہ جانے درخت کے تنے میں کیا ڈھونڈا کرتی؟"

"تم کھیلنے کے لئے آرہے ہو؟"

"نہیں؟"

"تم بھی نہیں جانا!"

"لیکن کیوں؟ میں تو ضرور جاؤں گی۔ اچھا تجھے یہ بھنے ہوئے بیج چاہئیں؟"

"ہاں!"

"تو یہ لے"

"کیا جتو ماسی نے اپنے سر کی پٹی کھول دی؟ کیا ہوا تھا اس روز تمہارے گھر میں؟"

مالو یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ لگتا تھا اب رو پڑے گی۔ "باپو اسپتال میں تھے۔ وینگورلا میں۔ بھگوان کے گھر چلے گئے۔"

"پھر تو ضرور واپس آئیں گے۔"

"نہیں اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وٹھو کاکا کہہ رہا تھا۔"

"لیکن ہمارے گاؤں میں بھگوان کے گھر سے ہی تو ایک آدمی آیا ہوا ہے۔ مندر میں براجمان ہے۔"

"کیا تو نے اسے دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں! سب سے پہلے میں نے ہی دیکھا تھا اُسے۔ اب لوگوں کا ایک ہجوم سا رہتا ہے اسے دیکھنے کے لئے۔ اس لئے میں اسے دیکھ ہی نہیں پاتا۔ ماں بھی جانے والی ہے اسے دیکھنے کے لئے۔ شاید جتو ماسی بھی جائے گی لیکن اُسے تو سر کی پٹی کھول دینی چاہیئے۔"

"وہ میں نہیں جانتی ۔۔ بالکل ہی ناواقف ہوں۔"

"شاید اس کے سر میں شدت کا درد ہوگا!"

"یہ بھی نہیں معلوم مجھے"

"پوچھا کیوں نہیں تم نے اس سے؟"

"میں نہیں جانتی۔"

پھر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ کیا تمہارے گھر سے اندھیرا دور ہو گیا؟ کہاں سے آتا ہے تمہارا سارا اندھیرا تمہارے گھر میں؟" پھر اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر آم کے پیڑ کے پاس چلی گئی۔

باوا کو دیکھنے کی خواہش پھر پیدا ہوئی لیکن میں مندر کا رخ کرنے کی بجائے بنو ماسی کے گھر چلا گیا۔ بنو ماسی پچھلے دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ آج بھی اس نے سفید تہبند باندھ رکھی تھی۔ چہرہ بالکل سوکھ گیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ اس کے سامنے ہی کھڑا رہا۔ ماسی گودڑی سی رہی تھی۔ دھیرے دھیرے ایک ایک ٹانکہ نکال رہی تھی۔

"ماسی!" میرے منہ سے یکایک نکل گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"سر میں درد ہے کیا؟"

"ہاں!"

یکایک مجھے لگا جیسے ایسی ہی آواز اس باوا کے جسم سے نکل رہی تھی۔ میں نے پھر ماسی سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ ماسی نے پھر اوپر میری جانب بھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں اس لئے خوش تھا کہ وہ آج اندر کے گھپ اندھیرے کے بجائے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا اس طرح سے باہر بیٹھنا مجھے بہت اچھا لگا۔ اگر وہ اب بھی اس اندھیرے میں بیٹھتی اس کے سر کا درد اور بھی بڑھ جاتا۔ میں نے ماسی سے کسی اور قسم کی گفتگو مناسب نہیں سمجھی اور پچھلے دروازے سے گھر کی جانب واپس جانے کے لئے مڑا۔ کنویں کے پاس بھاگیرتی اکیلی ہی کھڑی تھی۔ وہ بالکل ہنس نہیں رہی تھی صرف اس کی آنکھیں دور کہیں کچھ تک رہی تھیں۔ پتہ نہیں اس نے ہنسنا کب سے بند کر دیا تھا! پانی نکال رہی تھی، برتن بھر رہی تھی، مگر بالکل خاموش تھی پتہ نہیں اس کی ہنسی کہاں کافور ہو گئی تھی۔ آج تک کبھی نہ بدلنے والی پتہ نہیں آج یکایک کیوں بدل سی گئی تھی۔ یہی ایک دبیز پردہ میرے اور بڑوں کے درمیان تھا جو کچھ سامنے تھا وہ بھی بدلتا جا رہا تھا، اور جو نظروں سے اوجھل تھا اس نے کبھی سامنے آنے کی کوشش نہ کی۔ بھاگیرتی کی خاموشی دیکھ کر یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے میں گونگا ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے اس گونگے پن کو دور کرنے کے لئے اپنے آپ سے ہی باتیں شروع کر دیں۔ اور جب مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ میں بول سکتا ہوں تو میں نے اس بات پر غور کیا کہ میں اپنے آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ محسوس ہوا جیسے دادا جان کبھی کبھار نیند میں بڑبڑایا کرتے تھے، اسی طرح میں بھی بڑبڑایا تھا۔

اس کے بعد میں نے بھاگیرتی کو ہنسانے کی بہت کوشش کی۔ گدگداتا رہا، ناک کھجاتا رہا، مگر ناکام رہا۔ اس کے بعد میں چند پھول توڑ لایا اور اس کے سامنے رکھ دیئے، اور ہونہہ! وہ بہت دور دیکھ رہی تھی اور ڈول کھینچ رہی تھی۔ میں نے پھول وہیں رکھ دیئے۔ اور آگے کی جانب بڑھ گیا۔ بھاگیرتی نے ایک ایک پھول اٹھایا اور مندر کی جانب پھینکتی رہی۔ اور ہر پھول پھینکنے کے بعد اپنے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتی رہی۔ پتہ نہیں وہ پھول اس نے کس پر نچھاور کر دیئے تھے۔؟ کس کو پرنام کیا تھا؟ مگر سارے پھول ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ بالکل نہیں ہنسی خاموش رہی اور دیوانہ وار بہت دور دیکھتی رہی۔ میں نے گھر پہنچتے ہی ماں سے پوچھا۔ "بھاگی ہنستی کیوں نہیں ماں؟"

"تمہارا کیا بگڑا اس میں۔ نہیں ہنستی تو نہ ہنسنے دو۔ تم کو تو سارے گاؤں کی فکر رہتی ہے۔ بھاگیرتی نے ہنسنا ہی چھوڑ دیا باوا نے کھانا چھوڑ دیا! تم صرف پروسا ہوا کھانا کھایا کرو اور برتن دوسری جانب رکھ دیا کرو۔ دوسرے کے برتنوں میں جھانکنے کی کیا ضرورت ہے۔؟"

"لیکن بھاگیرتی آج بھی نہیں رہی ہے ورنہ وہ تو ہمیشہ ہنسا کرتی ہے۔"

"اپنی پڑھائی چھوڑ کر یہ دھندے کیوں اپنا لئے ہیں تم نے؟"
میں نے کہا۔ "ماں دیکھو ناک پر سیاہی لگی ہوئی ہے۔ لے آؤ ذرا آئینہ"

"ضرورت نہیں رہنے دو اس کالک کو"

"لیکن برا لگ رہا ہے"

اس پر ماں ہنس پڑیں "کام میں رہتی ہوں کالک لگ ہی جاتی ہے بالکل اپنے باپ پر گئے ہو۔ اس نے مجھے اپنے قریب کھینچ لیا اور سینے سے لگا لیا۔ بار بار چومتی رہی۔ اس قدر اس نے آج تک پیار نہیں کیا تھا۔ میں اس کی گرفت سے آزاد ہوا اور آئینہ لیکر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے

معمول کے مطابق بُرا بھلا کہا اور کانک صاف کرلی۔ پھر میرے بھی گالوں پر لگی ہوئی کالک بھی اس نے پونچھ دی۔

میں نے پوچھا۔ "باپا کب آئیں گے؟

"گنپتی آجانے کے بعد"

"میرے لئے کیا لے آئیں گے؟"

"میں کیا جانوں ۔۔ ؟"

"لیکن میں جانتا ہوں ۔ ایک البم، باجہ، وشنو کی مورتی"

"پھر تو تمہارے مزے ہیں" ایسا کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر آئینہ دیکھا، بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنے کاموں میں جُٹ گئی میں نے آئینہ سنبھالا اور چلتے چلتے اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ میرا عکس بھی چل رہا تھا۔ مگر میری طرح سیدھا نہیں اُلٹا۔ بالکل اُلٹا۔

ایک دن شام کو وشرام، مندر میں شہنائی بجانے والا، بھاگی بہ سب ہمارے گھر آگیا۔ اس نے کمبل اتار کر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ بیٹھتے وقت وہ "باپ رے" کہنے کا عادی تھا۔ کمر جھک جانے کی وجہ سے اسے اکثر تکلیف رہا کرتی تھی۔ میں نے وشرام کے آنے کی خبر دادا جان تک پہنچادی دادا جان آتے ہی پوچھ بیٹھے "کیا بات ہے آج شام کو ہی آگئے؟"

"کیا کہہ رہے ہیں باوا؟"

"کیا کہتے۔ پہلے تو کچھ کہنے کے لئے ہی تیار نہیں تھے۔ پھر پھر لوبہ ہاتھ پڑتے ہی ۔۔۔۔۔۔!"

"پتہ نہیں کم بخت کہاں سے آدھمکا ہے؟" دادا جان نے اپنے آپ سے کہا۔

"بھاگی کے گھر کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ ؟"

"شام کے وقت کسی کو بُرا بھلا کہنا ٹھیک نہیں۔ ستیاناس ہوجائے ان کا"

وہ آگے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں چپ ہوگیا۔ اس نے اپنی گردن نیچی کرلی۔

"کیوں، چپ کیوں ہوگئے؟" دادا جان نے پوچھا۔

"چلیے میرے ساتھ باہر چلیے۔ وہاں بتلا دوں گا"

بڑی مشکل سے وہ اُٹھ پایا اس کے بعد اس نے اپنی لاٹھی سنبھالی اور سامنے کے بوڑھے آم کے درخت کے نیچے جاکھڑا ہوا۔ دادا جان بھی اس کے پیچھے چل دئے، میں بڑی حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بہت ہی آہستہ آہستہ ان دونوں کی نظروں سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اس درخت کے نیچے جاکھڑا ہوا۔

"لیکن بھاگی اس کے پاس چلی گئی تھی یہ بات کیسے سچ ثابت ہوسکتی ہے؟"

"رات کو بھاگی جو کھانا آپ کے گھر سے لے جاتی ہے، وہیں پہنچا آتی ہے۔ باوا کے پاس!"

"یعنی وہ رات کو وہاں جاتی ہے!"

"گونگی جان ۔ باوا کے پاس نسکار کرنے چلی گئی تھی لیکن کیا سے کیا ہوگیا!"

"نہ جانے کیوں مجھے اس بات پر ابھی تک یقین نہیں آتا۔ لیکن تم جھوٹ کیسے کہہ سکتے ہو!"

"بالکل نہیں۔ اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ وٹھوبا کے پاؤں پر ہاتھ رکھ سکتا ہوں۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں سے وہیں شہنائی بجا رہا ہوں۔ جھوٹ کیسے کہہ سکتا ہوں؟

دادا جان گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ان دنوں گونگی بھاگیرتی ہمارے گھر نہیں آتی تھی۔ میں نے سبھوں سے پوچھا لیکن کسی نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت بھی ان دونوں کی گفتگو سے میں کچھ بھی نہ جان سکا۔ البتہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ بھاگیرتی، باوا کے پاس جاتی ہے اور ہمارے ہاں سے جو کھانا لے جاتی ہے باوا کو دے آتی ہے۔ لیکن اس میں کون سی بُری بات تھی۔ باوا اگر خوش ہوجاتے تو یقیناً یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا گونگاپن دور ہوجاتا۔ اور اس کی قوت گفتار لوٹ آتی اور اس کا شوہر اسے اپنے ساتھ لیجاتا۔ یہ ساری باتیں اتنی صاف اور واضح ہونے کے باوجود بھی پتہ نہیں وہ وشرام کیوں ناراض ہورہا تھا۔ ؟"

"وہ باوا وا وا نہیں کوئی گوتایا ہے سلمان۔ مسلمان گوتایا۔ ایک رات جب یہ دیوانی بھاگیرتی کھانا لے گئی تو اس نے کہا، نہیں نہیں اسے

بھاگے ۔۔۔ وہ شیر کہاں گیا ۔۔۔؟ وہ شیر کہاں گیا؟ جان ہی نکل جاتی تو ٹھیک ہوتا وہ شیر ۔۔۔!" مجھے سب کچھ زبانی یاد ہے،

میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ البتہ اس وقت ضرور سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اس وقت تو یہی سمجھ رہا تھا کہ بڑے لوگوں کی اور چھوٹے لوگوں کی زبانوں میں بھی فرق ہے۔ اور اس فرق کو سمجھنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔

"بھاگی اب گھر پر ہی رہا کرتی ہے؟"

"ہاں اس کا بایاں پاؤں توڑ دیا گیا ہے۔"

"جان ہی لینی تھی اس کی۔"

پتہ نہیں کیوں دادا جان ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ وشرام نے اس کا پاؤں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس پر اسے جان سے مارنے کی صلاح دے رہے تھے۔ مجھے یکایک شالو بلی یاد آ گئی۔ ایک روز وہ چھپکلی کی تاک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ہمیشہ چھپکلی کی دم پکڑنے کی کوشش کیا کرتا۔ اس وقت میں نے سوچا اگر شالو کے ہاتھ وہ چھپکلی آ گئی۔ تو یقیناً وہ اُسے صاف کر کے رکھ دے گی۔ اور اس کی دم مجھے نہیں مل سکے گی۔ اس لئے میں نے پتھر اُٹھا کر شالو کی طرف دے مارا جو سیدھا اس کی ٹانگ پر جا لگا اور وہ لنگڑاتی ہوئی چلنے لگی اکثر وہ صبح کے وقت سورج کی روشنی میں اسے چاٹا کرتی تھی۔ اور زخمی پاؤں لئے لنگڑاتی اور اپنے آپ کو کھینچتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ اب بھاگی رتی بھی بے چاری ایسی ہی چل رہی ہو گی، شالو بلی کی طرح، کاش وہ بادا ہی یہاں نہ آتا۔ تو اس بے چاری بھاگی رتی کی یہ حالت نہ ہوتی۔ لیکن اگر وہ خوش ہو جاتے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسکی قوت گویائی لوٹ آئے۔ اسے صاف صاف سنائی بھی دے۔

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔"

"لیکن خیال رہے بادا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دو۔ اُسے ہم سمجھا بجھا کر دیکھ لیں گے۔ اگر نہ مانے تو اس کے بعد اگلا قدم اُٹھایا جائے۔"

میں جلد ہی پرے ہٹ گیا۔

دادا جان گھر کی طرف آ گئے اور وشرام اپنی راہ پر آگے آگے بڑھنے لگا۔ کمر کافی جھک گئی تھی۔ اس لئے دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ دادا جان کے آتے ہی میں نے کتاب کھولی، البتہ پورا دھیان ان کے چہرے کی طرف ہی تھا۔ وہ چاروں اُور دیں ہی گھوم رہے تھے اور بار بار "شمبھو شمبھو" کہہ رہے تھے۔

دوسرے دن میں بھاگی رتی کے گھر چلا گیا۔ وشرام سامنے ہی ایک مٹکا لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بیٹھنے کے لئے کہا۔

میں نے پوچھا "کیا ہے مٹکے میں؟"

"ناگ"

"تم نے پکڑا ہے؟"

"ہاں پہلے پکڑا کرتا تھا۔ لیکن اب بہت سال بیت گئے۔ اب اس ناگ کو لئے آپ لوگوں کے دروازوں کے چکر کاٹوں گا، پیٹ تو بھرنا ہی ہے نا!"

میں نے دیکھا وشرام اس ناگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک عجیب وحشت سے چمک رہی تھیں۔

"بھاگی کہاں ہے؟"

"پاؤں ٹوٹ گیا ہے اس کا چل نہیں سکتی بے چاری۔"

"ناگ لئے در در گھومنے کے بجائے شہنائی کیوں نہیں بجاتے۔؟"

اُس نے اپنی نظریں اُٹھائیں اور عجیب انداز سے میری طرف دیکھا۔ "تم بچے ہو ابھی۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔"

"کیا بہت بڑا ہے؟"

"ہاں! کیا دیکھنا چاہتے ہو۔۔۔ لیکن نہیں جاؤ۔ اپنے گھر چلے جاؤ۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دھوبا کے مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مندر کے کلس پر ایک کوا بیٹھا ہوا تھا۔ اور بار بار چلا رہا تھا۔ پتہ نہیں باقی سارے کوے کہاں غائب ہو گئے تھے۔؟ میں نے اندر کی جانب جھانک کر دیکھا اکیلی مالو کھیل رہی تھی۔ ڈھیر سارے پھول اور پتے جمع کر رکھے تھے دھوپ میں گھومتے رہنے کی وجہ سے اس کے گال بہت ہی سُرخ ہو گئے تھے۔

"مالو" میں نے آواز دی، البتہ وہ اپنے کھیل میں بے حد مگن تھی۔ اس لئے میں نے ایک بار پھر آواز دی۔

"مالو"

"اسی طرف چلے آؤ۔۔۔ پتہ نہیں یکایک تم کہاں کھو جاتے ہو، کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں۔۔۔؟"

"بھاگی رتی کو دیکھنے کے لئے چلا گیا تھا۔"

کہاں گئے تھے تم ؟"

اس دیوانی لڑکی کا میری طرف دھیان ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی آنکھیں خاموش تھیں۔

"چلو ہم بادا کو دیکھ آئیں۔"

"نہیں مجھے ڈر لگتا ہے اس بادا سے۔"

"تم میرے پیچھے پیچھے چلی آنا۔"

"بالکل نہیں، چلو اب ہم گھر چلیں کافی دیر ہو رہی ہے۔"

"چلو مندر میں۔ وہیں بادا کو دیکھیں گے اور پھر سیدھے گھر۔"

"تم اکیلے ہی چلے جاؤ میں یہیں پر تمہارا انتظار کروں گی۔"

وہ میرے جواب کا انتظار کئے بنا ہی نیچے بیٹھ گئی اور چند پتے جمع کر کے کھیل میں مگن ہو گئی۔ میں اپنے پیر پٹکتے ہوئے مندر کی طرف چلا گیا پھر دھیرے دھیرے ایک۔ ایک۔ سیڑھی چڑھنے لگا۔

بادا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل ہی اتر گیا تھا۔ سامنے پیپل کا پیڑ ہولے ہولے ڈول رہا تھا۔ چار پانچ چڑیاں ادھر ادھر پھدک رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں کھڑے ہو کر بادا کو دیکھنے لگا۔ لگتا تھا ان دنوں بادا کے درشن کے لئے شاید کوئی بھی نہیں آ رہا ہوگا۔ چونکہ مندر میں دھول اٹی ہوئی تھی۔ اور کہیں بھی پیروں کے نشان دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یکایک پھر وہی آواز بادا کے جسم سے نکل پڑی، جیسے پرندے دھیرے دھیرے لکڑی میں سوراخ کر رہے ہوں۔ یکایک چڑیوں نے اپنے پر تول لئے اور باہر کی طرف پھدکنے لگیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس کی پیٹھ کو کان لگا کر اس آواز کو سن لوں، مگر ہمت نہیں ہوئی میں نیچے اتر آیا مالو کھیل رہی تھی۔

"مالو" مالو صرف گھوم رہی تھی۔

"اے مالو ۔۔۔"

مالو نے یکایک اپنے ہی گرد گھیرا ڈال دیا۔ اور اس کا رنگ برنگا اسکرٹ چاروں طرف سے پھول گیا۔

"مالو ۔۔۔ تم گھنٹی بجا سکو گی ؟"

"اونہہ ۔۔۔ تم ہی بجانے کی کوشش کرو۔"

"میں نہیں بجا سکوں گا۔"

"میں جھک جاتی ہوں۔ تم میری پیٹھ پر کھڑے ہو جاؤ اور گھنٹی بجاؤ۔"

میں اس کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا ڈھیر سارے گلاب کے پھول پاؤں کے نیچے آ گئے ہیں۔

"نہیں ۔۔۔ میں گھنٹہ بجانا نہیں چاہتا۔"

"لیکن کیوں ۔۔۔ ؟"

"نہیں ۔۔۔ بس یوں ہی۔"

"لیکن کوئی تو وجہ ہو ۔ ؟"

میں سمجھ گیا۔ اب مالو مجھ سے کبھی نہیں بولے گی۔ اس سے واسطہ رکھنا ہی کیا ضروری تھا۔ اس کی آنکھیں تو ہمیشہ ہی بے اعتنائی سی برتتی ہیں۔

گھر پہنچتے ہی دادا جان نے کہا "کیوں گھوم آئے سارا گاؤں ؟"

مالو اپنی دھن میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

ابھی ابھی دیپے جل اٹھے تھے۔ وشرام شہنائی بجانے والا ہمارے گھر آ گیا۔ میں نے پوجا کر لی تھی۔ دادا جان ابھی تک منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ اور پھیرے لگا رہے تھے۔ درخت کے اس پار دور سے دیپے بالکل جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ پرچھائیاں بڑھ رہی تھیں۔ دادا جان اور وشرام آم کے درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ میں بھی چوری چھپے ان کی باتیں سننے کے لئے وہاں جا پہنچا۔ کچھ دیر نہ جانے کیا باتیں ہوتی رہیں۔ میں کچھ بھی نہ سن سکا۔ البتہ وہاں سے بھاگ آنے کی ہمت بھی مجھ میں پیدا نہ ہوئی۔ ہم تینوں کی پرچھائیاں درختوں کی پرچھائیوں کے ساتھ بالکل ہی مل گئی تھیں۔

"وشرام تو نے جو کچھ کیا ٹھیک نہیں کیا۔ البتہ اب رونے دھونے سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اسے برداشت بھی کرنا چاہئیے۔"

"کچھ بھی ہو میری ہی بیٹی تھی وہ، اور میں اسے اپنے ہاتھوں ۔۔۔؟"

"اس طرح اب دل چھوٹا نہ کرو وشرام ورنہ بات سارے گاؤں میں پھیل جائے گی۔ تم نے مجھ سے تو کہہ دیا لیکن خیال رہے کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا ۔۔۔"

"بالکل نہیں ناتیا۔ کسی سے نہیں کہوں گا، کسی کے سامنے نہیں روؤں گا۔ سمجھ لو یہ سارے آنسو درخت کے پانی کی سوکھ گئے ہیں۔ اب روؤں گا بھی تو اس شہنائی میں۔ میں اسے تھوڑی ہی سکتا نہیں۔ وٹھوبا کے مندر میں شہنائی بجانے والا ہوں، اب اس شہنائی میں رو پڑوں گا۔ کسی کے سامنے اپنے آنسوؤں کو ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔ خاندان کو بدنام کر دیا اس نے یہ" اس کے بعد میں نے دیکھا وشرام اور بھی جھک گیا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا، اور دور جھاڑیوں میں ٹمٹماتے دیئے بھاگی رتی کی آنکھوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

باوا ایکا ایک کہیں سے آ گیا تھا۔ اور ایکا ایک کہیں غائب ہو گیا تھا بھاگیرتی کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ اس دنیا سے چل بسی۔ اس بات کے چرچے گاؤں میں ہو رہے تھے۔ اور مجھے یاد ہے ایک روز جب میں وشرام کے گھر بھاگی کو دیکھنے کے لئے چلا گیا تھا تو وہ ٹکے میں سانپ کو بند کئے اس کے پاس ہی بیٹھا عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اسی دوپہر کو وہ سانپ لئے پورے گاؤں میں گھوما تھا اور گاؤں میں اس بات کے چرچے ہو رہے تھے کہ بہت برسوں کے بعد وشرام نے سانپ پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ نجانے اسے کیا سوجھی تھی ـــ؟

وٹھوبا کے مندر میں ہر وقت شہنائی بجا کرتی اور دادا جان بڑی پوری توجہ کے ساتھ سنا کرتے اور خود بخود ان کا ہاتھ آنکھوں کی طرف چلا جاتا۔ وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتے ـــــ وہ سُر کسی بھی وقت سنائی پڑتے دن میں بھی، اور رات کی گہری خاموشی میں بھی۔ بھاگیرتی کی آنکھوں کی طرح یہ سُر بھی بہت ہی نرالے تھے۔ بالکل نرالے۔ بھاگی ہنسا کرتی مگر اس کی آنکھیں اس ہنسی سے ہمیشہ دور رہا کرتیں۔ بالکل اسی طرح یہ سُر بھی۔ ! اور سامنے یہ سسکتی ہوئی تصویر، اس کا ہرا نیلا اندھیرا، لال چھپر کا مکان یہ سب کچھ ان سُروں ہی کی طرح ..... !!

شریمتی شرش پَے

ناٹا

بارش نہ رکتی نظر آتی تھی نہ ٹوٹ کر ہوتی تھی۔ رم جھم پھوار برس رہی تھی اور پورے ایک گھنٹے سے یہی رونا جاری تھا۔ سری دھر ہوٹل سے باہر آگیا۔ چائے کا دوسرا کپ اس نے یوں ہی زہر مار کیا تھا۔ گلے سے پورے جسم میں ایک گرم رو بہہ رہی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے سگار جلایا۔ پاؤں میں گم بوٹ تھے۔ اس نے چھتری سنبھالا اور اوور کوٹ کو پورے جسم پر پھیلاتے ہوئے بس کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بس کا اڈہ بالکل خالی تھا۔ اڈہ کے قریب ہی ایک پل تھا اور پل کے دونوں طرف ٹین کی چادر پھیلائی ہوئی تھی۔ اس کے اندر اکثر پھیری والے بارش سے بچنے اور سامان نہ بھیگنے کے لئے رک جاتے تھے۔ سری دھر نے پل کی طرف نظر دوڑائی۔ دوسرے سرے پر ایک بونا اپنے آپ کو بارش سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ قد میں تین فٹ کا بھی نہ تھا۔ البتہ اس کا جسم بھرا ہوا اور کسا ہوا نظر آتا تھا۔ گندمی رنگ اور موٹی بھری پُری گردن۔ کھڑے کھڑے وہ جماہیاں لے رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے ہوئے تھے۔ سری دھر نے اس کو غور سے دیکھا۔ پھر اس کے پورے جسم میں ایک جھرجھری دوڑ گئی۔ "کیا اس کا شمار انسانوں میں کیا جا سکتا ہے؟"، اسی وقت ایک آگ گاڑی پل کے نیچے سے گزر گئی۔ پورا پل ہل رہا تھا۔ بونے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور سری دھر کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی بہت بڑی تھیں۔ ناک بڑی تھی اور چپٹی، ہونٹ تہہ در تہہ اندر کی جانب چلے گئے تھے اور ایک دانت وہیں ہونٹوں کے قریب آ کر جم گیا تھا۔ سری دھر کو اس بونے سے ڈر محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنی لال لال آنکھوں سے سری دھر کو برابر دیکھے جا رہا تھا۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا — سری دھر قدرے سنبھل گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے چونی نکالی اور اس کے آگے بڑھا دی۔ بونے نے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا، صرف گردن ہلا کر نفی میں جواب دے دیا۔ پھر اپنی جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "اس میں پیسے ہیں۔"

بارش ختم ہو گئی تھی۔ کالے بادل ہٹ گئے تھے، اس لئے سورج کی کرنیں دھرتی پر پھیل گئی تھیں۔ بس ابھی تک نہیں آئی تھی اور سری دھر کھڑے کھڑے اکتا گیا تھا۔ بونا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور پھر ایک بار ہنس پڑا۔ ہنستے وقت اس کا دانت نچلے ہونٹ میں برابر پھنسا رہتا تھا۔ اس نے سری دھر کی طرف دیکھ سلام کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا اور پھر راستہ کی جانب مڑ گیا۔ اپنا بھرا ہوا جسم کبھی دائیں کبھی بائیں جھکاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی پیٹھ ایک طرف اوپر آ گئی تھی۔ اور پاؤں کا توازن برابر نہیں تھا۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک سری دھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بونے کو دیکھ کر سری دھر کے دل میں رحم و اپنائیت کے جذبات ضرور ابھرے تھے، البتہ اس کے قریب آ کر اس کا سلام کرنا کچھ عجیب سا لگا تھا۔ بونا اس کے قریب آگیا۔ تو اس کی بدصورتی سے اس کے جسم کے بال کھڑے ہو گئے۔ انسانوں جیسی آنکھیں اور انسانوں جیسے ہاتھ پاؤں ہونے کے باوجود بھی وہ جانور دکھائی دیتا تھا۔ بلکہ جانور! چڑیا گھر کے جانور صرف دور سے ہی دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ البتہ یہ بونا انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا، انسانوں میں گھوم رہا تھا انسانوں جیسے ہی جذبات تھے اس کے ......! بس آ گئی اور سری دھر نے بونے کو اپنے خیالوں سے پرے ڈھکیل دیا۔

تین روز کے بعد وہ بونا پھر دکھائی دیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ آج دن کے شو کے لئے جا رہا تھا۔ زندگی بھر میں سنیما ہی اس کے دل بہلانے کا سامان تھا۔ چاہے کتنی بھیڑ کیوں نہ ہو، منہ مانگی قیمت دے کر وہ کچھ دیکھنے کا عادی

ہوچکا تھا۔ اس روز کندھے سے کندھا چھل رہا تھا۔ ٹکٹ ملنے کی قطعی اُمید نہیں تھی۔ پھر بھی وہ راستہ تلاش کر رہا تھا۔ یوں جوں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا، پچھلی جانب دھکیلا جاتا۔ وہ بے حد مایوس ہوچکا تھا۔ اسی وقت کسی نے آکر اس کی پینٹ کھینچی۔ سری دھر نے پچھلی جانب دیکھا۔ بونا اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"سلام صاحب، کیا ٹکٹ نہیں مل سکا۔؟"

سری دھر نے نفی میں اپنی گردن ہلا دی

کیچڑ میں مینڈک جس طرح چلاّ اُٹھتے ہیں بالکل اسی طرح اُس کی آواز تھی بونے نے اُلٹے سیدھے پاؤں چلائے اور بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ ایک ٹکٹ لئے حاضر ہوگیا۔ سری دھر نے روپئے اس کی جانب بڑھا دیئے۔ اس نے لینے سے انکار کیا اور ہنستے ہنستے بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

سری دھر کو بے حد تعجب ہو رہا تھا۔ شاید وہ ایسے ہی دھندے کرکے اپنا پیٹ پال رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کا لمس اب بھی اس کے ہاتھوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ آخر اس نے ٹکٹ کے پیسے لینے سے انکار کیوں کیا سری دھر سوچتے سوچتے سینما ہال میں داخل ہوگیا۔

شو چھوٹنے کے بعد وہ اپنے خیالوں میں غلطاں آگے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بھیڑ کم ہوتی گئی اور راستہ صاف ہوتا گیا۔ اسی وقت اسے محسوس ہوا جیسے کوئی تیز تیز قدموں سے اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، "سلام صاحب!" کہہ کر بونے نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک سگار نکالا، اور سری دھر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تھینک یو"

بونے کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ وہ ہنستے وقت اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔

"ٹکٹ کے کتنے روپئے دینے ہیں مجھے؟" سری دھر نے دریافت کیا۔

بونے نے نفی میں اپنی گردن ہلا دی

راستے کے دوسری طرف ایک ہوٹل تھا۔ اور اس کی روشنی راستے پر [illegible] سری دھر نے سوچا کیوں نہ اس بونے کو چائے پلائی جائے [illegible] سے قریب جا آئے، اسی خیال کے آتے ہی

وہ کانپ کر رہ گیا۔ بونے سے اب وہ خوف کھانے لگا تھا۔ اس نے "اچھا!" کہہ کر اپنا راستہ لیا اور بونے کے دیئے ہوئے سگار کو سڑک پر بہت دور پھینک دیا۔

سینما سے اس کا کمرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں ایک پرانی بلڈنگ کے ایک کمرے میں رہا کرتا تھا۔ تالا کھولتے وقت نہ جانے اسے یکایک کسی بات کا خیال آگیا کہ اس نے پچھلی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس پرانی لمبی چال کے سامنے کے راستے پر ایک پیٹرومکس جل رہا تھا۔ اور پیٹرومکس کے نیچے بونا کھڑا تھا۔ بونے کی جانب دیکھتے ہی اس نے سلام کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ سری دھر نے دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی دروازہ زور سے بند کر دیا۔ بونے کو اس جگہ دیکھ کر اس کا دم نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ آخر یہ بونا میرے پیچھے کیوں لگا ہوا ہے؟ سری دھر کا جسم پسینے سے بھیگ گیا جوں توں اس نے اپنے کپڑے اتار لئے۔ پر نیند کا کوسوں دور کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ بس وہ بونا اس کی نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ بونا اُس کے دماغ میں آکر گھس گیا تھا، اور اب نکلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بہت سارے بونے قطار باندھے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے بچپن کا ایک قصہ یاد آگیا۔ ناٹے قد کی ایک عورت جب نل پر پانی بھرنے آجاتی تھی تو ساری عورتیں ہنس پڑتی تھیں۔ وہ دن بھر کسی نہ کسی کام میں مصروف دکھائی دیتی۔ ایک بار ایک عورت نے اس کا حد سے زیادہ مذاق اُڑایا تو وہ اس کے پیروں سے جا لپٹی، عورت گر پڑی اور ماتھے سے خون بہنے لگا۔ اس گہرے زخم کا نشان اب بھی داغ کی صورت اس کے ماتھے پر موجود تھا۔ ایسے ہی ایک بار وہ کورٹ چلا گیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تفتیش کے بعد پتہ چلا ایک بونے نے ایک طوائف کا خون کر دیا تھا۔ طوائف کے اس بونے سے تعلقات تھے۔ البتہ ایک روز کسی اور شخص کو اس کے ساتھ دیکھتے ہی اس نے طوائف کا گلا دبا دیا۔

ایک اور واردات! ایک بونے کو ایک خوبصورت سی لڑکی سے بے حد پیار تھا۔ البتہ وہ لڑکی کبھی اسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ ایک روز بونا اسے اپنی گاڑی میں لے گیا۔ سنسان راستے پر اس کی عصمت لوٹی اور اسے وہیں ختم کرکے اپنے گھر چلا آیا۔ سری دھر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں البتہ نیند۔۔۔ با نیند کی جگہ بونا بدستور کھڑا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور اس پیٹرومکس کے نیچے دیکھا وہاں کوئی موجود نہیں تھا، صرف بتی جل رہی تھی۔

اس نفرت کے مارے سینما چھوڑ دیا۔ ایک روز وہ بے حد تھک چکا تھا۔ گلا بیٹھ گیا تھا، آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور پلنگ پر پڑ رہا۔ اندھیرا چاروں طرف پھیلتا گیا۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دیا جلا سکے۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ کمرے کے اندھیرے میں اسے یکایک محسوس ہوا جیسے وہ ناٹا اس کمرے کے کونے میں کھڑا اُسے تک رہا ہے۔

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ آخر تو یہاں کیوں چلا آیا ہے؟"

سری دھر نے کونے کی طرف اپنی نظریں گاڑ دیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پر وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ بخار نے زور پکڑا۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے، اُسے پھر اس بات کا احساس ہوا جیسے وہ بونا اس جگہ بدستور کھڑا ہے۔ اس نے جسم پر کی چادر ہٹائی اور جوں توں بجلی کے سوئچ کی جانب چلا گیا۔ روزانہ اسکا ہاتھ سیدھا سوئچ ہی پر جاتا تھا، مگر آج سوئچ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گھبراتے ہوئے تلاش کر ہی لیا۔ اور جب بجلی جل اُٹھی تب اس نے دیکھا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے پورا کمرہ پھر ایک بار دیکھ لیا۔ اور جب اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو اس نے بجلی بھی بجھا دی۔ تین روز بخار میں مبتلا رہا اور جھلستا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے صحت یاب ہو گیا۔ اسے اپنی اس بے وقوفی پر ہنسی بھی آئی۔ البتہ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ اس بونے سے کبھی نہیں ملے گا۔ ایک روز وہ ٹہل کر رات کے دس بجے واپس آ رہا تھا۔ وہ جوں ہی اپنی گلی میں جانے کے لیے مڑا "سلام صاحب!" کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ سری دھر کے قدم وہیں رُک گئے۔ بائیں ہاتھ کی دوسری جانب ایک گھر سے ٹیک لگائے وہ کھڑا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور ایک چمکدار فونٹین پین آگے بڑھایا۔

"لیجئے صاحب، آپ رکھ لیجئے۔"

پتہ نہیں وہ پین بونا کہاں سے لے آیا تھا۔ اس نے ساٹن کی ایک لمبی سی قمیص پہن رکھی تھی اور بالوں میں کنگھا کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایمانداری چمک تھی۔ جیسے ایماندار کتے کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں، بالکل اسی طرح اسکی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سری دھر نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ اس بار اسے اور بھی وحشت ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اس بونے کے دل میں کیا ہے؟ آخر وہ کیا چاہتا ہے؟" سری دھر نے لینے سے انکار کر دیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

دوسرے دن پان والے کی دوکان کے سامنے آکر اس نے اپنا سگار جلایا۔ سامنے لگے ہوئے آئینے میں اس کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ پاپلین کی سفید شرٹ اور ہرے رنگ کی پتلون، سنہرے گھنگھریلے بال اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ بھرا بھرا جسم، پورا آدمی، پورا انسان ...... اور یہ ...... بونا جیسے انسانوں میں سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ جانوروں میں جا نہیں سکتا تھا اور اس سے دوستی قائم کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بھی آپ ہی لوگوں میں سے ایک ہوں، ایک آدمی ہوں، ایک انسان ہوں، لیکن سری دھر نے دوستی کے ہاتھ کاٹ کر رکھ دیئے تھے۔ اس نے اس وقت سوچا اُسے پین قبول کر لینا چاہیئے تھا۔ اس نے ایک پین واپس کر دیا ایک دوستی ختم کر دی۔ ایک بونے کے پیار اور جذبات کا مذاق اُڑایا۔ ایک انسان کو اپنے دروازے سے ......!

کئی دنوں تک بونا دکھائی نہیں دیا اور جس وقت دکھائی دیا سری دھر اس کی طرف چل پڑا۔ سینما کے سامنے کئی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ایک اندھا ہارمونیم بجا کر گا رہا تھا اور بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا تھا، اس کے باوجود بھی وہ برابر ہارمونیم بجائے جا رہا تھا۔

"مر تو رہے ہیں دیوانے، دو چار ادھر، دو چار اُدھر
کیوں جل کر مر گئے پروانے، دو چار ادھر، دو چار اُدھر"

بونا انہیں لوگوں میں کھڑا تھا اور اپنا سر جھکائے گانا سن رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی سری دھر اس کی جانب مُڑ گیا۔ گانا سنتے وقت اس کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ یکایک اس کی نظر سری دھر پر جا پڑی۔ سری دھر اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بونے نے سری دھر کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھیڑ میں سے نکل کر دوڑتا ہوا فٹ پاتھ کی دوسری جانب غائب ہو گیا۔ سری دھر اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے بعد وہ بونا ہمیشہ کے لئے کہیں غائب ہو گیا اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔ انسانوں میں آنے سے قبل ہی اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے تھے۔ انسانوں کے سارے دروازے اس کے لئے بند کر دیئے گئے تھے!!!

مدھو منگیش کرنک

انسان

کانچ کے اس نئے گھر میں آئے ہوئے اب آٹھ روز ہوئے تھے۔ اور یہ گھر اسے اپنے پہلے گھر کی بہ نسبت کافی پسند تھا۔ پہلا گھر بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور گھر میں گھور اندھیرا، جگہ کی کمی کی وجہ سے وہ اپنا سر بھی اونچا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے یہ نیا گھر اسے بہت پسند تھا۔ اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا شخص بار بار اسے چھیڑتا اس لئے وہ غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے پھن کو اٹھاتا اور اس کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ البتہ اسی وقت اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوتا۔ اور پھن چھوئی موئی کے پتوں کی طرح سمٹ جاتا۔ بس اس طرح لمحہ لمحہ گذر رہا تھا اور بار بار جنگل کی یاد ستاتی۔ چاروں طرف ہرے بھرے درخت لال نرم مٹی اور سالا سالا گرم بل، بل میں داخل ہوتے ہی دنیا کی ساری تکالیف سے چھٹکارا مل جاتا تھا۔ آم کے موسم میں بور کی مہک سونگھتے سونگھتے وہ اس بل کے قریب آگیا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے اپنے جسم پر کی کینچلی اتار دی تھی۔ اس لئے نئی تازگی کے ساتھ ساتھ چمک دمک میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ بارش کے دنوں میں اس بل میں پانی بالکل نہیں آتا تھا [illegible] بے خبر تھی اور بے حد اہم بھی! اس لئے پھر اس نے [illegible] سب دیکھا۔ اور وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن اس محفوظ بل نے اسے ایک دھوکا دے دیا۔ پتہ نہیں کہاں سے وہ آدمی اس محفوظ بل کے قریب ہی چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسی روز اسے اپنی کینچلی اتارنی تھی۔ پورا جسم بالکل سست ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اپنی ہی جگہ پر [illegible] بیٹھے رہیں۔ البتہ کینچلی اتارنے کے بعد پتھروں، ہریالی اور سوکھے [illegible] کے بعد جو خوشی حاصل ہوتی تھی جس کا کوئی مول نہیں [illegible] ٹکٹکی باندھ کر باہر کی جانب نظریں دوڑائیں مگر یوں ہی

وہ باہر آیا۔ اس کی گردن پر ایک بھرپور ہاتھ آکر جم گیا۔ دم گھٹنے لگا — اس نے پوری طاقت سے اپنا جسم سمیٹا مگر ناکام رہا۔ اور اس آدمی نے اسے اپنے جال میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا، ان دونوں نے مل کر اس کے دانت دئیے۔ اور وہ خون سے بھرے منہ کے ساتھ اپنی گردن جھکائے پڑا رہا۔ کئی بار اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ اور ہر بار ناکام رہا .... ان ساری پرانی باتوں کو [illegible] اس نئے کانچ کے گھر میں بغیر دانتوں کے جگالی کر رہا تھا۔ اور کانچ کو منہ لگائے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس گھر کے اوپر کی جانب ایک باریک جالی تھی۔ اور چاروں طرف کانچ ہی کانچ۔ جالی کے ذریعہ بھانت بھانت کے لوگ بھانت بھانت کی چیزیں ڈالا کرتے اور وہ بنا دانتوں کے انہیں کھاتا رہتا۔ زندگی بھر میں اتنے سارے انسان کبھی نہیں دیکھے تھے اس لئے وہ متواتر ان کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کرتے، اس لئے وہ سارے آدمی اسے بھاگے تھے۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے مرد اور عورتیں۔ ان کے جسموں سے پھوٹتی ہوئی خوشبو۔ عورتیں قریب آتیں، خوب جی بھر کر دیکھا کرتیں۔ پھر اپنے ناخنوں سے کانچ کی سطح کریدتیں، وہ انہیں دیکھتا ہی رہ جاتا۔ پھر اپنے پھن نکالتا .... اور عورتیں ڈر کے مارے بھاگ جاتیں۔ اور وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا!

دھیرے دھیرے اس کا معمول بن گیا۔ آدمیوں کو دیکھنا، سونگھنا، اور پھر اپنا پھن نکالنا۔ اسے ان آدمیوں کے بنا کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر صبح سے دوپہر تک ایک بھی آدمی اس کے قریب نہیں آتا تو اس کا جی گھبرانے لگتا تھا، اور وہ ملول ہو کر [illegible] کانچ کی دوسری طرف آدمیوں کو تلاش کیا کرتا۔ اسے بار بار لگتا یہ سارے آدمی میں یوں ہی ؟

آگے سرکا کرتیں اور وہ بھی انھیں متواتر دیکھتا رہتا۔ ان کے جسموں سے اٹھتی ہوئی خوشبو سونگھا کرے۔ کبھی کبھار تو اُسے کسی خوبصورت ہاتھ کے دکھائی دینے کے بعد محسوس ہوتا کہ اس ہاتھ پر کچھ دیر کے لئے لیٹا رہے۔ کسی نازک گورے کندھے کو چاٹتا رہے۔ وہ آدمیوں کو دیکھا کرتا اور من ہی من میں کچھ کہا کرتا۔ کچھ سمجھا کرتا۔

تجربہ گاہ میں اس روز کافی ہلچل تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے اس تجربہ گاہ میں کئی تجربے کئے گئے تھے۔ تجربے ہو رہے تھے۔ سانپ کے زہر سے ایک مفید اور کارآمد دوا بنائی جا رہی تھی۔ اس لئے نئے نئے مداری نئے نئے سانپ لے آتے اور انھیں خرید کر ان پر تجربے کئے جاتے تجربے کے لئے کچھ دن ہی مخصوص تھے اس لئے باقی دنوں میں سانپ خریدے جاتے اور انھیں کانچ کے گھر میں رکھا جاتا۔ پھر چیر پھاڑ کی جاتی اور اسی روز ان کی زندگی کے دن ختم ہو جاتے۔ آج تجربے کا دن تھا اس لئے تجربہ گاہ میں کافی ہلچل تھی۔ آدمی سفید لباس پہنے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے، تیز اور چمکدار ہتھیار لئے ہر پنجرے کی طرف جا رہے تھے آج صبح سے اس کے پنجرے کی طرف ایک بھی آدمی کا گذر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس کا جی اوب گیا تھا۔ اور اس پر ایک قسم کی گھبراہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ مگر اسی وقت وہ سفید پوشاک پہنے لوگ اس کے پنجرے کی طرف آگئے، اور انھیں دیکھتے ہی اسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ اس نے انھیں خوب جی بھر کر دیکھا انھیں سونگھا اور پھر اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے کانچ کی سطح کو چاٹنا شروع کیا۔ پنجرے کے قریب آتے ہی ان دونوں میں گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا اس نے بھی ان کی بات چیت سننے کے لئے کان کھڑے کئے۔ ان کی اس اپنائیت پر اُسے اور بھی حیرت ہوئی۔ اس کے بعد وہ دونوں دوسری جانب مڑ گئے اور دوسرے دو آدمیوں کو بلا لائے انھوں نے ایک باریک چھڑی اوپر کی جالی میں داخل کی اور اُسے چاروں جانب سے بغور دیکھا اور کہا "It is no use, killing it. You won't find any thing in it, let it go" دوسرے نے کہا Let us try اب اس میں دانت نہ ہوئے تو کیا ہوا زہر تو ہوگا ہی!"

"لیکن نہیں! پچھلی بار بھی ہم نے اسی قسم کے ایک سانپ کو مارا تھا۔ اس میں زہر کا دور دور تک کوئی نام نشان تک نہ تھا۔ ایسے سانپوں سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"چلو ہم اسے آزاد ہی کر دیں کم از کم آس پاس کے چوہے ہی ختم کر دے گا۔"

"اس سے بہتر تو یہی ہوگا کہ اسے کسی مداری کے حوالے کر دیا جائے اس کی روزی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

Who has life to do all this

"آخر اسے کہاں چھوڑا جائے؟"

"بلڈنگ کی پچھلی جانب!"

اسی لمحہ ایک آدمی نے پنجرہ کھول کر اس کی گردن چمٹے سے پکڑ لی۔ اس لمحہ پھر اُسے جنگل کا حادثہ یاد آیا۔ بالکل اسی طرح اُسے پہلی بار پکڑا گیا تھا۔ اس بار بھی اس نے پورا جسم سمیٹ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پتہ نہیں یہ اتنے اچھے آدمی ہونے کے باوجود بھی ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ایک بار بھی انھیں کاٹ کھانے کا جذبہ میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے مجھے پیار دیا اور میں نے بھی پیار کا جواب پیار ہی سے دیا۔ ارے مجھے اس کانچ کے گھر سے کیوں نکال رہے ہو؟ رہنے دو مجھے اسی گھر میں! ہر طرح کا سکون میسر ہے مجھے"...... مگر اسی طرح چمٹے میں پکڑ کر وہ آدمی اسے ایک باغ میں لے آئے باغ کے مالی کے ساتھ ساتھ اور بھی تین چار آدمی دوڑے دوڑے آئے اور اس کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ آدمی اسے بہت دور لے آیا۔ اس کی مُندی ہوئی آنکھوں نے لال مٹی دیکھی، ہرے ہرے درخت اور نیلا آکاش دیکھا۔ اسی لمحہ اُس آدمی نے اپنے چمٹے سے اُسے بہت دور پھینک دیا۔ آزاد ہوتے ہی اُسے ایک جھرجھری سی محسوس کی اور پھر اس سرے سے اس سرے تک دوڑتا رہا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اس آدمی نے اُسے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ پہنچاتے ہوئے، کوئی اذیت نہ دیتے ہوئے آزاد کر دیا تھا۔ آدمی۔ بے چارہ آدمی!! اسی لمحہ ایک مینڈک آ نکلا اور اس نے اس کا پیچھا کرکے پکڑ لیا۔ کئی دنوں کے بعد

وہ آزاد ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ کبھی نیچی ڈھلوانوں پر تو اتر دوڑ رہا تھا مگر اس کے لئے سمتی ستم گرا سے پسند آ گئی تھی۔ اس نے کئی دنوں کے بعد جانور دیکھے، کتے دیکھے، پرندے اور گرگٹ دیکھے۔ وہ بہت ساری چیزیں اس نے دیکھ لیں جو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

شام ہوئی اور سائے پھیلنے لگے۔ وہ پتوں کے سوکھے ڈھیر کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آنے والے آدمی کی یاد آئی۔ سفید اور رنگا رنگ کپڑے پہنے ہوئے آدمی۔ ان کی حرکتیں، ان کے جسموں سے آتی ہوئی خوشبو اُسے یاد آ گئی اور وہ بالکل بے چین ہو گیا۔ انسانوں کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں جاگ اٹھی۔ اور نہیں دیکھ سکنے سے وہ بالکل بے قرار ہو گیا۔ اس نے اپنا جسم سنبھالا اپنے اب... اس کا گھر کی جانب نکل پڑا۔ کچھ دور رینگنے کے بعد وہ اطراف میں نظریں دوڑاتا۔ تھوڑی دیر کے لئے رک کر خطرے کا پتہ لگاتا اور راستہ صاف ہوتے ہی چل پڑتا۔ اب وہ چلتے چلتے تجربہ گاہ کے پچھلے دروازے کی طرف آ گیا تھا۔ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور اپنی نظریں دوڑائیں۔ دور دور تک صرف آدمی نظر آ رہے تھے۔ صرف آدمی، صرف انسان۔ ان کی خوشبو اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس نے پھر سے چلنا شروع کیا۔ ... نے پہچانے راستے... کا گھر بہت ہی قریب ہے ... اس ... گھر میں ... اور میں روز کے جانے پہچانے چہرے دیکھوں اور ان کے جسموں سے اٹھتی ہوئی خوشبو سونگھنے میں محو ہو جاؤں گا۔ آدمی مجھے دیکھتے رہ جائیں گے اور میں انہیں ــــ وہ بڑی تیزی سے کانچ کے گھر کی طرف جا رہا تھا اسی وقت کسی کے قدموں کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی اس لئے اس نے اپنا سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھنا شروع کیا۔ بڑی اپنائیت سے وہ آنے والے اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اسے دیکھتے ہی چلا اٹھا "ارے سانپ! سانپ۔ مارو، مارو۔ شاید یہ تجربہ گاہ سے بھاگ نکلا ہے ـــــ دیکھو وہ اپنے پھن نکالے کاٹنے کے لئے تیار ہے۔"

"میں صبح ہی کہہ رہا تھا اسے اس طرح آزاد نہ کرو۔ یہ ذات نیچ ہوتی ہے بدلہ ضرور لیتی ہے!"

چاروں طرف سے لاٹھیاں برسائی جا رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے اپنی گردن اٹھائی ایک زوردار لاٹھی اس کی گردن پر آ پڑی۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے باوجود بھی آشنا بھری دو آنکھیں تیزی سے دیکھ رہی تھیں، اپنی پہچان بتا رہی تھیں۔ چاروں طرف آدمی ہی آدمی تھے سارے شناسا چہرے اجنبی بن گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی قوت کا ڈھیر... آشنا کے یہ دو دیپک بجھنے سے پہلے ... انھوں نے دیکھا کہ اسی سفید پوشاک والے آدمی نے اپنی لاٹھی ... اس کے سر پر پڑنے سے پہلے ہی اس کی گردن ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی آنکھیں ... دو آشنا سے بھرے ہوئے دیپک بجھ گئے۔

سب کچھ سرد ہو گیا... سب کچھ ختم ہو گیا اس کے باوجود بھی دُم ابھی ہل رہی تھی۔ اس میں تھوڑی سی جان باقی تھی، اس لئے ایک آدمی نے پتھر اٹھایا اور اس دُم کو کوٹنے لگا تاکہ رہی سہی قوت بھی ختم ہو جائے...! ●●

صفحہ ۹۳ کا بقیہ

کہ مجھے انتظار ہے کب سے!"

نہ تو غذا اور نہیں ... گا تاکہ کوئی مصرعہ بھولنے نہ پائے ... اپنی ... کوئی ہوش نہیں رہا۔ اس نے پھر ایک ... دہرایا ... "موت آ جا ابھی۔ اسی وقت ... کہ مجھے انتظار ہے کب سے!"

یہ سنتے ہی اس کی ماں اور بیوی دونوں ایک ساتھ پھوٹ پڑیں۔ بیوی نے اس کے پیر چھوئے اور کہا "ہم آج کے بعد کبھی جھگڑا نہیں کریں گے۔ معاف کر دو ہمیں۔ لیکن اپنی موت کو نہ بلاؤ۔" ماں نے بھی دہرانا شروع کیا۔ "آج کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گی تمہیں دیکھو میری طرف بیٹے! دیکھو اپنی ماں کی طرف آج کے بعد کوئی گالی زبان پر آ جائے تو زبان ہی کاٹ کر رکھ دوں گی۔ دیکھ بیٹے ــ اپنی ماں کی طرف دیکھ...!

اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور جب اس سے ان دونوں کا دکھ دیکھا نہ گیا تو وہ بھی دل کی گہرائیوں کے ساتھ رونے لگا ـــــ...! ●●

آشا بھاجیکر

سنگیتا

"جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس چھوٹے سے پرندے نے اپنے پر تول لئے۔ راج محل کے گنبد کے باہر ہونے ہولے گا! شروع کر دیا۔ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کئی راتوں کے جاگے ہوئے اُس اُداس اور پریشان راجہ کی آنکھوں پر نیند کے سائے اتر آئے اور وہ نیند کی آغوش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔"

سنگیتا کی چپائی پر اُلجھے ہوئے بالوں سے کھیلتے ہوئے میں اُسے کہانی سنا رہی تھی۔ دوپہر اور رات سونے سے قبل اسے کہانی سنانا ضروری ہے جب تک کہانی نہ سنائی جائے وہ سونے کا نام نہیں لیتی ہے اس لئے دوپہر میں ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر نئی کہانی کی ابتدا کرنی پڑتی ہے۔ پہلی کہانی تو پوری ہو جاتی مگر دوسری کہانی جب تک اپنے اختتام کو پہنچتی سنگیتا سو چکی ہوتی۔ لیکن آج پہلی کہانی بھی ابھی پوری نہیں ہو پائی تھی کہ نیند کی پری نے اسے آ دبوچا۔ میں نے اُسے اس کی چھوٹی سی چارپائی پر لٹا کر مچھر جالی گرا دی۔ گھر گاؤں کے باہر ہونے کی وجہ سے دن میں مکھیاں اور راتوں میں مچھر اپنا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ اس لئے مچھر جالی کا دن میں بھی استعمال نہایت ضروری ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھیں موندے پڑی رہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا رخ دیوان خانے کی طرف کر دیا۔ دیوان خانے کے دروازے میں پھنسا ہوا ایک نیلا لفافہ اندر کی جانب جھانک رہا تھا۔ پتہ نہیں ڈاکیے نے آج کال بیل کیوں نہیں بجائی؟ مگر اسی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ آج گینگ کے کام کرنے کی وجہ سے بجلی بند کر دی گئی تھی۔ سچ کہا جائے ستیش کا خط آج آ جانا چاہئے تھا۔ مگر تحریر اجنبی سی تھی اس لئے میں نے لفافہ چاروں طرف سے دیکھا اور جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ خط شناساؤں میں سے کسی کا نہیں ہے تو میں نے لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اور اس ٹکڑے پر صرف پانچ سطریں لیکن صرف یہ چار پانچ جملے پڑھتے وقت مجھے محسوس ہوا جیسے دھیرے دھیرے کوئی میری روح قبض کر رہا ہو۔

"نہیں! نہیں۔ سنگیتا صرف میری ہے اور اس پر کسی کا کوئی ادھیکار نہیں"، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اور اس طرف دوڑ پڑی جہاں سنگیتا سکھ کی نیند سو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں لیا اور اتنی زور سے اُسے اپنے سینے سے بھینچا کہ سوئی ہوئی سنگیتا جاگ اٹھی۔ میں نے دھیرے دھیرے پھر سے اُسے نیند کی آغوش میں ڈھکیل دیا۔ وہ سو گئی مگر میں نہ سو سکی۔ میں جاگ گئی تھی، میرے خیالات جاگ گئے تھے۔ اس کہانی کو شروع ہوئے آج ۴ سال ہو رہے ہیں۔ میں بڑی خاموشی سے اس امریکہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ ڈاکٹر ہو نہ ہو انہونی سی بات ضرور کریں گے گو کہ ایک ایک کر کے ساری امیدیں ختم ہو چکی تھیں اس کے باوجود بھی من کے اندھیارے میں امید کا چھپا ہوا جوت نئی آس دلا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے یکایک اپنا لہجہ بدلا اور مجھ سے پوچھا "کیا بچپن میں تم کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھیں؟"

"مجھے سب کچھ یاد نہیں پر اتنا ضرور یاد ہے کہ اپنی گاڑی سے بمبئی جاتے ہوئے ہماری کار ہوٹل کے قریب ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ میں سب کچھ بھول گئی ہوں صرف مجھے میری اپنی چیخ یاد ہے۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ میں بہت دنوں تک اسپتال میں رکھی گئی تھی۔"

ڈاکٹر نے بڑی گمبھیرتا سے کہا "اس وقت آپ کی آنتوں کو سخت چوٹ پہنچی ہے۔ اس لئے اب بچے کا جنم لینا ناممکنات میں سے ہے۔"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور پرنام کیا۔ انھوں نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں زندگی میں یہ سکھ سبھوں کو میسر نہیں ہوتا۔ اناتھ آشرم میں کئی بچے ایسے ہیں جنھیں ماں کی ممتا چاہیئے گر آپ ایسے ہی کسی بچے کو اپنا سمجھ کر پروان چڑھائیں تو؟"

ستیش نے بھی مجھ سے یہی سوال کئی بار پوچھا تھا مگر میں یہ سوچ کر چپ ہوگئی تھی کہ جس کے والدین کا پتہ نہیں ہوتا اسے کیسے گود میں کھلایا جائے؟ اور جس کے ماں باپ زندہ ہیں وہ اپنا بچہ دوسروں کے سپرد کیسے کریں گے؟ اور اگر کوئی بچہ کسی مجبوری کی بنا پر سپرد کرنے کے لئے تیار ہو تو...! ڈاکٹر نے جواب طلب کیا تو میں کہوں گی — یقیناً وہ اپنے بچے کی ماں نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بھی ماں آپ کو نہ مل سکے گی جو اپنے بچے کو نہ چاہتی ہو صرف مجبوریاں ہوتی ہیں اور مجبوریوں کے سامنے ہر کوئی اپنا سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے"

"تو آپ کی نظر میں کوئی ایسا بچہ ہے؟" میں نے جرأت کرلی۔

"آپ کی ہی عمر ہوگی اس لڑکی کی۔ مگر اس کا منگیتر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہوگیا۔ شادی سے قبل ہی وہ ماں بننے والی ہے۔ اب اس ہونے والے بچے کا باپ اس دنیا میں نہیں اس لئے اس راز کو پردے میں رکھنا ہی اخلاقی فرض ہے ورنہ وہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔ اس کا منگیتر زندہ رہتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ ایک بات اور جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ تم دونوں میں مجھے کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں ہی کے چہرے پُرکشش، ایک ہی قسم کا خط و خال!"

"مجھے قبول ہے پر ایسا نہ ہو کہ میں اسے پروان چڑھاؤں اور کل کو پھر سے ماں کی ممتا جاگ اٹھے اور وہ اپنا بچہ واپس لیجانے کے لئے یہاں دوڑتی ہوئی چلی آئے"

"میں یقین دلاتا ہوں ایسا نہیں ہوگا — قطعی نہیں!"

میں نے گھر آکر یہی ستیش سے کہا اور ستیش نے حامی بھر دی ہم دونوں نے بچے کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

جوں جوں دن قریب آتے جاتے میری بے چینی اور بڑھتی جاتی۔ سردی کے دن تھے اس لئے میں نے آنے والے اس چھوٹے سے بچے کے لئے گرم کپڑے تیار کر لئے۔ کیا کمی تھی گھر میں۔ ستیش بڑی فرم کے منیجر تھے۔ پانچ دس نوکر اور دروازے پر گاڑی۔ کمی تھی تو صرف گھر میں دوڑتے اور اچھلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی۔ ستیش کے جاتے وقت ٹاٹا کہنے والے ننھے ننھے ہاتھوں کی اب وہ کمی بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے کوئی فکر نہیں تھی لڑکا ہو یا لڑکی! مگر نہ جانے کیوں: مجھے لڑکی زیادہ پسند ہے۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا اگر لڑکی ہو جائے تو میں اس کا نام سنگیتا رکھوں گی۔

ٹھیک دو مہینوں کے بعد ڈاکٹر کا بلاوا آگیا۔ میرا دل دہل رہا تھا ہاتھ اور پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے ڈاکٹر کے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "کیا ہوا ڈاکٹر؟ لڑکی!!" "مگر تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ کہیں اس کی ماں نے اپنا ارادہ تو نہیں بدلا؟"

"نہیں — اس کی ماں ابھی تک بے ہوش ہے اس کے دل پر گہرا اثر پڑا ہے بچی بھی ابھی کمزور ہے۔ اس کا وزن بہت ہی کم ہے اس کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے"

کچھ نہیں تو کم از کم پچھلے دو مہینوں سے میں اسے اپنی کوکھ میں جنم دے رہی ہوں اسے ہر قسم کا پیار دے رہی ہوں میں نے اپنے دل میں کہا... پھر یکایک کہہ اٹھی۔ کیسی بھی ہو ڈاکٹر — لڑکی میری ہے!"

"تم میرے لئے ایک نرس کا بندوبست کرلو جب تک بچی جسمانی طور پر نہیں سنبھلتی میں نرس کی مدد لیا کروں گی۔ اس کے بعد اس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی!"

میں نے دس دن اسپتال میں گزارے اور کبھی اس بچی کی ماں سے ملنے کی خواہش تک ظاہر نہیں کی چونکہ یہی ڈاکٹر کی ہدایت بھی تھی۔ مجھے جو چاہیئے تھا مل چکا تھا۔ وہ پھر سے اس خوشی کو حاصل کرسکتی تھی مگر یہ بات میرے یہاں ناممکنات میں سے تھی۔

ڈاکٹر نے کہا: میں نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تمہاری بچی ہوتے ہی چل بسی چونکہ وہ بے حد کمزور تھی اس لئے تمہیں کسی قسم کی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں —

میں بچی کو کر اسپتال سے اپنے گھر لے آئی اور اس کا نام سنگیتا رکھا۔

پہلے چھ ماہ سنگیتا کی دیکھ بھال میں مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ ہر بار نظریں آسمان کی طرف اُٹھ جاتیں اور دبے دبے سروں میں پوچھا کرتیں "کہیں میرے بھاگ میں کوئی دھوکا تو نہیں لکھا ہے۔؟"

مگر نہیں چھ مہینوں کے بعد یہ ڈر جاتا رہا۔ سنگیتا سنبھلتی چلی گئی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ پھر وہ تتلاتی ہوئی ما۔ ما۔ مم ما کہنے لگ گئی۔ میرے انگ انگ میں اس کی وہ باتیں رچ بس گئیں۔ کیسے کیسے دن تھے وہ بھی میں نے ہر سالگرہ پر کئی نئے جوڑے سلوائے کیا کیا سوچ رکھا تھا اس کے لئے، اور آج اچانک اس خدا نے میرے گھر پر بجلی گرا دی۔ سنگیتا کی ماں اسے لیجانے کے لئے یہاں آ رہی ہے۔

اتنے میں گھڑی نے چار بجائے، ای کوج پتہ بیٹھے بیٹھے اپنے من کے وچاروں میں ڈوبے ہوئے کتنا وقت گذر چکا تھا۔ اب سنگیتا کی ماں آتی ہی ہوگی۔ مگر اب مجھ میں اتنی شکتی کہاں ہے؟"

اسی وقت کال بیل بجی۔ میں نے اپنی کھوئی ہوئی قوت کو یکجا کر دیا اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ دروازہ پر ارونا کھڑی تھی سنگیتا کی ماں! وہی گورا رنگ اور اداس چہرہ مگر آج نہ جانے کیوں مجھے اس کی اُداس آنکھیں نظر نہیں آئیں صرف اُس کا کٹھور من میرے سامنے تھا۔

میں نے راستہ دیا اور اندر آ گئی۔ اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

دونوں ہی خاموش تھے صرف سُتے ہوئے چہروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ آخر اس نے سکوت توڑا۔ "میرا خط ملا ہی ہوگا؟"

میں انکار میں جواب دینا چاہتی تھی اس کے باوجود بھی پتہ نہیں کیسے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اس نے پھر کہا۔ "یعنی تم سے بخوبی واقف ہو گئی ہوگا۔ مجھے دھکے دے کر باہر نکالا جائے۔" اس کے بعد پھر ایک بار اس نے میرا چہرہ دیکھا اور کہا "میں ان کی اس یاد کو کسی قیمت پر دینا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھ سے کہا گیا کہ بچے نے اپنی مدت سے پہلے ہی جنم لیا اس لئے اس دنیا سے چل بسا۔ مجھے اس کے آخری دیدار سے بھی محروم رکھا گیا تا کہ میرے دل پر گھاؤ نہ پڑے۔ میں مر نہیں سکتی تھی اس لئے زندہ رہی۔ ورنہ بچا ہی کیا تھا میرا۔ لیکن وقت ہی سب چیزوں کا علاج ہے۔ میں نے زندگی کے اس باب کو ختم کر کے اس پرانی یاد کو بھلانے کے لئے کالج جانا شروع کر دیا۔ پچھلے ماہ ہی کی بات ہے۔ مرنے سے پہلے اس راز سے مجھے میری ماں نے آگاہ کر دیا کہ میری بچی زندہ ہے اور تمہارے پاس ہے۔ نہ کوئی غم تھا اور نہ ہی کوئی خوشی۔"

یکایک وہ رُک گئی اور پوچھ بیٹھی "کیسی لگتی ہے وہ؟ میری طرح یا اُن کی طرح؟" "میں جانتی ہوں تم نے اپنا خون دے کر اس کو پروان چڑھایا ہے۔ ڈاکٹر نے تمہارا پتہ بھی دینے سے انکار کر دیا تھا پھر میں ان سے وعدہ کر آئی ہوں کہ صرف اسے ایک نظر دیکھ کر واپس آ جاؤں گی۔ مگر یہ بات سچ نہیں ہے۔ البتہ یہ سچ ضرور ہے کہ میں اسے لیجانے کے لئے ہی آئی ہوں۔"

اسی وقت سنگیتا دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ارونا نے اپنی بانہیں پھیلائیں مگر سنگیتا اس اجنبی عورت کو دیکھ کر اور بھی میرے قریب آ گئی۔

سنگیتا نے اپنی ماں کو نہیں پہچانا! اس لئے ارونا دکھی ہو گئی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

رات بھر سنگیتا میرے سینے سے لگی سوتی رہی اور میں جاگ کر سوچتی رہی۔ میں کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ مگر کبھی کبھار خیالات کی ایک رو کہتی کہ سنگیتا اس کی ہے اس لئے اس کے پاس چلی جانی چاہیے۔ مگر پھر جیسے دھیرے دھیرے کوئی زنجیر میں جکڑ لیتا۔ وہ چلی گئی پر تمہارے پاس کیا رہے گا۔؟ کیسے کیسے دکھ جھیلے ہیں تم نے بھی اس کے لئے؟ کیا تم نے کبھی اپنی اولاد سے اُسے کم سمجھا؟ رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ارونا نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا اس لئے اس نے کہا "میں جانتی ہوں تمہیں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ مگر کوئی علاج نہیں میں مجبور ہوں۔ ہم سبھی مجبور ہیں اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تم سنگیتا کو لیجا سکتی ہو۔" میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے [illegible]

اس شام اروناسنگیتا کو اپنے ساتھ لیجانے والی تھی مگر نجانے کیوں سنگیتا بخار میں مبتلا ہو گئی۔ معمول کے مطابق۔ میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی دوائیں پلاتی رہی، نمک کی پٹیاں اتارتی رہی۔ ارونا دلی سے چھٹی لیکر آئی تھی۔ اس لئے وہ زیادہ دن ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

آخرکار ارونا کے جانے کا دن آ ہی گیا۔ میں سنگیتا کے کپڑے بیگ میں بھرتی رہی اور ارونا کو ہدایت دیتی رہی "اسے دوہ وقت سونے سے قبل کہانی سننے کی عادت ہے، ساگ اسے بالکل پسند نہیں، نمکین چیزوں کی وہ زیادہ عادی نہیں۔ پھر ابدلتے ہی اُسے سوئٹر پہنایا جائے۔ میں نے اس کی دوا کی شیشیاں بھی رکھ دی ہیں۔ ان پر ہدایات درج ہیں جس کے مطابق دوائی جاری رکھی جائے۔ میں جانتی تھی سنگیتا میرے بنا جانے کے لئے تیار ہی نہ ہوگی اس لئے میں نے ارونا سے کہا تم رات کی گاڑی سے چلی جانا سنگیتا اس وقت تک سو جائے گی پھر اُسے اپنے ساتھ لیجانے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

بس صرف اروناسے اتنا کہہ سکی ۔۔ "سنگیتا کا خیال رکھنا"
مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُسے گاڑی تک چھوڑ آتی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور رو رو کر جی ہلکا کرتی رہی ایک بے بس، مجبور اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے؟

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا اور پورے گھر پر اداسی چھائی ہوئی تھی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور سنگیتا کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی سنسان خالی پڑا تھا سارے کھلونے میں نے باندھ کر ارونا کو دے دیئے تھے اس لئے در و دیوار سے اور بھی اداسی ٹپک رہی تھی میں نے سنگیتا کے پلنگ کے ایک پائے کو پکڑ لیا اور زار و قطار روتی رہی۔ مجھے پتا نہیں کب تک اسی حالت میں بیٹھی جب رو رو کر جی نہ بہلا تو میں نے بچھونا کو پرے ہٹا کر اس خالی کھاٹ کو دیکھنا چاہا جس پر وہ سپرا اور روا سنگیتا سکون کی نیند سویا کرتی تھی۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی سنگیتا اپنی جگہ پر تھی اور سکھ کی نیند سو رہی تھی یکایک میں نے اپنا رُخ ارونا کے کمرے کی طرف کر دیا۔ شاید اس نے آج جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو مگر ارونا اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ سنگیتا کا بیگ جو کپڑوں اور کھلونوں سے بھرا ہوا تھا، اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں دوڑتی ہوئی سنگیتا کے کمرے کی جانب مڑ ہی۔ تکیے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پرزہ ملا جس پر لکھا ہوا تھا۔

پیاری بہن!
تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ یہ بات یقیناً سچ ہے کہ میں نے اُسے جنم دیا مگر پھر بھی تم نے اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح اس کی حفاظت کی ہے میں نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا ہے کہ تم سنگیتا کے بنا کبھی زندہ نہیں رہ سکتیں اسے اپنی سمجھ کر ہی اس کی پرورش کرنا — میں کبھی کبھار اسے دیکھنے کے لئے آجایا کروں گی۔

تمہاری ارونا

میں نے سنگیتا کو اپنی بانہوں میں سمیٹا اور اپنے کمرے کی جانب چل پڑی جیسے زندگی کی نئی کہانی آج پھر شروع ہو رہی ہو۔

مراٹھی کہانی

وامن چورگھڑے

پہیلی

نرمدا ہمیشہ ہی اسی طرح کچھ نہ کچھ کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ کہتے وقت ہنسا کرتی ہے اور کہنے کے بعد بھی اس کی ہنسی میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آتا لیکن سننے والا اکثر چکرا جاتا ہے اور کبھی کبھار تعجب خیز نظروں سے اسے تکنے لگتا ہے۔ دل کے گھاؤ بیان کرتے وقت اکثر لوگ آنسو بہائے بغیر اپنی بات کو واضح نہیں کر پاتے۔ لیکن خاموشی سے بیان کرنے کے بعد بھی ہنستے رہنے والی صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے نرمدا۔

اس کے والدین نے اس کا نام نرمدا ہی کیوں رکھا تھا؟ کوئی نہیں جانتا۔ البتہ یہ بات بھی اتنی ہی سچ ہے کہ یہ نام بھی معنی دیکھ کر نہیں رکھا گیا ہوگا۔ دکھوں میں بھی وہ اکثر ہنسا ہی کرتی ہے کانٹا چبھ جائے تب بھی وہ ہنستی ہی رہے گی۔ اور اگر کسی اور کے کانٹا لگ جائے تب بھی وہ ہنسنے پر مجبور کر دے گی۔

نرمدا کی خوبصورتی بیان کرنا میرے بس کا روگ نہیں، سچ کہا جائے تو اس کا کردار ہی ایسا ہے جو اس کی خوبصورتی کے کبھی آڑے نہیں آیا۔ وہ کبھی اِٹھلا کر چلی ہی نہیں۔ غرور سے اس نے اپنا سر کبھی اونچا نہیں کیا بس وہ سرتاپا کھلکھلاتی ہی نظر آتی تھی ہنستے اور مسکراتے ہوئے وقت کی طرح!

نرمدا بہت ہی سادگی سے ایک آدھ جملہ کہہ کر الگ ہو جاتی ہے۔ نو سال ہی کی عمر میں اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا "اگر تم مجھ سے بیاہ کر لوگے تو زندگی بھر مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی میں ہمیشہ ہی سکھی رہوں گی۔" البتہ میں نے اس سے بیاہ نہیں کیا۔ اس عمر میں میں نے اتنا ضرور جان لیا تھا کہ میں اس سے نباہ نہ کر سکوں گا۔ یعنی دوسرے معنوں میں وہ مجھ سے ہزار گنا اچھی ہے اور اس لئے میرا جوڑ ممکن نہیں۔ میں کسی بھی صورت سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔ اس کی قوت برداشت قونا قابلِ یقین ہے۔ میں نے اس وقت اس سے کہا تھا "دیکھو نرمدا......"

یہ جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ کہہ اُٹھی۔ "بس ہوا جو ہونا تھا سو ہو گیا اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی پھول اپنے من کو بھا جائے اور اگر وہ نہ ملے تو اس کی بُرائی کرنا کہاں کا انصاف ہے۔؟"

نرمدا تعلیم یافتہ ہے لیکن اکثر وہ اپنی ذہانت زیادہ تر ایسے ہی سوالوں کے جوابات دینے میں صرف کرتی ہے نو سال کی عمر ہی میں وہ اٹھارہ سال کی لگتی تھی اور اس کے چار سال بعد وہ بائیس سال کی ہو گی۔ اس دوران اس کا بیاہ بھی ہو گیا۔ لڑکے کو پسند بھی میں نے ہی کیا تھا۔ صرف میرے ایک جملے پر کہ لڑکا ہونہار ہے اور تمہارے قابل ہے، نرمدا بیاہ کے لئے رضامند ہو گئی۔ بیاہ کے دو سالوں بعد وہ ماں بن گئی اور ایسے ہی ایک روز جب وہ اپنے بچوں کو سُلا رہی تھی میں نے اُس سے کہا ـــ

"نرمدا اگر تم مجھ سے بیاہی جاتیں تو یقیناً اتنی خوش نہ رہتیں جتنی آج خوش دکھائی دے رہی ہو، جتنی تم آج سُکھی ہو یقیناً میرے ساتھ جیون بِتا کر اتنی خوش نہ رہتیں۔ تمہاری خوشیوں کا میں ہی گواہ ہوں۔ واقعی شادی کے لئے لڑکے کی پسند خود لڑکی کی مرضی سے نہیں ہونی چاہیئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا ـــ؟"

شادی شدہ عورت کو ایسی باتیں سنتے ہی گمبھیر ہو جانا چاہیئے لیکن اس نے اپنے بچے کو ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا ـــ "ہو سکتا ہے تمہاری باتوں میں سچائی ہو۔ لیکن اس وقت تم سے میرا بیاہ قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ کیونکہ تم واقعی اونچے تھے۔ اور آج میں سچوانی اور رادھا کے پتا جی کو چاہتی ہوں، اس کی کوئی سیما نہیں ـــ"

"تمہارے پیار کی دھارا ہی عجیب ہے ـــ" میں نے کہا

کسی کے پیار کا مذاق اُڑانا نہیں چاہئے۔ یہ کسی سے بھی کسی بھی وقت ہو سکتا ہے یہ پرندے پیار کے موتی اپنی چونچ میں لئے پھرتے ہیں اور جب کسی کی نظر ان پر پڑ جاتی ہے، اس کے دل میں پیار پیدا ہو جاتا ہے اڑنے والے پرندوں پر صرف میری ہی نظر پڑ گئی تھی، تمہاری نہیں!"

بس وہ اپنی تمام تر صلاحیت ایسے ـــ ہی جملے کہنے میں صرف کرتی تھی جب پہلے بچے کی آمد پر وہ بے حد خوش ہوئی دوسری جب لڑکی ہوئی تو اس نے کہا مجھے اس کی ضرورت ہی تھی" اور جب تیسرے نے جنم لیا تب بھی وہ اتنی ہی خوش تھی جتنی پہلے بچے کی آمد پر تھی۔ جب شوہر نے برتھ کنٹرول کے لئے آپریشن کی صلاح دی تب بھی اس نے کوئی شکایت نہیں کی وہ خود کی اپنی تمام مصروفیتوں سے ناواقف تھی۔

پرسوں ہی کا ذکر ہے، پورا کنبہ سویا پڑا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور سارا آنگن صاف کر ڈالا بار بار یہی گنگنا رہی تھی "گھر گھر آئی بدریا" اس کے گدے گدے پاؤں پکے ہوئے کیلوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ کر پھر گھر میں داخل ہو گئی اور اپنے دونوں بچوں کو باہر لے آئی پھر اس نے ان دونوں کو ہوائی جہاز دکھایا۔ حالانکہ کسی کا بھی اس ہوائی جہاز سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ البتہ وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ ایک اُڑتا ہوا پرندہ ہے اور اس کے پروں سے نکلنے والی آواز کو ان لوگوں تک ضرور پہنچنا چاہئے جن تک پہنچنی ضروری ہے۔ دونوں ہی اس جہاز کی طرف دیکھ کر خوش ہو اُٹھے اور تالیاں بجانے لگے۔ ان کے ساتھ ان کی ماں بھی تالیاں بجا رہی تھی اور وہ ان دونوں سے بڑی تھی، اس لئے وہ اور بھی زور زور سے ناچ رہی تھی۔ جب جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے پچھتاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ "ارے میں چھوٹے کو دکھانا ہی بھول گئی" لیکن وہ اُٹھنے والا تو تھا ہی نہیں، پھر وہ دوڑتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہو گئی اسٹو جلایا اور چائے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ چائے کا پانی اس کے ہاتھوں پر گرا، تو وہ کہہ اُٹھی "کیا کیا تھا اس بے چارے پانی نے؟" بس اسکی ایسی ہی کچھ عجیب سی باتیں تھیں عقلمندوں کو حیرت میں ڈالنے والی اور بے وقوفوں کو......؟"

اس روز گھر پر پانچ دیوانے تھے اور میں ایک ہی عقلمند رکھا تھا

میں سے گلاب اپنا سر اوپر اُٹھا لیتا ہے۔ ہوا کے لئے! لیکن اس گھر کے سبھی دیوانے، سبھی بے وقوف، کانٹے بھی اور پھول بھی! میں اس کے اس قدر قریب جاتے ہوئے بھی اسے بالکل نہ سمجھ سکا۔ میں نرملا سے بھی زیادہ ہوشیار اور عقلمند! وہ مجھ سے بیاہ کے لئے تیار تھی اس لئے اس کا انکار میں اسے اپنا نہ سکا تب بھی انجان! اس لئے اس روز جب کہ اس کے شوہر کام پر گئے ہوئے تھے اور گھر میں صرف نرملا اور اس کے بچے موجود تھے جبکہ وہ سوئی سے دھاگہ اور دھاگے سے سوئی نکالنے میں مصروف تھی ـــ اسی عقلمند نے اس سے پوچھا "کیوں نرملا واقعی تم سکھی ہو ـــ؟"

میں یہ سوچ رہا تھا غالباً اس کا جواب آنسوؤں سے ہی ملے گا ـــ لیکن اس نے فوراً جواب دیا۔

"مجھے دکھی ہونے کے لئے کیا ہوا؟ میں تو دکھ کس چیز کا نام ہے جانتی ہی نہیں!"

یہی ایک موقع ہوتا ہے جب برتن توڑنے کی بجائے بچھڑے کی گردن اُڑانے کی صلاح دی جاتی ہے۔

"واقعی تمہارا گھر تو ہنستا ہوا گلستاں ہے اور تمہارے بچے ....؟"

"بچے! کم بخت دن رات میرا دم نکالتے رہتے ہیں۔ صرف میرے سوا ہر کوئی ان کی تعریف کر سکتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔ "لیکن اب تو تمہیں کچھ دنوں کے لئے آرام کرنا چاہئے۔ ایک کے بعد ایک ..... ! اری اس چھوٹے کے بعد اب کم از کم پانچ سالوں کے لئے تمہیں مکمل آرام ....؟"

"واہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم کسی سنجیدہ مسئلہ پر بحث کرو گے ـــ اور یہ کہو گے کہ یہ سارا پرپنچ سنبھالتے ہوئے تمہاری صحت پر بہت اثر ہوا ہے۔"

"جو کہنا چاہئے وہی تو کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟ اگر میں خود ہی تمہیں یہ کہہ سکوں کہ اس ننھے کے بعد مجھے اب کوئی بھی نہیں آئے گا۔ اس طرح میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟ اگر انہیں اس بات کا بھی احساس نہ رہتا تو تم انہیں میرے لئے منتخب ہی کیوں کرتے؟ اب تو بالکل آرام ہے۔"

"چلو ٹھیک ہی ہوا۔"

"ٹھیک تو ہوا ہی! البتہ ایک اور سچائی گوش گزار کر دوں کہ تو رہی

ہوں، بلکہ پتہ نہیں تم سمجھ بھی سکو گے! نہیں؟ کہتے ہیں نا کھڑکیاں کھلی رکھی جائیں تو رنگ اور چاندنی کر دیکھتے ہیں اور اگر بند رکھی جائیں تو جی گھبراتا ہے۔

دھان کے لئے برس جائے تو وہ بارش، ورنہ گندے بادلوں کا پانی! اسے تو آرام ہی ہے کسی چیز کا کوئی ڈر نہیں۔ اب اگر کھڑکیاں کھلی بھی رکھی جائیں تو یقیناً کوئی بھی نہیں جھانکے گا۔ البتہ اب کسی قسم کا کوئی لطف نہیں، نہیں چاہئے تو اور بھی من اسی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ کوئی وقت ہو ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور پھر نظریں زمین میں گاڑ دینا وہ اشارے، وہ پیاس، تسکین سے پہلے ایک قسم کا ڈر اور تسکین کے بعد بھی ایک قسم کا خوف! پھر وہ پیاس اور خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی قربانی دے دینا۔ کمرے میں بند کئے ہوئے طلباء استاد کی آواز سنتے ہی ڈر جاتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں، اشارے کرتے ہیں۔ تم میرے ساتھی! اور میں تمہارا ساتھی! یہ جو سب سے چھوٹا ہے نا اس کے آنے سے پہلے اور اس کے آنے کے بعد ..... ! انہیں یہ فکر کہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور مجھے یہ فکر کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ دونوں ہی کے درمیان تلوار کا تیز پھل! انگلی سے خون نکل پڑے تو چوس لیا جاتا۔ سب کچھ ایک دوسرے میں ابھرا، بالکل گھٹا ہوا۔ دن میں کم از کم ایک بار یہ آواز ضرور ناشتی کرتی میں صرف تمہارا ہوں اور تم صرف میری ہو۔ یا صرف میں تمہاری ہوں.....؟

لیکن اب وہ تلوار کا تیز پھل یا اس کی تیز دھار ہم دونوں کے درمیان نہیں۔ اس لئے اب انگلی کے کٹ جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ کوئی ڈر نہیں، اب ان ہونٹوں کے لئے بھی کوئی کام نہیں بچا..... اب بھی کچھ ویسے ہی رد کا ہی ..... ! روٹی وہی ترکاری، وہی بھاجی، کبھی اچھی نہیں، کبھی اس میں مسالہ کم! ہینگ یا زیادہ ڈال دیا جائے تو وہ ہضم نہیں ہوتا قے کی نوبت آجاتی ہے۔ صبح سے اب کوئی خوف کھاتا ہے اور دہی رات ڈرا سکتی ہے۔ اور یہ لاج یہ شرم شکر کا سانس بھی نہیں لینے دیتی .....!

نرملا کہتی جا رہی تھی اور سننے والا عقل مند کب کا بھاگ چکا تھا جو کہ یہی ایک راستہ اس کے لئے کھلا ہوا تھا، باقی سبھی راستے اس کے لئے بند ہو چکے تھے ....!!

وسوندھرا پٹوردھن

لینے والی

میں کھانے کے لئے بیٹھ گئی تھالی کے چاروں طرف پانی چھڑکا۔ اور پہلا نوالہ اٹھایا ہی تھا کہ کوئی اندر داخل ہو گیا میں آنے والے سے متعلق ہی سوچ رہی تھی کہ وہ بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔ خاموش اور اداس نظروں سے وہ مجھے تک رہا تھا۔ پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا بالکل اترا ہوا تھا میں نے نوالہ ہاتھ میں تھامے ہوئے کہا۔

"آؤ یہاں بیٹھو کیا ہو گیا؟ اداس کیوں نظر آرہے ہو؟"

لیکن وہ کھڑا ہی رہا شاید اس میں اب بیٹھنے کی طاقت باقی ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا

"مائی کا شوہر چل بسا"

تعجب خیز نظروں سے میں اسے گھورتی رہی۔ حالانکہ اس میں تعجب کرنے کی اب کوئی نئی بات نہیں تھی مائی کا شوہر تو کب کا مرچکا تھا ——— حالانکہ اسے اس سے قبل ہی مرنا چاہئے تھا۔ لیکن جس وقت مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ مرچکا ہے تو میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ مائی کے بھائی کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کے اور میرے دل میں رہ رہ کر ایک ہی خیال انگڑائی لے رہا تھا! آخر مائی ودھوا ہو گئی۔ پل بھر کو میں کچھ بھی نہ سوچ سکی وہ باہر کے دروازے کی طرف مڑ گیا اور اور پھر پوچھا "تم آرہی ہو نا؟"

"تم چلو، میں ابھی آتی ہوں"

میں نے ہاتھ دھوئے اور مائی کے گھر کی طرف چل پڑی۔ مائی کی عمر ابھی کچھ ستائیس سال تھی۔ اور اس کے شوہر کی عمر! وہ کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس نے مائی کی گود میں کھیلنے کے لئے ایک بچہ دے دیا تھا۔ مائی کو سہارا مل گیا تھا جب سے اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا، وہ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا مائی کا بچہ اب آٹھ سال کا ہو رہا تھا۔ آج اس کا باپ مر گیا۔

میں بار بار مائی سے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ کہ اب مائی اپنی زندگی کیسے گزارے گی؟ گھر میں سبھی کچھ تو تھا۔ کپڑا، لتا، برتن، ہاتھ کی چوڑیاں، البتہ روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینے والی بات تھی۔ جو کچھ سرمایہ جمع کیا تھا مائی کے شوہر کی دوا دارو میں اٹھ گیا اب آگے کیا ہوگا؟ اسی سوچ میں غلطاں میں مائی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے مجھے اندر جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ مائی زار و قطار رو رہی تھی اور ان کا آٹھ سال کا بچہ ان کی پیٹھ سے چپکا کھڑا تھا سامنے ہی مائی کا شوہر شانت پڑا ہوا تھا۔ اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ اور سرہانے اگربتی جلا دی گئی تھی۔ لوگ ستے ہوئے چہروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور خاموشی سے آنسو بہا رہے تھے۔ صرف مائی کے رونے کی آواز دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں، گلے میں مالا، روتے وقت ان کے بالوں کا گچھا زور زور سے ہل رہا تھا۔ ان کے بال لمبے تھے اور بے حد گھنے! میں سوچ رہی تھی کیا مائی سے آج نظریں ملا سکوں گی؟

یکایک میرے سوچ کی مالا ٹوٹ گئی۔ مائی کو لوگوں نے سہارا دے کر اٹھایا۔ لیکن وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ایک بوڑھے کی نوجوان بیوی۔ خوبصورت۔ نوجوان! اور اس کے باوجود اسے اپنے بوڑھے پتی سے بے حد پیار تھا۔ اسی حالت میں انھیں اوپر لے جایا گیا۔ اسی دوران کسی نے ان کی گردن میں لٹکتا ہوا منگل سوتر نکال کر مجھے دے دیا۔

پھر کسی نے آہستہ سے کہا کہ مائی کو اب ہوش آرہا ہے اور وہ ابھی بھی اس حالت میں ان سے ملنا بہتر رہے گا یا نہیں۔! مجھ سے مل کر ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا یا مجھے دیکھتے ہی ان کا غم بڑھ جائے گا؟ میں کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکی اس لئے بہت دیر تک اسی حالت میں اپنی جگہ کھڑی رہی

گھر کی عورتیں اوپر جا رہی تھیں، نیچے آ رہی تھیں یکایک چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا جیسے اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ میں نے ایک عورت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "مائی کہاں ہے؟" اس سوال پر وہ بڑی عورت ہاتھ کے اشارے سے اتنا ہی کہہ سکی کہ مائی اوپر ہیں! سچ کہا جائے تو اوپر کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کمرے میں بہت سارا سامان پڑا ہوا تھا جو اکثر تہواروں پر نکال کر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس وقت مائی کی چیخ سنائی پڑی میں زینہ طے کرتی ہوئی اوپر جا پہنچی اسی دوران کسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ مائی کی بھاوج تھیں۔ اور مجھے دیکھ کر زور زور سے رو رہی تھیں۔

میں نے ان کی طرف دھیان نہ دیا اور مائی کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ کچھ عورتیں باہر کھڑی تھیں کچھ دروازے ہی میں کھڑی تھیں مائی اندر چیخ رہی تھی اور باہر عورتیں آپس میں کہہ رہی تھیں "اسے بھی یہ سب برداشت کر لینا چاہیئے، ویسے ہی جیسے ہم نے برداشت کیا تھا" میرا دماغ بھنا گیا۔ مائی کے بال کاٹے جا رہے تھے اور وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "اگر اب تک کچھ نہیں ہوا، تو رہنے دیجئے یہ کام پھر کسی بھی وقت ہو سکتا ہے" پر کسی نے بھی میری باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ مجھ سے مائی کی بلکتی ہوئی آواز برداشت نہیں ہو سکی اس لئے اسی وقت نیچے واپس آ گئی۔ تعجب کی بات تو یہی ہے کہ مجھے کوئی بھی سمجھ نہ سکا!

جوں ہی میں نیچے آ گئی مائی کی بھاوج نے میرے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ "مائی کو بچا لو۔ ایشور کے لئے اسے بچا لو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں" سچ کہا جائے تو میں کر ہی کیا سکتی تھی؟ لیکن اس کی اندھی سمجھ کا کیا جواب ہو سکتا تھا؟ اس وقت اوپر سے ایک شخص نیچے آ گیا۔ اس نے مائی کے بالوں کا وہ گچھا کسی اور کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ بال ہاتھوں میں لئے دوڑ پڑا۔ کیونکہ ان بالوں کو مائی کے شوہر کے سرہانے رکھنا ضروری تھا۔

میں سرتا پا کانپ گئی۔ اس بیسویں صدی میں بھی لوگ ایسی روایات کے قائل ہیں۔ آخر سنیاس لینے کے لئے اتنی زبردستی کیوں؟ میں گھر واپس آ گئی اور بار بار یہی سوچتی رہی کہ مائی شوہر کے مرنے کے بعد ودھوا تھیں یا اپنے بال کٹا لینے کے بعد؟

اس کے بعد میں مائی سے نہ مل سکی۔ سچ کہا جائے تو اس نئی حالت میں دیکھنے کی ہمت ہی پیدا نہ کر سکی۔ دوسروں سے ان کی خیریت پوچھا کرتی تھی۔ مائی کو اب کہیں نہ کہیں چھوٹی موٹی نوکری کرنی ہی پڑے گی کیونکہ ان کے سگے سمبندھیوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کا خیال رکھ سکتا تھا۔

ایک سال ہو گیا پھر دو مہینے بھی بیت گئے۔ مائی ابھی تک گھر ہی میں تھیں اب تک وہ سنبھل ہی نہ پائی تھیں۔ ایک ایک زیور بازار میں بک رہا تھا۔ اور دن گذر رہے تھے لگتا تھا وہ اب بہت جلد اس چھوٹے بچے کو اکیلا چھوڑ کر پرلوک سدھاریں گی۔

پھر ایک روز میں نے ان کے گھر کا رخ کیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رو پڑیں کہنے لگیں "اس دن کو میں آج تک نہیں بھول سکی۔ لگتا ہے وہ دن ابھی غروب ہی نہیں ہوا۔ وہ کبھی کبھار خواب میں آ جاتے ہیں۔ جی گھبراتا ہے اور اکثر ڈر محسوس ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں آتم ہتیا کر لوں ان کی موت کا غم مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ جانے والے چلے جاتے ہیں ہم کیوں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کیوں کھاتے ہیں؟ کیوں پیتے ہیں؟ آخر کیوں زندہ رہتے ہیں؟ کچھ تو سمجھ میں نہیں آتا؟" کہتے کہتے وہ یکایک رک گئیں اور شوہر کی تصویر کی طرف، کوٹ، جوتے اور لکڑی کی طرف دیکھنے لگیں؟ پھر وہ یکایک اٹھ گئیں اور اپنا سر پھوڑنے لگیں۔ سر سے خون بہہ نکلا۔ میں نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ "مائی کیا کر رہی ہو تم؟"

"چھوڑ دو مجھے اب میں بالکل زندہ رہنا نہیں چاہتی مرنا چاہتی ہوں" بولیں۔

شوہر کی موت کا صدمہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ مجھے اسی وقت محسوس ہوا مائی اب صرف چند دنوں اور زندہ رہیں گی اور ان کے بچے کو ماموں کے گھر ہی پروان چڑھنا ہوگا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مائی سنبھل گئیں وہ مائی جو کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی تھی اب ہم لوگوں کے گھر آنے لگیں۔ لڑکا بڑا ہونے لگا اسکول جانے لگا۔ سچ کہا جائے تو تعلیم سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جوں توں اس نے میٹرک پاس کر لیا اور نوکری کر لی۔ نوکری لگتے ہی نانو نے سگریٹ پینا شروع کر دیا اور ٹائمس پڑھنے لگا۔ ٹائمس میں وہ کیا پڑھتا تھا، مائی کو اس بات کا کوئی پتہ نہ چل سکا مائی بے حد خوش تھیں کہ نانو اب انگریزی بھی بخوبی پڑھ سکتا تھا، سمجھ سکتا تھا۔۔۔

مائی اب بھی کام پر جا رہی تھیں البتہ وہ کافی سلجھی نظر آتی تھیں۔ انھوں نے سنسار سنبھال لیا اور نانو کے لئے لڑکی کی تلاش جاری رکھی۔

ایک دن نانو کے لئے لڑکی مل گئی۔ اس کی شادی ہو گئی۔ بڑی خوبصورت تھی اور اپنے ساتھ چار زیور اور چار پیسے لے آئی تھی۔ مائی نے اپنے کام کے پیسوں کی بچت کر کے ایک عطردان ایک گلاب دان خرید لیا۔ ایک نئی چادر بُن لی۔ کھڑکیوں پر جالی دار پردے لگا دیے۔ گھر کے لئے برتن جمع کر لئے۔ مائی کچھ اتنی سنبھل گئی کہ انھیں اب وہ دن بھی یاد نہ رہا کہ ایک روز وہ اپنا سر پھوڑ کر آتم ہتیا کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

پھر یکے بعد دیگرے کئی تہوار ہو گئے۔ دیوالی بھی ہو گئی۔ نانو کی بیوی کے لئے ایک قیمتی بھری ساڑی خرید لی۔ چونکہ وہ جلد ہی اب ایک بچے کی ماں بننے والی تھی وہ دن بھی آ گیا۔ اور وہ ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔ مائی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ پھر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا۔ اس طرح چار بچے ہونے کے بعد نانو کی طبیعت قدرے خراب ہوتی گئی۔ ہلکا بخار رہنے لگا۔ کھانسی نے زور پکڑا۔ ڈاکٹر نے سگریٹ چھوڑنے کی صلاح دی۔ البتہ وہ سگریٹ چھوڑ نہ سکا۔ ٹائمز اور سگریٹ۔ نہ جانے کیا رکھا تھا ان دو تیلی چیزوں میں لیکن ایک روز یہ راز بھی کھل گیا۔ نجانے اس میں کیا لکھا ہوتا، آنکڑے یا گھوڑے۔ نانو ان پر پیسہ جیتتا اور ہارتا۔ ہارنا اور جیتنا لیکن ایک روز سب کچھ ہار جانے کی نوبت آ گئی۔ نانو نے دفتر سے بطور قرض روپیہ نکال لیا تھا۔ وہ قرض اب نانو سے ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے گھر کا عطردان چلا گیا پھر گلاب دان پھر یکے بعد دیگرے زیور بیچے جانے لگے۔ گھر پھر سے خالی ہو گیا اور سنسان نظر آنے لگا۔ نانو نے بستر پکڑ لیا اس لئے مائی نے پھر سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ایسے ہی پھر ایک روز میں کھانا کھا رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی آواز آئی میں نے پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں" مائی سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ چہرہ اتر گیا تھا آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ پھر بھی وہ جھوٹی ہنسی ہنس پڑیں۔ دکھ کا ساگر اب بالکل بھر گیا تھا۔ پھر بھی وہ ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

"آؤ مائی میرے ساتھ کھانا کھا لو"

انھوں نے انکار میں اپنی گردن ہلائی وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں ان کا دل ٹوٹ گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، انھیں اس طرح روتے ہوئے ایک بار دیکھ چکی تھی۔ ان کے شوہر کی موت کے وقت کیا ایک پھر انھیں آج کیا ہوا؟"

مائی نے اپنے سارے دکھ پی لئے مجھے تجربہ ہے ہر انسان کو اسی طرح اپنے دکھ اپنے آپ ہی پی لینا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں پی جانے کی یہ شکتی کہاں سے آ جاتی ہے۔ میں مائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے کہا "نانو ٹی بی کا مریض ہو گیا ہے" میں خاموشی سے ان کا گمبھیر چہرہ تک رہی تھی۔ حالانکہ میں زور زور سے چیخنا چاہتی تھی لیکن جب کوئی چیز اپنی حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو آدمی بالکل خاموش ہو جاتا ہے۔ مائی کی آنکھوں میں پھر پانی آ گیا۔ "نانو کو دن رات بخار رہتا ہے کھانسی کا بھی زور ہے ——— میرا ایک کام کرو گی؟"

"ضرور کروں گی پر پہلے تم پاؤں دھو لو اور میرے ساتھ کھانا کھا لو"

"آج سنیچر ہے اور میرا اپاس ہے؟ میں پورن پولیاں اچھی بنا لیتی ہوں کسی کو ضرورت ہو تو کہو میں تیار کر لوں گی، البتہ مجھے پانچ روپے........ نانو کو روز ہی پانچ روپوں کی دوا لگتی ہے۔ دودھ، انڈے، انجکشن! کرو گی نا میرا کام؟"

"کل آ جاؤ میرے گھر۔ کل کچھ لوگوں کو دعوت دی گئی ہے ہم ان کے لئے پورن پولیاں ہی بنا لیں گے، میں نے ان سے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے پانچ روپے ایسے ہی لے جاؤ"

"مجھے مزدوری کے طور پر چاہئے میں بطور قرض لے گئی تو پھر کبھی دلوٹا سکوں گی۔ اس لئے پہلے کام کروں گی اور پھر روپے لے جاؤں گی"

دوسری صبح مائی آ گئیں اور آتے ہی کام میں جٹ گئیں۔ میں نے درمیان میں انھیں پانی بھر چائے دے دی۔ اس کے بعد پھر ان سے کھانا کھانے کے لئے کہا۔

انھوں نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "آج اتوار ہے اپواس ہے" میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد سے مائی ساتوں ہی دن اپواس رکھا کرتی تھیں۔ مائی اکثر دوپہر کو آیا کرتیں۔ اور ہمیشہ ہی ان کا اپاس رہتا۔ کبھی تھوڑا بہت ادھر ادھر کھا لیتیں۔۔۔

کہا کرتیں۔ نانو ابھی تک بستر سے لگا پڑا ہے۔ میں ابھی سب کچھ دیکھ رہی ہوں اور سمجھ رہی ہوں کہ آگے کیا ہوگا۔ صرف میں اکیلی چنڈال رہ جاؤں گی پُل پر آتے وقت اکثر لگتا ہے کہ کود کر اپنی جان دے دوں۔ لیکن آتم ہتیا بھی تو پاپ ہے نا! یہاں اگر ادھورا رہ جائے تو اوپر بھگتنا پڑے گا۔ یا پھر نئے جنم میں اس کا بدلہ چکانا پڑے گا۔"

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے خاموشی سے سنتی رہی۔ لیکن اس کے چار روز بعد ہی خبر آئی کہ مائی پُل پر سے ندی میں کود پڑیں لیکن آتم ہتیا اس کے بھاگ میں لکھی ہی نہیں تھی۔ انھیں کسی آدمی نے بچا لیا تھا۔ البتہ اسی روز نانو چل بسا۔ آدمی زندہ رہ کر بھی کس طرح مرجاتا ہے اس حالت کا اندازہ مائی کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔ مائی کے گھر جانے کا یہ دوسرا موقع تھا لیکن مجھ میں اب ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ کیونکہ انکی اس وقت کی حالت مجھ سے یقیناً دیکھی نہ جاتی۔ شوہر کی موت کا صدمہ، پھر آتم ہتیا کی کوشش، اور اس کے بعد نانو کی موت! اب مائی نہیں بچے گی۔ عمر بھی ہوگئی تھی اور اب ان کا سکھ صرف موت ہی میں پوشیدہ تھا۔ روز ہی محسوس ہوتا کہ شاید آج ہی ان کے مرنے کی خبر آجائے۔ لیکن اسی حالت میں دو مہینے بیت گئے۔ پھر چار اور پھر سات مہینے بیت گئے۔ پھر ایک روز پتہ چلا مائی کے یہاں چند لوگ کھانا کھاتے ہیں اسی پر ان کا گذارہ ہو جاتا ہے۔ کام کرتے بھی اور پیٹ پالتے ہیں۔

پھر نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ ورنہ گذر بسر کیسے ہوگی؟ پیٹ کا یہ اندھا کنواں کیسے بھرے گا؟ لیکن یہ گہرا کنواں بھرتے وقت نجانے ان پر کیا بیتی ہوگی؛ نانو کی بیوی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اپنے ہاتھ گہنے لے آئی تھی اور چار پیسے بھی! اب تو واقعی مائی کو اپنی جان دے دینی چاہیے تھی۔ نجانے کیوں وہ اب تک زندہ تھیں؟

ایک روز تین بجے پھر ایک بار میں دھیرے دھیرے مائی کے گھر کا زینہ طے کرتی ہوئی اوپر جا پہنچی۔ مائی اپنے پُرانے کمرے میں نہیں رہتی تھیں انھوں نے اپنے لئے دوسرا کمرہ لیا تھا۔ چار بچوں کی ماں اور اُن کے ساتھ کھانے والے وہ چار لوگ بھی! میں نے اسی لمحے سوچ لیا اب یہیں سے واپس جانا چاہئے۔ لیکن سامنے ہی نانو کی بیوی السن کی چٹنی بنا رہی تھی ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنی آنکھیں مجھ سے چھپالیں

مائی نے مجھے دیکھتے ہی کہا "آؤ" مائی آم کاٹ رہی تھیں۔ ایک ٹکڑا ان کے منہ میں بھی تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی آم کاٹ کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے بہت چہرے سے کچے آم کے ٹکڑوں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے ایک اور چھوٹی سی پلیٹ میں آم کاٹ کر رکھ دیا۔ اور اسے سب سے چھوٹی لڑکی کی جانب سرکا دیا۔ غالباً وہ دو سال کی ہوگی۔ ہاتھ پاؤں جیسے لکڑی اور پیٹ طبلہ، سر جیسے پیالہ، سب طرف بال ہی بال اور چہرے پر موت کی پرچھائیاں۔

پتہ نہیں کیوں لڑکی کی ایسی حالت پر بھی نہ ہی وہ اپنا سوچتی تھیں اور نہ ہی موت کی دعائیں مانگتی تھیں۔ آخر ہوا کیا ہے انھیں؟ لیکن مائی نے اس کے سامنے پیالی بھر دودھ رکھ دیا۔ لڑکی نے جلدی جلدی آم کھانا شروع کردیا۔ جیسے مشین میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے آم کے ٹکڑے ٹھونس رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے دودھ کے پیالے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ مائی اس کے جواب میں کہہ رہی تھی، ہاں بالکل دودھ بھی دیتی ہوں، پہلے آم تو کھالے۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگیں "یہ ہے ہماری لینے والی، یہ بچہ زندہ رہنے والی نہیں! دیکھ رہی ہو نا اس کی حالت؟ یہ بھی ہمیں دھوکا دے گی۔ وہ چلے گئے۔ یہ بھی چلی جائے گی جیسے نانو چلا گیا۔ وید جی نے کہا۔ اس کے لئے اب دوا کی کیا ضرورت ہے۔ زندہ رہے گی نہیں۔ کیوں یونہی روپے گنواتی ہو! یہ جو کچھ بھی مانگے اسے دے دو۔ اسی لئے تو اسے ہر چیز یعنی جو بھی مانگتی ہے دے دیتی ہوں۔ اگر نہ دیا جائے تو روتی ہی رہتی ہے۔ اگر یہ روتی رہے گی تو ہمیں نیند کیسے آئے گی۔ ہم دن کو کام کیسے کرسکیں گے؟ جب تک وہ پورا حصہ نہیں لے گی تب تک نہیں جائے گی۔ اور جب تک وہ جائے گی نہیں، ہمارا چھٹکارا نہیں ہوسکے گا۔ اور جتنا زیادہ کھائے گی اتنی ہی جلدی چلی جائے گی۔ روز تین سیر دودھ پیتی ہے۔ جتنا چاہے پی لے۔ جب تک اس کا بقایا ادا نہیں ہوتا وہ نہیں جائے گی۔

دوسری طرف مائی کی بہو زور زور سے رو رہی تھی اور اس طرف مائی کا منہ چل رہا تھا۔ لڑکی نے پہلا آم کھا لیا اور دوسرے کے لئے اپنا ہاتھ پھیلایا۔ مائی نے فوراً دوسرا آم کاٹ کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ میں نے کہا، مائی یہ کیا کر رہی ہو تم ہضم نہیں ہوگا اُسے۔

ضرور ہوگا۔ ہم اس کی طرف رتی برابر بھی دھیان نہیں دیتے۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ لینے والی ہے۔ صرف لینے والی، دینے والی نہیں۔

اس سرے سے اس سرے تک سبھی لینے والے ہیں چاہے شوہر ہو، لڑکا ہو سبھی ایک ہی جیسے کوئی کسی کا نہیں، پچھلے جنم میں ان کا کچھ لیا تھا جو آج چکا رہی ہوں یہ جتنی جلدی چلی جائے گی، میں چھوٹ جاؤں گی، پھر آزاد ہو جائے گی میں اس سے ہمیشہ یہی کہا کرتی ہوں رونے سے کیا ہوگا۔ ایک بار سبھی کچھ دے ڈالو، اس کا بقایا ادا کر دو خود بخود چھٹکارا مل جائے گا مکتی ہو جائے گی۔

وہ کچھ اس انداز سے کہہ رہی تھیں کہ میں کچھ بھی جواب نہ دے سکی پتہ نہیں مائی اتنی بدل کیوں گئی تھیں، ندی میں کود کر جان دینے والی اپنا سر پھوڑ کر خود کو تباہ کرنے والی مائی، اتنی کمزور کیوں ہو گئی؟ غالباً وہ اپنی عمر بڑھنے کی وجہ سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں گی کہ ان چاروں میں سے کم از کم ایک کم ہو جائے گا تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ میں کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکی مائی کے دکھوں نے ایک الگ راہ اپنائی تھی جو عام آدمیوں کی نہیں۔

البتہ وہ کون سی ہوگی یہ میں الفاظ میں کبھی بھی بیان نہیں کر سکوں گی۔

مائی نے پھر ایک بار مجھے آم کھانے کے لئے کہا۔ میں نے اسے پرے رکھ دیا۔

مائی نے فوراً کہا۔ "ارے کھا۔ ہر ایک کا اپنا حصہ کھانا ہی چاہئے کوئی پہلے جنم لے کر دکھ دے جاتا ہے کوئی بعد میں جنم دے کر۔ کوئی شوہر ہو کر دکھ دے جاتا ہے کوئی لڑکا ہو کر۔ کتنا روؤگی اس کے لئے؟ اس کا سارا حساب کتاب ہی الگ ہے۔ تم اپنا آم کھا لو، قلمی ہے۔"

میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکی اور واپس جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے صرف ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "میں جا رہی ہوں" پھر ایک بار مجھے محسوس ہوا میں نے اچھا نہیں کیا۔ کم از کم مائی سے اجازت ہی لے لیتی میں، واپس دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور دیکھتی ہی رہ گئی مائی شانت ہو کر قلمی آم کا ٹکڑا چبا رہی تھی!!!

پروفیسر شانتا شیلکے

سیتا

اوپری دیوان خانے میں پلنگ پر سوئی ہوئی سیتا زار و قطار رو رہی تھی ۔ گھر کا درمیانی حصہ پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے بھر گیا تھا درمیان میں ہنسی کی آواز دور تک سنائی دے رہی تھی ۔ ....

....

.... باتیں کرتی ہوئی اور ہنستی ہوئی سورتیں یکایک رک جاتیں اور پھر کسی بات پر قہقہہ بلند کرتیں اور جب بھی یہ قہقہے اس کے کانوں سے ٹکراتے اس کے آنسوؤں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ۔

سیتا کی سوت نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا ۔ بیاہ کے بارہ برسوں کے طویل عرصے کے بعد آج ایک ننھے نے جنم لیا تھا ۔ سیتا کے شوہر کی جائداد کا وارث پیدا ہو گیا تھا ۔ اس لئے چاروں طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے ۔ سیتا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُسے محسوس ہوا جیسے اس کی سوت سرسوتی درمیانی حصہ میں پلنگ پر سوئی پڑی ہے ۔ کمزور دبلی پتلی ، آنکھوں میں کاجل لگائے ، اپنی ساری سنبھالے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھ رہی ہوگی ۔ قدرے ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی بھی ہوگی ۔ اور کسی کے کوئی سوال پوچھنے پر معمول کے مطابق دیوانے کی طرح چبا چبا کر یا پھر بہت ہی آہستہ جوابات دے رہی ہوگی پڑوسنوں نے نئے کپڑے پہنے ، زیور پہنے اس کے اطراف ایک حلقہ سا کر لیا ہوگا ۔ پڑوسن شاردا کو پھولوں کی مالا بنانے کا کام سونپ دیا ہوگا ۔ چونکہ وہ اس کام میں بڑی مہارت رکھتی ہے ۔ شہر کے مٹھائی والے جگن سے پانچ دس سیر مٹھائی منگوائی گئی ہوگی ۔ ہلدی ، کنکو اور ناریل بھی منگوائے گئے ہوں گے ۔ سیتا کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے کئی منظر آ رہے تھے ، کئی جا رہے تھے ۔ آٹھ روز پہلے ہی گھر کے پرانے پالنے پر پالش کر کے بالکل نیا کر دیا گیا تھا ۔ اُسے سجایا بھی گیا تھا اس کی کھڑکیوں کو بھی نئے رنگ دے کر اور بھی خوبصورت بنایا گیا تھا ۔ اناداروں کی ساری اولاد اسی پالنے میں پالی پوسی اور پروان چڑھائی گئی تھی ۔ البتہ اس بار یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اب اس پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی ۔ اس لئے استعمال میں نہیں لایا جا سکے گا لیکن خوشی کی بات تو یہ تھی کہ اُس پالنے کی قسمت جاگ اٹھی تھی ۔ نوکروں نے اس پرانے میلے کچیلے پالنے کو صاف کر کے اور پالش کر کے اُسے نئی زندگی دے دی تھی ۔ اب وہ لٹکا دیا گیا ہوگا ۔ شاردا نے اس کے چاروں طرف پھول لگا دیئے ہوں گے ۔ ننھے کے لئے بہت ہی نرم بچھونا بچھایا گیا ہوگا ۔ اور اسے نرم اور خوبصورت چادروں سے سجایا گیا ہوگا ۔ ایک چھوٹا سا کھلونا بھی لٹک رہا ہوگا ۔

"کیسا ہوگا وہ ننھا ۔۔ ؟" سیتا نے اب تک اسے دیکھا نہ تھا سچ کہا جائے تو جب سے اُس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا ، اُس نے نیچے آنا ہی چھوڑ دیا تھا ۔ یہاں تک کہ اس کا دونوں وقت کا کھانا بھی نوکرانی ہی اوپر پہنچایا کرتی تھی ۔ بہت بڑی اور اہم بات پر بھی وہ نیچے آنا مناسب نہ سمجھتی تھی ۔ اس ننھے بچے کو دیکھنا ضرور چاہتی تھی ، لیکن نہ جانے کیوں اس نے اب تک اس کمرے کا رُخ ہی نہیں کیا ؟ حالانکہ اس کی سوکن نے اُسے دو ایک بار بلوا بھی بھیجا تھا ، لیکن اس نے اس کے بلاوے پر کوئی دھیان ہی نہ دیا ۔

اس کا ناک نقشہ کیسا ہوگا ؟ جانے اور انجانے طور پر سیتا اس سے متعلق سوچنے لگی ۔ وہ اپنے دونوں پاؤں پیٹ سے لگائے سوتا ہوگا ۔ اور وہ چھوٹا سا بچہ منہ کھولے رو رہا ہوگا ، یا پھر دودھ کے لئے مل

کی طرف دیکھ رہا ہوگا۔ وہ ایک انجانے خوف سے سرتا پا کانپ اُٹھی۔ پل بھر میں اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ لڑکا اسی کا ہے۔ ہو نہ ہو کہیں نہ کہیں دھوکا ضرور ہوا ہے؟ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے؟ ورنہ وہ اس کی گود میں پروان چڑھتا نظر آتا ۔۔!

سچ کہا جائے تو اسے سیتا کی کوکھ ہی میں جنم لینا چاہئے تھا۔ اور اسی لئے تو انعامداروں نے اسے بیاہا تھا۔ چونکہ سرسوتی سے بیاہ کو پانچ سال سے اوپر کا عرصہ ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک ایک بھی بچہ پیدا نہ کر سکی تھی۔ اسی وجہ سے سیتا کو بیاہ کیا تھا، اس امید پر کہ وہ ضرور اس جائداد کا وارث پیدا کرے گی یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کی خاندانی روایات کو بھی تج دیا گیا تھا۔ غریبی، امیری، خوبصورتی، بدصورتی کسی بھی ترازو میں سیتا کو تولا نہیں گیا تھا۔ اپنی غریبی کی جو کمتری کو ہمیشہ کے لئے پیچھے رکھ کر اس نے اس بہت بڑے خاندان میں قدم رکھا تھا۔ انعامدار کی اس بہت بڑی جائداد کا کوئی وارث نہیں تھا۔ اس لئے سیتا کو اس گھر میں لایا گیا تھا۔ اور جب سے اس نے اس دہلیز پر قدم رکھا تھا اس کی ہر بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔

بڑی سوکن سرسوتی تو بالکل ہی غریب تھی۔ اور وہ سیتا سے ہر وقت ہی دبی دبی سی رہتی تھی سب ہی اُس کے سامنے جھکے رہتے۔ اس کی ہر بات کا خیال رکھتے۔ سیتا کو شکایت کرنے کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اور اس تمام آرام و آسائش کے عوض وہ سب ایک وارث چاہتے تھے۔ انعامدار کی اس بہت بڑی جائداد کا حقدار! صرف اس کام کے لئے اسے یہاں لایا گیا تھا۔ لیکن حقیقت میں سیتا نے سب کو مایوس کر دیا تھا۔ ایک بچہ نے جنم ضرور لیا تھا۔ البتہ وہ سیتا کا نہیں سرسوتی کا تھا۔ سیتا کو اس گھر میں داخل ہوئے سات سال ہو رہے تھے۔ اب تک وہ اپنا فرض پورا نہ کر سکی تھی۔ لوگوں کو اب اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ خود انعامدار کی قسمت میں کوئی اولاد لکھی ہی نہیں۔ اور پھر یکایک سرسوتی کے پیر بھاری ہو چلے اور پھر ایک دن اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور آج اس لڑکے کے بارسے کا دن تھا۔

سیتا نے پہلے پہل تو اس بات پر یقین ہی نہیں کیا۔ چونکہ وہ اب تک تو یہی سمجھ رہی تھی کہ بچہ اس کی کوکھ میں جنم لے گا۔ لیکن جب سرسوتی کی بات چاروں طرف پھیل گئی تو اُسے دھکا سا لگا اور اُسے بار بار یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہونے والا یہ بچہ اسی کا ہے، سرسوتی کا نہیں! اُسے محسوس ہوا جیسے یہ بچہ سرسوتی نے اس کی گود سے چھین لیا ہے، اچک لیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک قسم کی ناانصافی کی گئی ہے۔ اسی لئے اس نے ہاتھ پاؤں پٹکنے شروع کر دیئے اس نے اپنے شوہر کے ساتھ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا کیا نوکروں کو ڈانٹتی رہی اور سرسوتی کو اس نے خوب جلی کٹی سنائی اور پھر کبھی اس کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی۔ سرسوتی نے اس کے جواب میں خاموشی ہی مناسب سمجھی اور ایک لڑکے کو جنم دے دیا۔ آج آج اس کے بارسے کا دن تھا۔ اس لئے سیتا اوپری دیوان خانے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اسی وقت کسی نے اسے آواز دی "سیتا او سیتا" سیتا نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں اوپر اُٹھائیں، سامنے سرسوتی کی ماں کھڑی تھی۔ سرسوتی کی ماں کو دیکھتے ہی وہ ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی۔

سرسوتی کی ماں اس کے اور بھی قریب ہو گئی اور اُسے تھپتھپاتے ہوئے کہا "میری بات مان جاؤ سیتا۔ اُٹھو اور اپنی آنکھیں صاف کر لو۔ نئے کپڑے پہنو، کچھ زیورات بھی پہن لو اور نیچے چلو۔ سبھی تمہارے منتظر ہیں۔" "لیکن کاکی! میرے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ یہ سب کچھ مجھے ملنا چاہئے تھا، سچ کہا جائے تو تمہاری لڑکی نے میرا بچہ مجھ سے چھین لیا ہے، میری گود اجاڑ دی ہے۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ مجھے لوٹا ہے، برباد کیا ہے!" کہتے کہتے وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

کاکی نے اسے اپنے قریب لے لیا۔ اس کے آنسو پونچھ دیئے اور اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "میں تو تمہیں بہت ہی عقلمند سمجھتی تھی، لیکن تم تو بالکل ہی نادان اور انجان ہو۔ کیا وہ بچہ تمہارا نہیں ہے؟ سرسوتی نے اُسے اپنی کوکھ سے جنم دیا تو کیا ——— وہ بھی تو تمہارے اچھے کرموں کی وجہ سے۔ اگر تم یہاں نہ آتیں، کچھ برسوں سے اس گھر کو سنوارتیں تو سرسوتی کی کوکھ بھی بانجھ ہی رہتی۔ سچ کہا جائے تو وہ بچہ تمہارا ہی ہے، سرسوتی تو بالکل ہی بھولی اور پگلی لڑکی ہے، وہ کیا جانے سنسار، گھر گرہستی اور شوہر کی چہیتی تم! سارے نوکر تمہارے ہی تابعدار، گھر کی مالکن بھی تم! سبھی کچھ تو تم ہو، تو کیا تم اس بچے کی ماں نہیں ہو سکو گی؟ وہ بچہ تمہارا ہی ہے۔ تم ہی اس کی ماں ہو۔ اُٹھو اور میرا کہا مانو ۔۔۔

سیتا تعجب خیز نظروں سے سرسوتی کی ماں کا جائزہ لے رہی تھی جوں جوں وہ اُسے سمجھاتی، سیتا کا چہرہ کھلتا جاتا۔ اس نے کاکی کی ساری باتوں کو بغور سُنا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا "یہ سب کچھ تم سچ کہہ رہی ہو نا ـــــ؟"

"ہاں یہ بالکل سچ، اس میں جھوٹ کو ذرّہ برابر دخل نہیں۔ کیا تمہارے شوہر کا لڑکا تمہارا نہیں۔؟ صرف سرسوتی کو کچھ دنوں کے لئے سنبھالنے کے لئے دیا گیا تھا۔ تم ہی اس کی ماں ہو اب دیر نہ کرو اور میرے ساتھ نیچے چلو ـــــ"

خوشی سے سیتا کا چہرہ کھِل اُٹھا وہ پلنگ سے نیچے آگئی اُس نے کاکی سے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو وہ بچہ میرا ہی ہے۔ میں ہی اس کی ماں ہوں میں آتی ہوں تمہارے ساتھ۔ آج اس کا نام رکھنا ہے نا؟"

پندرہ بیس منٹوں کے اندر اندر وہ تیار ہو گئی اس نے نئے کپڑے پہنے، کچھ زیورات بھی پہن لئے اور پھر کاکی کے ساتھ نیچے آگئی۔ سبھی عورتوں نے آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ سیتا سرسوتی کے بالکل قریب چلی گئی لمحہ بھر کو اُس نے اس ننھے بچّے کی طرف دیکھا اور پھر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس نے سبھوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ـــ "اب میرا منہ کیا تکے جا رہے ہو؟ چلو جلدی کرو سارا سامان لے آؤ۔۔۔۔!"

ایک کے بعد دوسرا سال بیت رہا تھا سرسوتی کا سب سے بڑا لڑکا پربھاکر اب پندرہ سال کا ہو رہا تھا۔ اس کے بعد کا سُدھاکر اب بارہ سال کا ہو رہا تھا اور اس کے بعد کی کسوما اب آٹھویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ سرسوتی بچوں کو جنم دے کر پرے ہٹ جاتی اور سیتا سبھوں کی ماں ہو جاتی۔ سیتا سب کچھ بھول کر اب ان ہی کے لئے زندہ تھی۔ ان کے سکھ دکھوں کی وہی مالک تھی۔ ان کی بیماری کے دوران وہی رات رات بھر جاگتی وقت آنے پر وہی ڈانٹتی بھی تھی۔ اور بے انتہا پیار بھی کرتی تھی۔ کسی ایک کو بھی جنم نہ دیتے ہوئے بھی وہ ماں ہو گئی تھی۔ بچوں کو پروان چڑھتے دیکھ کر اس کی آتما خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی پربھاکر اس سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا اور اس کے فوراً بعد وہ تینوں بچوں کو ساتھ لیکر ان کی اگلی تعلیم کے لئے پونا جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اور اسی دوران یکایک اس کی کایا پلٹ گئی اس کے پیر بھاری ہو گئے بیاہ کے بائیسویں سال یہ ایک عجیب سی بات ہو گئی تھی۔ نہ تو وہ اب جوان رہی تھی اور نہ ہی نو بیاہتا! اس نے چالیسویں میں قدم رکھا تھا۔ اور جگہ جگہ پر سفید بال بھی اپنا سر اُٹھا رہے تھے۔ لیکن ایشور نے اچانک ہی اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس کی کوکھ ہری ہو گئی تھی۔ اس بات پر وہ کافی شرمائی، لجائی اور اسے اس بات کا قدرے دُکھ بھی ہوا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھوں ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ اور وہ سرسوتی کی، اپنے شوہر کی، اور سرسوتی کے بچوں کی گنہگار ہے۔ اس اہم بات کی خبر آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی، اور اُڑتے اُڑتے سرسوتی کی ماں تک بھی پہنچ گئی۔ سرسوتی کی ماں فوری طور پر اس سے ملنے آگئی۔ اُسے دیکھتے ہی سیتا نے شرما کر اپنی نظریں نیچی کر لیں اور زار و قطار رونے لگی۔

سرسوتی کی ماں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم میرے لئے سرسوتی ہی کی طرح ہو۔ میرے لئے تم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ تمہارے اچھے کرموں کا پھل تمہیں مل گیا ہے قدرے تاخیر ضرور ہوئی ہے، لیکن ایشور نے تمہاری آواز سُن لی ہے اور تمہارے اچھے کرموں کا پھل دیدیا ہے اس کے گھر دیر ضرور ہے، اندھیر نہیں۔ میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں گی، اور ساری رسمیں پوری کر دوں گی۔ سرسوتی اپنے بچوں کو سنبھال لے گی۔

سیتا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کاکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پتہ نہیں ایشور نے اِس عمر میں یہ مصیبت کیوں نازل کی ـــ؟ میرے تین بچے تو ہیں ہی اب اس چوتھے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے اس چوتھے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ میں ان تینوں کو اپنے ساتھ لئے پونا جانے والی تھی۔ ان کی پڑھائی کے لئے گھر چھوڑنا چاہتی تھی۔ سرسوتی ان سب کو سنبھال نہیں سکے گی۔ یہ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا چاہئے تھا۔ لیکن ایشور نے یہ کیا سوچ کر یہ بیڑیاں پاؤں میں ڈال دیں ـــ؟ کاکی مجھے یہ نہیں چاہئے۔ بالکل نہیں چاہئے۔ میں اس کے لئے کسی صورت تیار نہیں۔۔۔۔۔!" اس نے کاکی کے گرد اپنے ہاتھوں کا حلقہ بنا لیا اور پھر ایک بار زور زور سے رونے لگی۔ ان تینوں بچوں کے چہرے

پکھ جھد بگرے اس کی نظروں کے سامنے آرہے تھے۔ اور بار بار اسے اس کے مستقبل کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اور سب میں پروان چڑھنے والا بچہ اُسے ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بچہ ایک نئی راہ پر گامزن تھا۔ ترقی کر رہا تھا۔ آگے بڑھ رہا تھا اور ماں کی کوکھ کے دن پورے کر رہا تھا!!!

——

صفحہ ۶ کا بقیہ

خصوصی انعامات حاصل ہوئے ہیں مراٹھی کے نئے ادب میں ان کا ایک مخصوص مقام ہے۔

محترمہ شرش پیٹے۔ تقریباً دس افسانوی مجموعے اور تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ مراٹھی کی مقبول شاعرہ بھی ہیں۔ دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان دنوں مہاراشٹر میں مدیر معاون کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

مدھو منگیش کرنک۔ تقریباً بارہ افسانوی مجموعے، چار ناول اور انشائیوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں کام کر رہے ہیں۔

پروفیسر شانتا شیلکے۔ شانتا شیلکے مراٹھی کی سب اہم خاتون افسانہ نگار ہیں پچھلے تیس سالوں سے متواتر افسانے، ڈرامے، ناول اور نظمیں لکھ رہی ہیں۔ مہارشی دیانند کالج پریل (بمبئی) میں مراٹھی کی لیکچرار اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہیں۔ "ورجا" اور "روپسی" مشہور اور مقبول شعری مجموعے ہیں۔

وامن چور گھوڑے، محترمہ وسوندھرا پور دھن۔ وامن پربھو، محترمہ آشا بھاجیکر ——— نئے مراٹھی کہانی کاروں میں ایک اہم مقام کے مالک!

——

صفحہ ۱۳۶ کا بقیہ

"یہ روپے پونے دو سو نقد!"

پھر بھی گنپت خاموش ہی رہتا ہے۔ موتی رام بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی رسّی اس کے گلے میں باندھ دیتا ہے۔ بھینس اپنی آنکھیں بند ہی رکھتی ہے۔ پھر وہ گنپت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

"اب اجازت چاہتا ہوں"

گنپت اپنی نظریں اُٹھا کر بھینس کی طرف دیکھتا ہے اپنی گردن لمبی کئے آنکھوں میں آنسو بہاتے وہ گنپت کی طرف دیکھتی ہے پھر اپنی گردن نیچے جھکا دیتی ہے۔ اسی لمحہ گنپت اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اور ہزار کوشش اور ضبط کے باوجود بھی اُس کے آنسو بھینس کی گردن پر ٹپ ٹپ گر پڑتے ہیں۔ اسی حالت میں وہ اپنی بیوی بایجا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "جاؤ اور اس کے لئے روٹی اور گڑ لے آؤ۔ آج تو آخری بار مجھے اپنے ہاتھوں سے اسے کچھ میٹھا کھلا لینے دو۔!"

——

وامن پربھو

بھینس

گوبر اور پیشاب میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر جگالی کرتی رہتی ہے بایاں بازو گوبر سے بھر جاتا ہے اور داہنے سے وہ آسمان کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ منہ سے پانی رستا رہتا ہے۔ اور کبھی کبھار اس سے وہ لطف اندوز بھی ہوتی ہے۔ صبح کو وہ اسی حالت میں دکھائی دیتی ہے۔

اسی طرح اس حالت میں پڑے رہنے کی اب وہ عادی ہو چکی ہے۔ پہلے پہل اسے اس بات سے کافی تکلیف پہنچتی تھی۔ اور جوں ہی اُسے پرانے دن یاد آجاتے، آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو نکل پڑتے۔ لیکن پچھلے دو مہینوں سے وہ بالکل بدل گئی ہے لگتا ہے جیسے اس نے اپنے سارے دکھ آنکھوں سے پی لئے ہیں۔ اور اب ان آنکھوں میں سپنے بھی رینگتے نظر آتے ہیں۔ ایسا سُکھ اُسے پاٹل کے گھر کبھی میسر نہیں آیا۔ یہاں کھانے پینے کی قدرے تنگی تھی، اس کے باوجود وہ بہت خوش تھی۔ اور اب اسی طرح جیون بتانے والی تھی۔

یوں بھی تو اسے اپنے پھیلے ہوئے جسم پر اکثر غصہ ہی آتا تھا۔ اور جب کھانے کے لئے کم ہوتا تو وہ سوچتی کیوں نہ یہ رسّی توڑ کر سیدھے پاٹل کے گھر چلی جائے۔ لیکن اس خیال کے آتے ہی اُسے اور دکھ پہنچتا اور وہ اپنی آنکھیں موند لیتی۔ آنکھوں پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو کان سے اُڑا دیتی۔ ایسے وقت وہ اکثر اپنے پچھلے دونوں پاؤں اور بھی ڈھیلے چھوڑ دیتی پھر پاٹل کے خیال ہی کو دماغ سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرتی لیکن وہ شہد کی مکھی کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہتا اور اس کے کانوں کے ارد گرد منڈلایا کرتا ــــ اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ پاٹل کے مکان سے ملی ہوئی چاندنی یاد آجاتی اور اس کی بیوی کی چیخ پکار پاٹل کے ہاتھوں میں اوپنی چھڑیاں کبھی کچھ اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔

اور اُسے عجیب سی بے چینی کے عالم میں زور زور سے چیختے رہنے کا احساس ہوتا۔ لیکن وہ چیخنے کے بجائے خاموشی سے چاروں طرف تکا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ اس کا چلانا گنپت کو بالکل پسند نہیں۔!

گنپت جوں ہی اندر آجاتا ہے بھینس اپنی گردن لمبی کئے گوبر اور پیشاب میں لیٹی نظر آتی ہے اس کی چال بھی بدل گئی ہے اسے اپنی بیوی یاد آتی ہے۔ اس کے بھی دن ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایک عجیب سا خیال انگڑائیاں لے لیتا ہے۔ پھر وہ اپنی بھینس سے بھی اپنی آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں کرتا۔

بائیجا گڑھے میں سے پانی نکالتی رہتی ہے اور اس وقت اس کی سانسوں کی آمد و رفت کا فوراً اندازہ ہو جاتا ہے گنپت بار بار اسی کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر وہ سر کا دوپٹہ کھول کر باندھ لیتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیئے۔ اس لئے وہ ایک جماہی لیتا ہے اور پھر ایک بار بائیجا کی طرف دیکھ کر بھینس کی طرف دیکھتا ہے۔ گڑھے سے پانی نکالنے کے بعد بائیجا کا دھیان خود بخود اپنے شوہر کی طرف چلا جاتا ہے وہ نہ جانے کس سوچ میں گم نظر آتا ہے۔ اس کی خاموشی کا فوراً احساس ہو جاتا ہے اس لئے وہ بھینس کی طرف چلی جاتی ہے۔ بھینس اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لیتی، چونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس میں اور بائیجا میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ پھر بائیجا گوبر کے لئے چاروں طرف نظریں دوڑاتی ہے لیکن اُسے گوبر کہیں نظر نہیں آتا۔ گوبر بھی تو بھینس پر چپکا نظر آتی ہے۔ وہ چپ چاپ بھینس کی آنکھ سے گوبر کا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے دکھوں سے تکیں ...

ہمارا بچہ بھی ہوتی ہے کہ بلے کا نام تک نہیں لیتی۔ بائیجا کو غصہ آجاتا ہے۔ پیشاب اور گوبر سے بھرا ہوا ڈنڈا وہ بھینس کی پیٹھ پر جما دیتی ہے۔ لیکن اس کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوپاتا۔ وہ اپنی دم اس انداز سے ہلاتی ہے کہ گوبر سے بھرے ہوئے پیشاب کے قطرے اس کے جسم پر پھیل جاتے ہیں۔ اس کا دماغ بھنا جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوکر پوچھتی ہے ۔۔۔ "کیا آج بھی صفائی نہیں کی؟" گنپت کوئی دھیان نہیں دیتا۔ بائیجا گوبر جمع کرکے پانی میں گھول دیتی ہے اور آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی زمین اور دیوار کو گوبر سے لیپتی ہے۔

گنپت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ بائیجا پھر ایک بار اسے ایک نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھتی ہے۔

"آج صبح ہی سے تمہارا کام کیا تو کوئی بھی نہیں، آخر وجہ کیا ہے اس کی؟"

اس سوال کا جواب بھی خاموشی ہی ہوتا ہے۔ لیکن کچھ دیر گھورنے کے بعد گنپت خود بخود کہہ اٹھتا ہے۔

"کل وٹھل آیا تھا۔؟"

"آیا ہوگا پیسے مانگنے!"

"اور کس لئے آتا؟"

بائیجا اپنے شوہر کے مزاج کا پتہ لگا کر پھر سے کام میں جٹ جاتی ہے۔ گھر کی زمین لیپنا شروع کر دیتی ہے۔ اور پھر درمیان ہی میں پوچھ بیٹھتی ہے ۔۔۔۔۔ وٹھل کو پیسے دینا باقی ہیں کیا؟"

"وٹھل کا نہیں، وٹھل کے دادا کا۔"

"یعنی؟"

"سرکار کے دینے ہیں۔ اس کا تقاضا کب سے ادا کر چکا ہوں۔"

"تو پھر اب کا ہے کے؟"

"اس سال کے۔ وعدہ کیا ہے میں نے۔"

"تو پھر اب تک پورا کیوں نہیں کیا؟ ہر سال تو وقت پر ادا کر دیتے ہو پھر اس سال؟"

"اس سال! سر میرا"

بائیجا چپ ہوجاتی ہے اس وقت تک وہ گنپت کے قریب پہنچ چکی ہوتی ہے۔

"میرا سر کیوں؟ دے دینے تھے اسی وقت۔"

"تمہاری آئی تھی نا وہ تمہارا نام لینے والی!"

گنپت کے اس جواب پر بائیجا تعجب خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہے اسے شوہر کے غصہ کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔ البتہ یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے۔ کیونکہ سارا الزام اس کے سر تھوپا جاتا ہے۔ وہ پوچھ بیٹھتی ہے۔ "میں نے تم سے کب کہا تھا کہ تم تقاضا ادا نہ کرو؟"

"جب جب بھی رہوگی کوئی گڑے مردے اکھاڑتی ہو۔"

"تو پھر یہ سارا الزام میرے ہی سر کیوں؟"

"تمہاری لڑکی جو آئی تھی، اسی دوران۔" گنپت بھی ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

"تو کیا اس نے تمہارے ہاتھ پکڑے تھے؟ کیا اس نے تمہیں پیسے دینے سے منع کیا تھا؟"

"کیا اس کے لئے ایک ساڑی نہیں خریدی گئی تھی؟"

"تو کیا لینی نہیں چاہئے تھی، میری لڑکی کا جیسے تم سے کوئی رشتہ ہی نہیں۔؟"

گنپت جواب میں خاموش ہوجاتا ہے، دو سالوں کے بعد گھر واپس آئی ہوئی لڑکی کے لئے ساڑی خریدنی ہی چاہئے۔ ساتھ میں اس نے ہرے کانچ کی چوڑیاں بھی خریدی تھیں اور جوتے بھی! اس کے لڑکے کے لئے چھوٹی سی پتلون اور ایک ٹوپی بھی!

اس کی خاموشی کو بائیجا نے فوراً تاڑ لیا۔ گنپت کے ساتھ زندگی گذارتے ہوئے اسے تیس سال ہو رہے تھے۔ غریبی اور اس کے باوجود بھی ہر چیز سے مقابلہ کرنے کی ہمت، اس میں تھی۔ جب بھی اس کے بچہ پیدا ہونے والا ہوتا، وہ بہت ہی محتاط رہتا اور بائیجا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا۔

"پھر اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کہیں سے کچھ روپئے مل جائیں تو ۔۔۔۔"

کہاں ڈھونڈھوں۔ دادا کے گھر؟"

"کیوں گاؤں میں دوسرے گھر نہیں ہیں؟"

"ہیں! بہت سارے ہیں۔"

بائیجا اپنی ٹوکری اٹھا کر صاف کرنے کے لئے باہر چلی جاتی ہے اور جب اندر داخل ہوتی ہے تو گنپت سے مخاطب ہو کر کہتی ہے "رکو میں ابھی چائے لیکر آتی ہوں"

چائے کے نام پر اس میں پھرتی آجاتی ہے وہ آنکھوں پر پانی ملتا ہے، پھر بھینس کی طرف چور نظروں سے دیکھ کر پھر سے چہرے پر پانی مارنے لگتا ہے بھینس اسی حالت میں اپنی گردن لمبی کئے بیٹھی رہتی ہے۔ چائے پینے کے بعد گنپت جب بھینس کے قریب آجاتا ہے تو وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

بائیجا کو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دنوں اس کی طرح بھینس کو بھی اٹھنے بیٹھنے میں کافی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا دو پیکا یک شرم سے لال ہو جاتا ہے اور گنپت سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔

گنپت جب گھر سے باہر قدم رکھتا ہے تو بھینس پھر ایک بار اپنی گردن اونچی کر کے گنپت کی طرف دیکھتی ہے گو کہ صبح سے وہ کستائی ہوئی رہتی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ میاں بیوی کے درمیان ہونے والی بات چیت کو بغور سنتی ہے۔ البتہ وہ کسی ایک بھی بات کا پتہ نہیں لگا سکتی۔ پھر بھی وہ گنپت کی آنکھوں سے اتنا ضرور جان لیتی ہے کہ ہو نہ ہو کوئی اہم واردات ضرور ہوئی ہے یا ہونے والی ہے۔ گنپت روز صبح اٹھتے ہی صفائی کرتا۔ پھر اسے پانی پلاتا، گوبر کے اوپلے تھاپتا اور اس کے بعد ہی چائے پیتا۔ مگر آج گنپت کے معمول میں فرق آگیا تھا۔ اور اس فرق اور تبدیلی کو بھینس نے صبح ہی سے محسوس کر لیا تھا۔

جب سے اس نے پاٹل کا گھر چھوڑا تھا۔ اس کی ہڈیاں باہر آرہی تھیں اس پر بھی وہ ناراض نہیں تھی۔ گنپت اسے بے حد پیار کرتا بائیجا اکثر اس کی گردن کھجاتی۔ ہاں اس کی گردن کھجایا کرتی اسی لئے وہ بھولی نہ سماتی۔ اور اب تو وہ دونوں ہی ایک ساتھ بچے کو جنم دینے والی تھیں۔ گنپت پہلے سے زیادہ اس کی ہر بات کا خیال رکھنے لگا تھا۔ بائیجا کے بعد یا بائیجا کے ساتھ وہ بھی جننے والی تھی اس لئے اپنی ہڈیوں کے اوپر آنے کا اسے کوئی دکھ نہیں تھا!

اپنے ہی خیالوں میں غلطاں گنپت بازار سے بھی آگے نکل جاتا ہے ساروتی کے مندر کے پاس پہنچ کر وہ اپنے چپل اتار دیتا ہے۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر "جے ماروتی رایا!" کہہ کر پرنام کرتا ہے۔ اور بابو کے گھر کا راستہ لیتا ہے۔

"بابو گھر پر ہیں کیا؟"

"کون ہے؟"

"میں ہوں، گنپت" کہہ کر وہ چوری چوری اندر کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

بابو پان لگاتے ہوئے پوچھتے ہیں۔ "کیسے آنا ہوا۔؟"

"مجھے پچیس روپوں کی ضرورت ہے" "ہاں پچھلے پچاس تو ہیں ہی اور پچیس دے کر پچھتر پورے کر دو"

"بڑے چالاک ہوگئے ہو، پچھلا حساب صاف کر دو پچیس لے جا" کہہ کر بابو اندر چلے جاتے ہیں۔

گنپت حسرت بھری نظروں سے تکنے لگتا ہے۔ یکایک اسے بھینس کا خیال آجاتا ہے۔ اس کے قدم جواب دے جاتے ہیں اسی وقت موتی رام پوچھ بیٹھتا ہے "کیا چائے پیو گے"

"میرا ایک کام کر دو گے ——؟"

"کیوں نہیں ... اگر ممکن ہوا تو ضرور کروں گا"

"مجھے پچیس روپے چاہیے۔ آج اپنا ایک وعدہ پورا کرنا"

"پچیس کیوں، ڈیڑھ سو نقد لے لو، صرف اپنی بھینس ہمارے یہاں لاکر باندھ دو"

گنپت سرتا پا کانپ گیا۔ یہ خیال صبح ہی اس کے من میں جاگ اٹھا تھا۔

لیکن بھینس گابھن تھی اور بائیجا بھی ایک بچے کو جنم دینے والی تھی۔

"دونوں ہی ایشور کی کرپا سے ...... ! مجھے نہیں بیچنی"

گنپت نے جواب دیا۔

"لیکن اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پھر ایک بار موتی رام کہہ اٹھا

"تو پھر سودا منظور ہے۔؟"

"نہیں، چار سو دو، اور اس پر گائے بھی!"

"پونے دو سو۔ کیا اب بھی منظور نہیں؟"

سچ کہا جائے تو پیسے حد سے زیادہ ہوتے ہیں اس کے باوجود بھینس بیچنے کا ارادہ تھا ہی نہیں وہ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے اپنی ایک ہی جگہ بدستور کھڑا رہتا ہے۔ پھر تھکی اور اداس آواز میں بہت ہی دھیرے سے اپنی گردن ہلاتا ہے۔

"واہ۔ تو ہو گیا نا سودا منظور۔ اب زیادہ سوچنا مناسب نہیں چلو اب چائے پلاؤ۔"

"مجھے چائے وائے کی کوئی ضرورت نہیں۔" گنپت نے جواب دیا اور اپنے گھر کا راستہ لیا اداس، تھکی اور تھکن سے چور وہ اپنے گھر پہنچ جاتا ہے اس کا اداس چہرہ دیکھتے ہی بائیجا کا چہرہ اتر جاتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگتے ہیں۔ گنپت وہیں چپل اتار کر بستر پر دراز ہو جاتا ہے اور وہیں سے ایک ٹک بھینس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔

"کیا ہو گیا!" بائیجا پوچھ بیٹھتی ہے۔

روندھے ہوئے گلے سے گنپت کہتا ہے۔ "بھینس بیچنی پڑے گی"

بائیجا کا ہاتھ خود بخود اپنے پیٹ کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر اس کی نظر خود بخود بھینس کی طرف چلی جاتی ہے بھینس اپنی گردن لمبی کئے دیکھتی رہتی ہے اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہتے رہتے ہیں۔

اسی وقت موتی رام گھر میں داخل ہوتا ہے۔ گنپت میں اتنی شکتی اب باقی نہیں رہتی کہ اس سے نظریں ملا سکے۔ موتی رام اس کے قریب آ کر ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ "اس پر انگوٹھا لگاؤ"

گنپت اپنا انگوٹھا آگے کر دیتا ہے۔ موتی رام اسے سیاہی لگا کر [illegible] پر ٹکا دیتا ہے۔ (باقی صفحہ ۱۳۲ پر)


اب تک
ایسا ناشتہ کسی بھی قیمت پر
دستیاب نہیں تھا...
MOHUN'S
WHOLE
WHITE
OATS
موہنز
وہائٹ اوٹس
MOHUN'S
NEW
LIFE
CORN FLAKES
موہنز
نیو
لائف
کارن فلیکس
MOHUN'S
PEARL
BARLEY
موہنز
پرل بارلے
MOHUN'S
NEW
LIFE
WHEAT FLAKES
موہنز
نیو
لائف
وہیٹ فلیکس
۱۱۰ برس سے زیادہ کا تجربہ ہماری مصنوعات کو امتیاز بخشتا ہے۔
موہن میکن بریوریز لمیٹڈ قائم شدہ ۱۸۵۵
(سابقہ ڈائر میکن بریوریز لمیٹڈ)
موہن نگر (یوپی) — سولن — لکھنؤ — کسولی

Registered with the R[illegible] Newspapers [illegible] No. 6988 62
June 1968 KITAB LUCKNOW-3 Reg No. [illegible]-1781

Service to mankind is worship to God.

Only Cover printed at Hindustan Printing [illegible] Narain R[illegible] Lucknow Phone 2972[illegible]